جوہر



جوھر

جوہر

زبیدہ سلطانہ

مقبول اکیڈمی
۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انار کلی لاہور

اہتمام ـــــــ ملک مقبول احمد
مطبع ـــــــ مرشد پرنٹنگ پریس لاہور

مقبول اکیڈمی لاہور

کوڈ نمبر:
مجلد - ISBN 969 442 267 1
غیر مجلد - ISBN 969 442 268 x

پیش لفظ

اپنے ادبی دورِ حیات میں شاید پہلی مرتبہ اپنے گرامی قدر قارئین سے براہ راست مخاطب ہو رہی ہوں، قارئین میرے متعلق اکثر استفسار کرتے ہیں چنانچہ ضروری معلوم ہوا کہ اتنی مدت کے بعد از سرِ نو اپنا تعارف کراؤں!

میں نے فنِ ادب اپنے اجداد گرامی سے ورثہ میں پایا، گو تین پشتوں سے خطۂ پنجاب سے وابستگی ہے لیکن ادب اُردو ہمارے گھرانے کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

میرے دادا جنت مکانی خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خاں، لاہور کی مشہور طبی درسگاہ کنگ ایڈورڈ کالج کے بانیوں میں سے تھے اور اسی کالج میں "ہیومن اناٹمی" کے پروفیسر تھے۔ طلباء کی آسانی کے لئے انہوں نے ہیومن اناٹمی کا نہایت دلپذیر ترجمہ "تشریح الابدان" کے نام سے کیا، میرے والد صاحب قبلہ خان احمد حسین خاں، کم و بیش تین سو کتابوں کے مصنف تھے صاحب دیوان شاعر اور نظم و نثر کی ہر صنف پر قادر تھے۔

انہوں نے ادب اُردو کے ہر موضوع پر سیر حاصل لکھا ہے آپ شباب اُردو کے ایڈیٹر تھے جو اپنے وقت کا مقبول عام ماہنامہ تھا۔ میں نے تیرہ برس کی عمر میں جب میں ساتویں جماعت کی طالبہ تھی۔ لکھنا شروع کیا

میری ادبی زندگی کا آغاز یوں ہوا کہ والد صاحب قبلہ نے شباب اردو میں بچوں کی ایک کہانی "پاداش" میرے نام سے شائع کی تو میں خوش ہونے کی بجائے اپنی نااہلی پر رنجیدہ اور شرمندہ ہوئی کہ میرے والد کو مجھ سے توقع ہے کہ میں بھی کچھ لکھوں مگر میں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ میری عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں کسی اور کے لکھے ہوئے کو اپنے نام سے منسوب و قبول کر لوں، چنانچہ میں نے والد صاحب سے عرض کیا۔ کہ آئندہ میں خود ہی شباب اردو کے لئے کچھ نہ کچھ لکھا کروں گی۔ کسی اور کا مضمون میرے نام سے شائع نہ کیا جائے،

چنانچہ اگلے ہی مہینے کے شمارہ میں میری سب سے پہلے بچوں کی کہانی "سکھ کی متلاشی بلی" شائع ہوئی۔ جس کے حوالہ سے میرے شوہر نصیر دارثی اب تک یہ کہہ کر مجھے چڑایا کرتے تھے۔ کہ وہ اس کہانی کو میرے نام سے کسی ماہنامہ میں چھپوا دیں گے! اسی دور کے دوسرے مختلف جریدوں میں بھی میرے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ چند مضامین دارالاشاعت کے تہذیب نسواں اور واقعۂ کربلا سے متعلق کچھ مضامین "درویش" اور "شیعہ" ہفت روزہ میں چھپے۔

شباب اردو میں میرے مضامین اور افسانوں کی پسندیدگی اور قدردانی کا حال جس وقت مجھ پر واضح ہوا تو میرا دل واقعی مسرت سے لبریز ہو گیا اس معصوم جذبۂ مسرت کو میں آج تک فراموش نہیں کر سکی۔ اس کا انکشاف یوں ہوا کہ حیدر آباد دکن سے صغرا ہمایوں مرزا جو اس وقت کی ادیبہ، ادب کی سرپرست اور تعلیم نسواں کی حامی خواتین میں اونچا مقام رکھتی تھیں۔ کسی سیاسی جلسہ میں شرکت کے لئے لاہور آئیں تو چند اور معزز خواتین کے ہمراہ مجھے ملنے کے واسطے تشریف لے آئیں جب مجھ سے تعارف ہوا تو حیران ہو کر کہنے لگیں۔

"ہیں؟ آپ تو اتنی چھوٹی سی ہیں؟"

"جی آپ کے خیال میں مجھے کتنی بڑی ہونا چاہیئے تھا؟"

میں نے برجستہ کہا تو سب خواتین ہنسنے اور پیار سے مجھے گلے لگانے لگیں اور میری تحریر کی تعریف کر کے حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔

رفتہ رفتہ میں پروف دیکھنے اور مضامین کی درستی وغیرہ میں والد صاحب کے کام میں حصہ لینے لگی۔ ۱۹۳۱ء میں کالج میں داخل ہوئی تو اپنے نصاب کی انگریزی کتابوں سے چند افسانے "آسیب" اور "یونانی غلام" کے نام سے ترجمہ کئے جو شباب اردو میں شائع ہوئے۔ اسی سال میرا نام شباب اردو کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گیا اور میں شباب اُردو کی تالیف و تدوین میں حصہ لینے لگی۔

۱۹۳۶ء میں "ادب لطیف" کے شاندار سالنامہ میں میرا ایک افسانہ "شش پنج" شائع ہوا جو بعد ازاں کئی ہمعصر جرائد نے "کام دیو" کے نام سے بار بار شائع کیا۔

میرے مطبوعہ افسانوں کے دو مجموعے یکے بعد دیگرے "لمحات رنگیں" اور "شبستان الم" کے نام سے پنجاب بک ڈپو سے شائع ہوئے۔ پنجاب بک ڈپو کے بانی چوہدری برکت علی مرحوم و مغفور، متعدی انہوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

اور ان کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ہمیشہ دیدہ زیب محاسن سے مزین کر کے منظر عام پر لاتے تھے۔ چنانچہ میرا یہ کہنا کسی صورت بھی میرے دوسرے ناشر صاحبان کو گراں خاطر نہ ہونا چاہیئے کہ جس طرح ظاہری حسن و خوبی سے میری متذکرہ بالا دو کتابیں ابتداء میں پنجاب بک ڈپو سے شائع ہوئیں وہ بلند معیار اشاعت ابھی تک کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔

چند مجبوریوں کے باعث ۱۹۴۰ء میں شباب اردو بند کر دینا پڑا تو کچھ عرصہ والد صاحب کے ساتھ نصابی کتابوں کی تالیف و تدوین میں حصہ لیتی رہی۔ ۱۹۴۶ء میں اپنے افسانوں کا تیسرا مجموعہ مرتب کر کے جے۔ ایس سنت سنگھ کو دیا جو انقلاب کی نذر ہو گیا اور چند اور مسودے انقلاب کے بعد آنے والے سیلاب کی نذر ہو گئے۔

پھر پیسہ اخبار والے شیخ عبدالمجید صاحب کے ایماء پر انگریزی کی انعام یافتہ (نوبل پرائیز) کتابوں کے ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ریڈیارڈ کپلنگ کی "کم" برنارڈ شا کی "پگمیلین" "گڈ ارتھ" کی ربیکا ترجمہ کیں لیکن افسوس کہ ان تراجم کے مسودات دفتر پیسہ اخبار کی کسی شیلف میں اشاعت کے منتظر ہی پڑے رہے

اس ادارہ نے نشر و اشاعت کا کام بند کر دیا اور مسودات کتابوں کی باہمی تقسیم کے ہنگام بقول شیخ صاحب کہیں" ادھر اُدھر" ہو گئے۔ اور اپنی اس محنت کے اتلاف کا مجھے ایک مدت افسوس رہا۔

۱۹۶۰ء سے میں نے ناول نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلی چھ کتابیں یاقوتہ ماہ رخ۔ دیوتا، مصوّر۔ رباب اور ماہ لقا ظفر قریشی نے شائع کیں۔ دو کتابیں نیر اور ماہ جبین منظفر قریشی نے چھپوائیں۔ شیریں اور زری چوہدری اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ "فرحانہ" نفیس برادرز نے فیروزہ مقبول اکیڈمی سے شائع کی۔

میں اپنے معزز قارئین کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ کہ وہ میری تحریر کی خاطر خواہ قدردانی فرماتے اور پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ طول کلام کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیجئے اب "جوہر" پڑھئے ــــ

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

نیاز کیش

زبیدہ سلطانہ

دورِ اوّل

میں ہوں اور افسردگی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

میرزا غالبؔ

(۱)

"آپ کی طبیعت تو اچھی ہے کیپٹن؟"
ڈاکٹر سعید کو اپنے کندھے کے قریب یہ پُر حلاوت سی سرگوشی سنائی دی تو اس نے ہتھیلی پر تھما ہوا سر اوپر اٹھایا۔ پاکستانی پرچم کے رنگوں جیسا دلآویز یونیفارم پہنے ننھی سی خوش قطع کیپ سر پر جمائے ایر ہوسٹس اُس کے قریب کھڑی متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"بالکل اچھی ہے — شکریہ!"
ڈاکٹر سعید نے مسکرا کر کہا، اس کی آنکھوں میں جھلملاتی ہوئی پریشانی بھی گویا اس مسکراہٹ میں تحلیل ہو کر چھٹ گئی۔ ایر ہوسٹس کے لبوں پر بھی اطمینان کا تبسم نمودار ہوا اور وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ڈاکٹر سعید کی نگاہیں کچھ دور تک اس کے تعاقب میں گئیں اور تحسین کا انداز لئے ہوئے پلٹ آئیں۔ گویا کہہ رہی ہوں "کتنی ہمدردی اور خلوص ہوتا ہے ان لڑکیوں کے رویے میں!" اور واقعی اس لڑکی کے چند ہمدردانہ لفظوں نے اس کے پریشان کن خیالات کی رو کو بدل دیا۔ اس نے پریشانی ہی کے ماتحت یہ سفر شروع کیا تھا۔ وہ جب سے اس سیٹ پر بیٹھا متفکر اور کھویا کھویا سا تھا، یہ مسئلہ کسی صورت اس سے حل نہ ہو سکتا تھا۔ کہ آخر وہ کون سی مجبوری ہے جس کے تحت اس کے دور اندیش اور محتاط باپ نے اس موقعہ پر اُسے فوری ٹیلی گرام بھیج کر

طلب کر لیا جب کہ چھٹی لینے کی بجائے اُسے اپنے فرائض منصبی کی طرف توجہ دینی چاہیئے تھی۔

حال ہی میں اُنہیں میڈیکل میں کمیشن ملا تھا اور وہ اپنی یونٹ میں معینہ تاریخ کو رخصت ہونے والا تھا۔ مگر اب اُسے چھٹی لے کر گھر جانا پڑا۔ یہی الجھن تھی جسے سلجھاتے سلجھاتے اس کا ذہن اس حد تک الجھ گیا کہ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا چنانچہ اس مرحلہ پر جب کہ ذہنی خلجان نے جسمانی علامتیں اختیار کرنی شروع کیں تو ڈیوٹی پر متعین ایئر ہوسٹس نے دخل اندازی ضروری سمجھی —— اور اب ڈاکٹر سعید اپنے پریشان کن خیالات کے مخمصہ سے باہر نکل کر ان بلند پرواز لڑکیوں کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا مجبوری اور محض فکر معاش ان لڑکیوں کے یہ خطرناک لائن منتخب کرنے کی محرک ہے؟ وہ بار بار اپنے دل میں اس سوال کو دہراتا مگر اس کے لئے مثبت جواب کسی طرح قبول نہ ہوا اگر کوئی مجبوری ان کے طرز عمل کے پس پشت کارفرما ہو تو ان کا رویہ اتنا ہمدردانہ، اتنا پُرخلوص اس قدر با اخلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بعالم مجبوری زندگی کو ہتھیلی پہ رکھے ہوئے ہوں تو یوں خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے مسکراتی نہیں۔ یہ بلاشبہ اُن بلند نظر ہستیوں میں سے ہیں جو عام "ڈگر" سے ہٹ کر ایک جداگانہ لائحہ عمل مرتب کرتی ہیں۔ شوق پرواز اور ذوق مشاہدہ کے لئے جن کے کردار فطرتاً ساز گار اور موزوں ہیں، جنکی خطر پسند طبیعتیں زندگی اور اس کے لوازمات سے جیسا نیت کا رجحان نہیں رکھتیں جب ہی تو ہر آن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ یوں زندہ دلی سے مسکرانے کا حوصلہ رکھتی ہیں اور ان کی چمکیلی مسکراہٹوں سے حوصلہ پا کر صرف یہ دراز مسافر بھی ممکن خطرات کو نظر انداز کئے رہتے ہیں۔

اور اتنے ہی میں وہی ایئر ہوسٹس پھر سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ سعید نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا، کتنا پاکیزہ اور لطیف حسن تھا نہ بہوتی رنگت کا بیضوی چہرہ گھنی پلکوں والی بادام نما بھوری آنکھیں، جن سے مسکراہٹیں پھوٹی پڑتی تھیں۔ حساس جیسی کشیدہ ناک، متبسم یاقوتی لب۔ فراخ پیشانی پر سے پیچھے کو کنگھی کئے ہوئے نرم اور باریک بالوں کے کندنی رنگت کے جاذب

نگاہ پچھے حسین خوش قطع گردن پر چھائے ہوئے تھے۔ سڈول چھریرا بدن، سرو بلند بالا قد مگر وہ اپنے اس خداداد حسن کی سحر خیزیوں اور قیامت سامانیوں سے بے خبر صرف اپنے فرائض منصبی کی طرف متوجہ تھی۔ مسکرا مسکرا کر ہر مسافر سے اُس کی ضروریات کے متعلق پوچھ رہی تھی، ان کی طبیعت کا حال دریافت کر رہی تھی اور اسی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ سعید اب ذرا غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا منتظر ہو کر اب وہ پھر اس کی خیریت پوچھے گی مگر وہ قریب آئی تو اس کی ضرورت سے متجاوز توجہ کو بھانپ کر اپنی خوبصورت گردن کو اوپر اٹھائے ایک شانِ استغنا لئے ہوئے قریب سے گذر گئی۔ اور کیا کرتی؟ مسافروں میں سے کسی کی غیر ضروری یا بلا وجہ توجہ کے جواب میں انہیں اسی طرح اغماض سے کام لینا پڑتا ہے وہ فضا نوواردوں کی واجب ضروریات اور مناسب سہولتوں کے لئے متعین ہوتی ہیں جب کوئی شخص محض دل لگی کے لئے ان کی توجہ چاہے تو نہایت با اخلاق اور مہذب اندازِ اجتناب کے ساتھ اسے نظر انداز کر جاتی ہیں۔ چنانچہ سعید اس موقعہ پر یوں نظر انداز کئے جانے پر بے حد شرمسار ہوا اور اپنی اس حرکت کو سبک اور رکیک محسوس کرنے لگا۔ اس نے خفت کو مٹانے کے لئے جلدی سے کوئی انگریزی ماہنامہ کھولا اور بظاہر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

چند ہی منٹوں کے بعد وہ یک دم چونک پڑا، منزل قریب آ جانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ اور حسب ہدایت سب مسافر اپنی اپنی سیٹوں کے سامنے لگی ہوئی پیٹیاں باندھ رہے تھے۔

طیارے سے اتر کر ڈاکٹر سعید خاموش اور سرنگوں گیٹ کی جانب بڑھا اس کے ساتھ کوئی سامان نہ تھا جس کے لئے اسے ٹھہرنا پڑتا، نہ ہی اسے ایروڈرم پر کسی کے خیر مقدم کے لئے آنے کی توقع تھی کہ وہ منتظر اور متوقع نگاہوں سے گرد و پیش دیکھتا۔ اپنا معمولی سا سوٹ کیس خود ہی تھامے ہوئے باہر آیا اور ٹیکسی لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

(۲)

شہر کے فیشن ایبل حصّہ میں "زعفران زار" ایک چھوٹا سا خوش فضا بنگلہ تھا مختصر جیسے باغیچہ میں نفاست سے تراشے ہوئے لان، سلجھی ہوئی روشیں، خوبصورت پھولوں کے خوش قطع خیابان اور عمدہ قسم کے پھلوں کے گھنے چھنے درخت مکین کی خوش ذوقی اور نفیس طبعیٔ کے شاہد تھے۔

مالٹوں کے چھتنارے پودوں کے قریب زمردیں گھاس پر بید کی آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں ایک میز پر چند روزنامے پڑے تھے۔ ایک کرسی پر ایک کاہیدہ جسم ضعیف العمر شخص کرسی کی پشت سے تکیہ لگائے نیم دراز تھا اور کوئی اخبار دیکھ رہا تھا۔ مگر ہر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ ایک نگاہ گھڑی کی طرف ڈالتا یا منتظر نگاہوں سے گیٹ کی جانب دیکھتا، اس کی نگاہوں کی بے چینی سے ظاہر تھا کہ اسے کسی کا شدید انتظار ہے۔

اور آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ایک ٹیکسی گیٹ میں داخل ہوئی۔ منتظر شخص اخبار کو قریب کی کرسی پر پھینکتے ہوئے عجلت سے اٹھا اور آنے والے کی پذیرائی کے لئے بڑھا۔ اس کے ڈرائیو تک پہنچتے پہنچتے مہمان ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کر چکا تھا۔

آداب عرض ابو جان! الحمد اللہ کہ میں آپ کو بخریت و عافیت دیکھ رہا ہوں

اس فوری طلبی سے تو میری روح ہوا ہو گئی!" وہ باپ سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور باپ اُس کے سر کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے عجیب غمگین مسکراہٹ کیساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اُسے خاموش پاکر نووارد نے متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت تو ہے نا؟"

وہ باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فکرمند لہجہ میں پوچھنے لگا۔

"سب خیریت ہے بیٹے — !" باپ نے مسکرا کر کہا اور اسے لئے ہوئے واپس باغیچہ میں آیا بیٹے کے چہرے پر گہرے استعجاب کے تاثر کو پڑھ کر وہ بخوبی اندازہ کر رہا تھا۔ کہ وہ اس فوری طلبی کی وجہ جاننے کے لئے بے چین ہے اور وہ خود بتانے کے لئے بیتاب تھا مگر اب جو معین وقت آگیا تو اُسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا، کہ کن لفظوں میں وہ حقیقت کو زبان پر لائے۔ چنانچہ اب وہ دل ہی دل میں اندازہ کرنے لگا۔ کہ کتنی دیر اور ٹالا جا سکتا ہے۔ کسی قدر توقف کی اب بھی گنجائش ہے؟ اس نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اُٹھا کر دیکھا اس کا مخاطب صورت سوال بنا تجسس اور اشتیاق سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پاسِ ادب مانع تھا کہ وہ لفظوں میں اصرار کرے۔

"میں — تمہیں سب کچھ بتاؤں گا سعید بیٹے! سفر سے آئے ہو نا؟ غسل کرو، لباس تبدیل کرو، کچھ دیر آرام کرو، پھر باتیں ہوں گی — اے — کھانے کے بعد — سمجھے؟"

سعید حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اُس کے والد خلاف عادت عجب محجوب اور قصوروار سے انداز میں گفتگو کر رہے تھے، جیسے کچھ چھپا رہے ہوں، کچھ ٹالنا چاہتے ہوں۔ حالانکہ اُن کی عادت تھی ہمیشہ براہ راست انداز میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور ان کا لہجہ مرعوب کن ہوتا تھا۔ سعید کو بچپن ہی سے ان کا حکم بلا عذر اور بے چون و چرا ماننے کی عادت تھی، اسی لئے اُسے زیادہ سوال و جواب کی مجال نہ ہوئی مگر اس نے پھر بھی اسی موضوع کے گرد و پیش منڈلاتے

ہوئے کہا۔

"میں تو ڈر گیا۔ کہ آپ کی طبیعت درست ہو یہی؟"

"میری طبیعت درست نہ ہوتی تو کوئی مضائقہ ہی نہ تھا، میں اس کو اتنی اہمیت ہی نہ دیتا کہ تمہیں اس موقع پر کہ تم ترقی پا کر ایک معزز منصب پر متعین ہوئے فوری طور پر چھٹی لے کر گھر آنے کو لکھ بھیجتا —"

سعید کے شفیق والد جعفر رضا وہی آزردہ جیسا تبسم نگاہوں میں سمیٹے کہہ رہے تھے اور ان کی حلقوں میں بیٹھی ہوئی تیز، اور چمک دار آنکھیں سعید کے چہرے پر مرکوز تھیں "تو پھر —— ؟ یعنی —— اس سے بھی اہم —؟ میرا مطلب ہے کہ —— ؟"

اُس نے مختلف پہلوؤں سے اپنا ما فی الضمیر لفظوں میں اور موزوں لفظوں میں ظاہر کرنا چاہا مگر باپ کے عندیہ کے پیش نظر صاف نہ کہہ سکا، جعفر رضا ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دیئے "اچھا چلو اندر چل کر بات کریں۔ میں تمہیں زیادہ دیر انتظار میں رکھ کر پریشان نہیں کرنا چاہتا —!"

اور وہ دونوں اُٹھ کر اندر چلے آئے۔

"دیکھو رمزو! جب تک ہم خود نہ بلائیں کسی کو لائبریری میں آنے کی اجازت نہیں تم یہیں دروازے پر بیٹھے رہو۔ سمجھے؟"

انہوں نے برآمدہ میں کھڑے ہوئے ملازم چھوکرے سے کہا اور سعید کو ساتھ لئے ہوئے لائبریری روم میں آئے۔ سعید نے لائٹ جلائی، ہیٹر آن کیا اور اس کا رُخ باپ کی نشست کی طرف موڑ دیا۔ جعفر رضا بڑے غور سے اپنے ہونہار فرزند کی طرف دیکھ رہے تھے — سوا چھ فٹ قد اور پیا ہیا نہ ڈیل ڈول کا یہ تندرست، توانا اور خوبرو نوجوان ان کی چشم تصور کے سامنے گویا تحلیل ہو کر ایک ننھا منھا گداز جیسا بچہ ہو کر رہ گیا جسے اکھرے بدن کا ایک نوجوان آغوش میں سمیٹے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ گھنے جنگلوں کو چیرتا دریاؤں، پہاڑوں کو پھلانگتا اڑا چلا جا رہا تھا۔ دُور بہت دُور پہنچ کر اس نے ایک پُرامن مامن ڈھونڈا اور گود کے اُس معصوم کو اس میں رکھ دیا اور — اور —

بے اختیار جعفر رضا نے اپنا سر میز کے کنارے پر ٹیک دیا اور ایک طویل سسکی بھری۔

" ابو جان ——!"

سعید نے گھبرا کر پکارا اور باپ کے سر کو تھام کر سینے سے لگا لیا۔

" آپ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں ابو؟ کسی بُری خبر کو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ خدارا بتا دیجئے کہ آپ کے ذہن سے بوجھ کم ہو جائے۔

اس نے التجا کے انداز میں کہا۔

" ہاں سعید! میرے بچے! میرے نور نظر! مجھے ایک انتہائی بد خبر تمہیں سنانی ہے —— ایسی خبر کہ جسے سنا دینے کے بعد میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھوں گا —— سب کچھ!"

وہ حسرت سے بیٹے کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

" ابو —!"

سعید نے بے اختیار انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا —— اس کا باپ آج تک کبھی اتنا افسردہ اور بے بس نظر نہ آیا تھا۔

انہوں نے سعید کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ گھنی بھوؤں کے سایہ تلے چمکتی ہوئی گہری آنکھوں سے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے زیر لب پکارا —— بیٹے —— ؟ سعید بیٹے ؟"

" ابو —— !"

سعید نے انتہائی محبت سے جواب دیتے ہوئے اُن کے رخساروں کو چوم لیا۔

" آہ — اسی لئے میں اس مقدس خطاب سے محروم ہونے کو ہوں۔" انہوں نے سسکی لیتے ہوئے زیر لب کہا۔

" ابو جان! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ للہ کچھ تو فرمائیے بات کیا ہے؟" سعید نے التجا کی۔

" سب کچھ بتاؤں گا بیٹے — مگر احساس محرومی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ

بھی تو خدشہ ہے کہ کہیں تم بھی مجھ سے نفرت نہ کرنے لگے ۔"

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بغور دیکھنے لگے جیسے اندازہ کرنا چاہتے ہوں کہ ان کے اس خدشہ کے درست ہونے کا کہاں تک امکان ہے ۔

"معاذ اللہ — یہ کیا فرمایا آپ نے — ؟ خدا مجھے اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے کہ جس دن میرے دل میں آپ کی محبت اور احترام و عظمت میں ذرہ بھی کمی آئے !"

سعید نے حیرت و استعجاب کے ملے جلے انداز سے کہا اور غور سے باپ کے چہرے کو تکنے لگا۔ وہ ان کے حواس کے متعلق البتہ کچھ خدشہ محسوس کرنے لگا تھا — !

" خیر میں کب تک اظہار حقیقت میں التوا کروں گا — ادھر آکر بیٹھ جاؤ میرے سامنے اور سنو — !"

انہوں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے فیصلہ کن لہجہ میں کہا اور سعید نے فوراً تعمیل کی۔ لکھنے کی کشادہ میز کے دوسری جانب باپ کے بالمقابل بیٹھ گیا اور ہمہ اس و اشتیاق سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

بات یہ ہے سعید — ؟ ہاں دیکھو ! میرے بیان کو سنتے ہوئے یکسر خاموش رہو۔ میری بات کے سلسلہ کو ہرگز منقطع نہ کرو — اچھا ؟" اور سعید نے اثبات میں سر ہلا کر وعدہ کیا۔

بات یہ ہے سعید بیٹے — کہ میں تمہارا باپ نہیں ہوں — !" انہوں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

" ابو — !

سعید تڑپ کر کرسی سے اچھلا اُس پر کسی نے بم چھوڑ دیا ہو۔ اس کی پکار میں دل شکستگی کی کھنک کے ساتھ ساتھ بے یقینی کی آمیزش تھی۔ وہ پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے اپنے مقابل بیٹھے ہوئے بڈھے آدمی کو غور سے گھور رہا تھا، اُسے اُس کے اس اعلان کی صداقت میں سراسر شبہ تھا۔ وہ اس کا باپ نہیں ؟ یہ

کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر یوں ہی تھا تو یہ کیونکر ممکن ہوا۔ کہ وہ اس کے لئے اس قدر ایثار کر سکا؟ اسے بے انداز محبت اور چاہت دی، اس کی ہر خواہش کی تکمیل کی اسے ناز و نعم سے پرورش کیا۔ بہترین تعلیم و تربیت سے اس کے مستقبل کو مزین و درخشاں کیا؟ کون کسی دوسرے کی اولاد کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے؟ معاً اس کی آنکھوں کے سامنے وہ واقعات گھوم گئے ___ کئی واقعات ___ جب وہ بیمار تھا۔ جب وہ متعدد مرتبہ حادثات کا شکار ہوا تھا تو کس جانفشانی سے اس شخص نے اس کی تیمارداری کی، کس دریادلی سے روپیہ صرف کیا، کس کس طرح وہ اس کی تکلیف کے احساس سے بیکل اور مضطرب ہوا کرتا۔ اپنے گوشت پوست کے سوا بھی کوئی کسی کے لئے یوں تڑپ سکتا ہے ___؟ اور وہ احتجاج کے انداز سے پکار اُٹھا۔

نہیں ___! نہیں نہیں! یہ غلط ہے۔ کچھ بھی ہو یہ غلط ہے!"

اس کی آواز میں رقت سے پھندا سا پڑ گیا۔

دیکھو سعید! میں نے تمہیں فہمائش کی تھی۔ کہ صبر و تحمل کے ساتھ خاموش رہ کر میرا بیان سُننا ___!" انہوں نے قدرے تنبیہہ کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ نے مجھے گولی مار دی ___ اور تڑپنے سے منع کرتے ہیں؟" اگر بالفرض یوں ہی تھا تو اب مجھے یہ دل شکن حقیقت بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

وہ سچ مچ تڑپ رہا تھا، اس نے روہانسی آواز اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ فریاد کی تو جعفر رضا خود بھی پشیمان سے نظر آنے لگے مگر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا کر بولے۔

"ضرورت تھی بیٹے ___! ضرورت پیش آ گئی اظہار حقیقت کی! بس اب آرام سے بیٹھ جاؤ اور پوری بات سنو ___ بیٹھو!"

انہوں نے نرم مگر حسبِ عادت تحکمانہ لہجہ میں کہا اور سعید بھی جیسے غلاماً اضطراری طور پر بتعمیل حکم پر مجبور ہو کر بیٹھ گیا۔

میں تمہارا حقیقی چچا ہوں سعید —— تمہارے والد مظفر رضا خاں کا چھوٹا بھائی —— بس اب پورا قصّہ خاموشی سے سنتے جاؤ" اور سعید دم بخود سامنے بیٹھ کر قصّہ سننے لگا —— خود اپنی زندگی کا قصّہ، جسے وہ آج تک بالکل سیدھی سادھی اور رازوں سے یکسر معرا سمجھتا چلا آیا تھا ——

جعفر رضا کہنے لگے :-

" والدین فوت ہوئے تو ہم دو ہی بھائی تھے اور کوئی عزیز رشتہ دار موجود نہ تھا -

باپ کی کثیر دولت ہمارے حصہ میں آئی - میں بھائی سے چار برس چھوٹا اور بس اکیس برس کا ناتجربہ کار چھوکرا تھا - ماں باپ کی زندگی میں سیر و شکار کے سوا میرا کوئی دوسرا مشغلہ ہی نہ تھا کاروبار سے دور کا واسطہ نہیں تھا - حالانکہ بھائی ہر طرح باپ کے شریک کار تھے - والد کے بعد بھی نہ میں نے اپنی روش کو بدلنے کی ضرورت محسوس کی نہ ہی بھائی نے پس و پیش سمجھانے کی ضرورت سمجھی بلکہ میرے الگ حصّہ کے نام سے جو کچھ انہوں نے دیا اُسی کو غنیمت سمجھا اور بیجا اسراف میں روپیہ تلف کرنے لگا - لیکن زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ اپنی لا اُبالی زندگی کے ایک انقلاب آفریں موڑ پر پہنچا - اس وقت میں اس انقلاب کو اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتا تھا - لیکن وہ فی الحقیقت میری بدبختی، خانہ ویرانی اور جلا وطنی کا پیش خیمہ ثابت ہوا —— یوں ہی ہوتا ہے - بعض چیزیں جو انسان کو وقتی طور پر اپنے حق میں بہتر نظر آتی ہیں، بعد میں اس کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں - اور برعکس اس کے بعض انتہائی دلآزار اور ناخوشگوار باتیں بعد ازاں اچھی اور مفید صورت اختیار کر لیتی ہیں —— ہاں تو میں کہہ رہا تھا - کہ میری زندگی نے ایک دم پلٹا کھایا - ایک حور شمائل فرشتہ خصائل دوشیزہ میرے راستے میں آگئی اور مجھے تباہی کے غار کی طرف بڑھنے سے روک لیا - وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی - اس کا باپ ایک معمولی دکان دار تھا - مگر وہ لوگ بے حد مخلص اور بلند نظر تھے - ان کے اخلاص سے متاثر ہو کر میں نے راہ راست اختیار کر لی اور رقیہ نے اپنی دائم المریض ماں کے صحت یاب ہو جانے پر مجھ سے شادی کر

لینے کا وعدہ کیا۔

وہ اپنے چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور خانہ داری کا سب بوجھ اسی نے اُٹھا رکھا تھا۔ ایک مدت تک میرے شب و روز کا زیادہ حصہ رقیہ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ گزرتا۔ رقیہ کا باپ قیوم خاں بے حد غیور آدمی تھا۔ اس نے میری بلکہ پیش کش کے باوجود اور اپنی انتہائی عسرت اور تنگ دستی کے باوجود کبھی مجھ سے کچھ قبول نہ کیا۔

• ایک دن غیر متوقع طور پر مجھے مظفر بھیا نے طلب کیا اور پر شفقت اور ہمدردانہ نصیحتوں کی طویل تقریر کے بعد مجھے ترغیب دی کہ ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جاؤں اور جنوبی انڈیمان میں وہ کچھ نئے ٹھیکے وغیرہ لے رہے ہیں۔ ان کی نگرانی کے لئے کبھی کبھار وہاں چلا جایا کروں گا۔ میں تو جیسے اُن کے پیار کے لئے ترسا ہوا تھا۔ ذرا سی دلجوئی پر اُن کے اشاروں کا منتظر رہنے لگا چند ماہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ کر کام کے پس و پیش سے متعارف کرایا اور پھر ایک دن سامان سفر درست کرنے کا حکم مل گیا۔

مجھے رقیہ سے جدائی بے حد شاق تھی لیکن اس کی خاطر اپنا مستقبل بنانا ذاتی کاروبار تعمیر کرنا، اپنا الگ گھر بنانا بھی پیش نظر تھا کیونکہ یہی وہ باتیں تھیں جن کی طرف وہ عموماً میری توجہ راغب کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ مگر میں کوئی سہارا نہ پاکر اُسے ٹالنے کو تسلی دے دیا کرتا۔ اب جو بھائی نے ہاتھ بڑھایا تو محض رقیہ کی خاطر میں نے فوراً اُن کی پیش کش کو قبول کر لیا، میرے باہر چلے جانے کی خبر پاکر رقیہ بھی بے حد افسردہ ہوئی مگر آئندہ بہتری کے پیش نظر بظاہر حوصلہ برقرار رکھا اور مجھے تسلی دیتی رہی۔ آخر میں روشن مستقبل کے لئے امید کے دیئے جلاتا ہوا سفر پر روانہ ہو گیا۔

اس اجنبی مقام پر میرا دل نہ لگا اور مصلحت اندیشی کے ماتحت جو منصوبے باندھے اور خیالی محل تعمیر کئے تھے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے چند ہی مہینوں میں میری طبیعت ہر چیز سے سیر ہو گئی نہ کام میں جی لگتا نہ ماحول برداشت ہو سکتا، بیزاری نے رفتہ رفتہ بیماری کی صورت اختیار کرنی شروع

کی اور میری صحت معطل ہونے لگی، صورتِ حال سے بھائی کو آگاہ کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ جو جو وعدے ان کے روبرو کر چکا تھا۔ ان کے پیش نظر
بہرکیف ایک سال میں نے یوں ہی کانٹوں پر لوٹتے بسر کیا اور آخر تنگ آکر بھائی کو لکھا کہ آب وہوا غیر موافق ہونے کے باعث میری صحت گر رہی ہے میں وطن واپس آنا چاہتا ہوں۔ مگر انہوں نے کاروبار کے حوالہ سے سختی کے ساتھ ممانعت کر دی اور لکھا کہ میرے چلے آنے سے انڈیمان میں کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ مجھے چندے اور ٹھہرنا پڑا، مگر میرا اضطراب اور بڑھتا گیا۔ طبیعت کی بے چینی اور بیزاری میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور ساتھ بھائی کی طرف سے دل میں کدورت اور تلخی پیدا ہوتی چلی گئی، میری شکایت بیجا نہ تھی انہوں نے میری صحت اور زندگی پر دولت اور کاروبار کو ترجیح دی، میرے لئے ان کے دل میں کچھ وقعت نہ تھی، کوئی ہمدردی نہ تھی؟ حتیٰ کہ اس احساس نے مجھے بغاوت پر آمادہ کر دیا میں نے انہیں صاف لکھ دیا کہ جلد انتظام کر کے میری بجائے کسی کو بھیج دیں ورنہ میں سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر واپس چلا آؤں گا۔ مگر میرا یہ احتجاج بھی صدا بصحرا ہو کر رہ گیا اور کوئی جواب نہ آیا۔ آخر میں نے وہی کیا کہ بلا اجازت ہی سب کچھ چھوڑ کر واپس آگیا۔"

اتنا کہہ کر جعفر رضا یک دم خاموش ہو گئے۔ اور پیشانی کو ہاتھ کا سہارا دئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے، کئی لمحے اسی طرح گذر گئے مگر وہ تو جیسے سعید کی موجودگی کو بھول ہی گئے تھے۔ سعید نے ان کے انہماک کو برہم کرنے کی جرأت نہ کی اور چپ چاپ بیٹھا ہوا ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ کھانا چنا جا چکا ہے اور وہ چونک پڑے ماضی کے دھندلکے گویا اب بھی ان کی نگاہوں کے سامنے چھائے ہوئے تھے انہوں نے ذہن اور رسمی آنکھیں اٹھا کر ملازم کی طرف دیکھا۔

"اچھا ——" انہوں نے زیرِ لب کہا اور اس کے چلے جانے کے بعد ایک طویل سانس لے کر از سرِ نو سعید کی طرف مخاطب ہوئے۔

"ہوں — تو میں کہہ رہا تھا کہ میں انڈیمان سے واپس چلا آیا۔ مگر نہ آتا تو اچھا تھا۔ وطن میں میرے لئے جہنم منہ کھولے پڑا تھا —! سعید بیٹے! سچ پوچھو تو اس کے بعد میں نے ساری عمر اُس جہنم ہی میں بسر کی — انتقام کے روح سوز دوزخ میں کود پڑنے کے بعد انسان کی باقی عمر یکسر پشیمانی کے حاویہ میں بسر ہوتی ہے —!

شہر پہنچ کر میں نے رقیہ کے واسطے کچھ تحفے خریدے، گو میں اس سے بہت ناراض تھا، کہ اس نے متواتر چھ ماہ سے چپ سادھ رکھی تھی میرے کئی خطوں کے جواب میں ایک دفعہ بھی اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دینے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ میرے وطن سے دوری، اپنے سے جدائی اور بے قراری کا ذرا بھی احساس نہ کیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے شکایات کا دفتر تھا مگر یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اتنی مدت کے بعد گھر آؤں تو اس کے لئے کوئی تحفہ لے کر نہ آؤں، میں نے اس کی پسند کی ڈھیروں چیزیں خریدیں۔ بابا کے لئے سگریٹوں کے ڈبے اور چائے کے پیکٹ خریدے اور سیدھا رقیہ کے گھر پہنچا۔ لیکن گھر تو جیسے بھاڑ کی طرح تلپٹ، بھاں بھاں کر رہا تھا۔ صحنچہ میں لگا ہوا چھوٹا سا چمن سوکھا پڑا تھا۔ وہ خیابان جو تر و تازہ خوش رنگ پھولوں سے لدے رہتے اس وقت تاراج ہو رہے تھے۔ گلاب کی جھاڑیوں پر خزاں کا مسکن تھا۔ ڈھیروں سوکھے پتے لنڈ منڈ درختوں کے نیچے جمع تھے۔ میں ششدر سا کھڑا اس منظر کو متوحش نظروں سے دیکھ رہا تھا، میرا ذہن ہر خیال سے خالی تھا کوئی خدشہ کوئی اندیشہ تک میرے مختل اور معطل دماغ میں سے گزر نہ سکا اس خانہ ویرانی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی جیسے سوچنے اور سمجھنے کی ساری قوتیں یک دم سو گئی ہوں۔

لیکن میں یک دم اپنے اس تعطل سے چوک کر ہوشیار ہوا۔ کسی آواز نے جھکتا اپنے گھر کی طرف دوڑا۔

"کہاں ہے مظفر؟ کہاں ہے وہ غاصب بھیڑیا؟"

ملازم میرے گرد جمع تھے اور میں رعد کی طرح گرجتے ہوئے ان سے پوچھ رہا تھا وہ خوف زدہ اور سہمے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے میں نے گھر میں قیامت برپا کر دی۔ اظہارِ غضب کا جو بھی موقعہ ملا اُسے آزمایا ملازموں کو مارا گھر کا ساز و سامان توڑا پھوڑا۔ میرا بھائی گھر میں موجود نہ تھا۔ وہ کاروبار کے سلسلہ میں مغربی پاکستان گیا ہوا تھا۔

اسی طیش اور جنون کی حالت میں میری نگاہ اوپر بالکونی کی طرف اُٹھ گئی — ایک لمحہ کے لئے میرے بھڑکتے ہوئے مختل دماغ پر جیسے کسی نے برف رکھ دی بالکونی میں رقیہ کھڑی تھی۔ اور میں سب کچھ بھول کر اُسے دیکھنے لگا۔ سفید ساڑھی میں لپٹی ہوئی وہ کس قدر کاہیدا اور کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ زرد اور روکھا سا چہرہ خشک اور سفید ہونٹ، بیمار جیسی بے رونق آنکھیں، رخساروں کی ہڈیاں تک ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں آہ! وہ بھولا بھالا معصوم حسن تاراج اور پامال ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں بیٹھی ہوئی حسرت زا ویرانیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنی ساری تمناؤں کو آنسو بنا کر رو بیٹھی ہیں۔ اب تو ان میں ذوقِ دیدار تو کیا حسرتِ انتظار بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔ ہونٹ یوں ابدی خاموشی لئے ہوئے تھے جیسے زمانوں کے ساتھ ساتھ گویائی کے بھی عادی نہیں رہے اس کے انداز سے کچھ بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اس کے احساسات کیا ہیں، کوئی احساس کوئی کیفیت اس کے چہرے پر پیدا ہی نہ ہوئی۔ سوائے پائمالی کے کچھ بھی تو ظاہر نہ ہوتا تھا، اس کے وجود سے چند لمحے میں اُسے دیکھتا رہا، پھر ایک دھندلی جیسی دیوار خلا میں معلق ہو گئی وہ میری نگاہوں سے چھپ گئی میں نے اپنے آپ کو سرد گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے محسوس کیا اور چند ہی لمحوں میں سارے احساسات سے

"ہاں — ؟" رقیہ کو کیا ہوا — ؟"

میں کسی افتاد کے پیش نظر بڑھیا کی موت کا رسمی افسوس ظاہر کرنا بھی بھول گیا۔

"رقیہ سے تمہارے بھائی نے نکاح کر لیا۔ ہمارا بس نہ چلا۔ ہم دونوں

مجبور ہو گئے۔ میں منظفر سیٹھ کا قرضہ ادا نہ کر سکا تو انہوں نے دو ہی شرطیں پیش کیں کہ یا تو جھونپڑا ان کے حوالے کر دوں یا پھر رقیہ کو ان کے نکاح میں دے دوں ـــــ توبہ ہے! بڑے سخت گیر اور جابر قرض خواہ ہیں ملک الموت بھی تو ایسی سختی سے جان طلب نہ کرتا ہو گا، جتنی سختی سے وہ پیسہ وصول کرتے ہیں ــ یہاں تک کہ میں مجبور ہو گیا کہ رقیہ کو دے دوں۔ جھونپڑا دیتا تو بیمار بڑھیا کو کہاں لے جاتا؟ بچے بچیاں کہاں سر چھپاتے۔

اور بڈھا قیوم اتنا کہہ کر پھر بلا آنسوؤں کی خشک سسکیاں لینے لگا۔

میں غیض و غضب سے دیوانہ ہو کر چیزوں کو پٹختا اور ٹھوکریں مارتا وہاں سے نکل آیا۔ قیوم بابا اپنی نقیہ اور کمزور آواز میں مسلسل اپنی بے گناہی اور بے بسی کا اظہار کرتا رہا۔ وہ کئی روز سے بھوکے پیاسے ہونے کی بھی فریاد کر رہا تھا یہ بھی بتا رہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد دونوں چھوٹی لڑکیاں موسمی بخار میں مر گئیں تینوں لڑکے فاقوں مرتے شہر کو نکل گئے۔ مگر اُس وقت تو میں کوئی بات سُننے یا سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو چکا تھا۔ میری دنیا ہی زیر و زبر ہو چکی تھی۔ زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ اور ایک شدید جلن کے احساس کے سوا میرے سارے احساس ختم ہو گئے ــ میں جل رہا تھا! جہنم کے روائتی شعلے حقیقت کے روپ میں اس دنیا میں اتر آئے تھے اور میرے جسم کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ میری طرف لپک لپک کر آ رہے تھے۔ ان کی نکیلی زبانیں، میرے تن بدن کو میرے ہوش و خرد کو چاٹ کر بھسم کئے دیتی تھیں۔ میں پاگلوں کی طرح دوڑا اور بکتا

" پہچا ـــــ نا ــ! اے ـــ ہاں ہاں پہچانا۔ جعفرا ہاں جعفر!"

وہ پھر ہکلایا اس دفعہ اس کی آواز رقت سے بوجھل ہو رہی تھی۔

" سب کہاں ہیں ــ؟ ماں ــ؟ رقیہ؟ بچے؟

میں نے اشتیاق سے پوچھا مگر بڈھا قیوم خان سسکیاں لے رہا تھا ایک ہاتھ سے اُس نے اپنے پیٹ کو دبا رکھا تھا۔ جیسے اُن سسکیوں سے اس

کے پیٹ میں تکلیف محسوس ہوتی ہو۔ وہ رو نہیں سکتا تھا اُس کے آنسو سلب ہو چکے تھے۔ دل کے بخارات سسکیوں سے خارج نہ ہو سکے تو اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جیسے دھرتی کے اندر لاوا ابل کر نکلنے کی راہ نہیں پاتا تو اُسے متزلزل کر کے آخر اس کے سینے کو پھاڑ ڈالتا ہے۔ بالکل ویسی ہی کیفیت بیچارے قیوم خان کی تھی۔ ادھر میں مارے بے صبری کے بدحواس ہوا جاتا تھا۔

" کیا ہوا بابا؟ کچھ تو کہو — خدا کے لئے!" میں نے اس کو دونوں شانوں سے تھام کر ہلاتے ہوئے کہا۔

" بس سب کچھ ہی ہو چکا بیٹے — ! اب تو اس کے سوا ہونے کو کچھ باقی نہ رہا کہ یہاں بیٹھا موت کی راہ تک رہا ہوں مگر موت ہے کہ نہ آج آتی ہے نہ کل —" وہ نحیف آواز میں زیرِ لب کہہ رہا تھا۔

" ماں کہاں ہے — ؟ رقیہ — ؟ اور بچے ؟ کہاں ہیں سب ؟" میں نے پوچھنا چاہا۔

" بڑھیا تو روگ سے چھوٹ گئی۔ سکھی ہو گئی — مگر رقیہ ؟"

اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا مگر اس کا یہ ادھورا فقرہ ایک دلدوز ہچکی میں ڈوب کر ناتمام رہ گیا۔

مجھے متوجہ کیا اور میں کان لگا کر سننے لگا آواز پھر سنائی دی، میں نے پہچانا اندرونی کوٹھڑی میں کوئی حقہ گڑگڑا رہا تھا اور ساتھ ہی کھانسنے کی آواز آئی — میرے کان کھڑے ہوئے یہ تو بابا کی آواز تھی اور ساتھ ہی قدم برداشتہ اندر داخل ہوا دلان میں کوئی نہ تھا دو جھلنگا سی چارپائیوں پر کپڑوں کے ڈھیر پڑے تھے کوڑا اور میلے برتن ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ہر طرف بے ترتیبی اور ویرانی تھی۔ یقیناً رقیہ گھر میں موجود نہ تھی۔ ورنہ گھر کی یہ حالت نہ ہوتی، مگر اس وقت تو اس کی غیر موجودگی کا یقین نہیں محض احساس اپنے بوجھل ذہن میں لئے ہوئے میں کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ ایک نیچی جیسی کھٹیا میں دھنسا ہوا رقیہ

کا باپ بابا قیوم نارجیل ہاتھ میں تھامے ہوئے اندھیرے میں بیٹھا گڑگڑا رہا تھا اس کھٹیا پر تو رقیہ کی دائم المریض ماں پڑی ہوتی تھی میں جب بھی آتا اُسے وہیں پڑے دیکھتا۔ مگر اس وقت وہاں بابا قیوم تھا اور کمرے میں دوسرا کوئی شخص نہ تھا۔ آہٹ پاکر وہ چونکا۔

"کون ہے — ؟"

اس نے یوں حیرانگی سے پوچھا گویا وہاں کسی کا چلے آنا کوئی ناممکن سی بات تھی۔

"میں ہوں بابا — !" میں نے متوقع انکشاف کے خدشہ کو محسوس کرتے ہوئے دکھی سی آواز میں کہا۔

"کون — ؟ ا — ا — " وہ ہکلایا۔

اس نے نارجیل کو ایک طرف ٹکاتے ہوئے دوسرا ہاتھ میری طرف پھیلا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے اور اس کے قریب پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں بابا — ! جعفر آپ نے پہچانا نہیں مجھے ؟"

غافل ہو کر بے ہوش ہو گیا۔

ایک مدت میں بیمار رہا۔ جسمانی اور ذہنی بیمار — ! سول ہسپتال سے رخصت مل گئی تو دماغی ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔

جہاں میرا نام مستقل اور دائمی مریضوں کی فہرست میں تھا جن کے تندرست ہونے کی اُمید نہیں ہوتی اور مجھ پر خصوصاً کڑی نگرانی رکھی جاتی اور سختی کی جاتی تھی مگر اس کے باوصف ایک دن موقعہ پاکر اس ہسپتال نما جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے اپنے بچاؤ کے بہت سے منصوبے بنا رکھے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی پر عمل کرنے سے پیشتر میں دو کام ضرور کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو مظفر کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ مظفر کے مکان پر پہنچ کر میں کھڑکی کے راستہ مظفر کی خوابگاہ

میں پہنچا مگر خوش قسمتی سے وہ اپنے کمرے میں موجود نہ تھا۔ میں چھپتا چھپاتا رقیہ کی خواب گاہ میں پہنچا۔ وہ منہ دیوار کی طرف پھیرے ہوئے غافل سو رہی تھی مگر میں اس نئے انکشاف پر حیران ہوا کہ اس کے پہلو میں ایک نوزائیدہ بچہ سو رہا تھا۔

"رقیہ کا بچہ —! مظفر کا بچہ!"

میرے مختل ذہن کی خلاؤں میں کسی صدائے بازگشت کی مانند یہ الفاظ بار بار گونجنے لگے، جذبۂ انتقام نے میرے دل و دماغ میں شعلے سے پھونک دیئے اور قسم قسم کے خوفناک منصوبے، متحرک تصویروں کی مانند میری آنکھوں کے سامنے ابھرنے اور مٹنے لگے۔ "میں اس بچے کو اٹھا کر لے جاؤں گا — اس کے بغیر میرا بے درد اور سفاک بھائی بھی تڑپے گا اور یہ بے وفا عورت بھی —!"

شادی کے معاملہ میں تو اس پر جبر ہوا مگر یہ بچہ؟ اس سے پہلے وہ مر کیوں نہ گئی —؟ وہ مظفر کے بچے کی ماں بننے تک کے لئے زندہ کیسے رہ سکی؟" یہ اور اسی قسم کے خیالات مسلسل میرے ذہن کو مختل اور مشتعل کرتے رہے اور کسی خاص فیصلہ کن مرحلے پر پہنچے بغیر میں نے کسی شکاری پرندے کی طرح جھپٹ کر بچے کو ایک ہی ہاتھ میں اٹھا لیا وہ بے آرام ہو کر نیند میں کسمسایا مگر اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے آواز نکلتی میں نے دوسرا ہاتھ اس کے ننھے سے منہ پر رکھ دیا اور اسے لئے ہوئے بالکنی پر سے ہوتا ہوا عقبی زینے کی راہ پائیں باغ میں اتر گیا۔ اس کے منہ کو میں اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھا مبادا وہ رو دے اور میرا سارا منصوبہ ہی ناتمام رہ جائے۔

اسے لئے ہوئے میں بلا تعین ہی ایک طرف چل دیا۔ ناریل اور ربڑ کے فلک بوس درخت شہر کی طرف جانے والی سڑک کو اپنے اونچے سایوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ پچھلی تاریخوں کا چاند ان کی بلند چوٹیوں پر الجھا ہوا مکدر اور اداس اداس دکھائی دے رہا تھا۔ سرد اور دھیمی ہوائیں سرسراتے پتوں کے سائے

دھندلی کرنوں سے اُلجھ رہے تھے تو کرنیں پیہم ان سے دست وگریباں تھیں ان کی باہمی آویزش اور دارو گیر سے سڑک پر عجب نقش و نگار بنتے اور بگڑتے اور حیرت کا مقام ہے کہ اس سنگین موقعہ پر میرا ذہن قدرت کی اس شعبدہ بازی کی طرف مائل ہو کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نمناک ہوا کے پر سکون جھونکے میرے بھڑکتے ہوئے دماغ کی مسیحائی کرنے لگے۔ میرے دل میں پیہم اٹھنے والا طوفان دھیما پڑ گیا۔ دماغ میں متواتر لپکنے والے شعلے ٹھنڈے ہو گئے اور ہریالی کی طرح مرطوب جیسی بھینی بھینی باس روح کو تقویت دے رہی تھی ـــ میں گویا جاگ سا گیا۔ حواس بجا ہونے پر میرا سب سے پہلا احساس، وہ نرم نرم اور خوش گوار حرارت تھی۔ جو مجھے اپنے پہلو میں محسوس ہوئی۔ کسی لطیف اور گداز سی شے کو میں اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھا جسے اس منظر میں کھو کر میں چند لمحوں کے لئے مطلق بھول گیا تھا اور اب اس کی جان بخش اور روح پرور جیسی حرارت میرے ٹھٹھرے ہوئے ننگے جسم کو خوش گوار سی گرمی بخش رہی تھی میں چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ اس پوٹلی کو بغل کے نیچے سے کھینچ کر آغوش میں لے لیا اور چاند کی جھلملاتی کرنوں کی روشنی میں غور سے اُسے دیکھا ـــ

کس قدر حسین بچہ تھا، شاید یہ خون کا جوش تھا جس کے ماتحت میں نے بے اختیارانہ اُسے چوم لیا۔ وہ نیند میں مسکرانے لگا اس کی کشادہ پیشانی پر ملائم اور سیاہ بال چمک رہے تھے۔ میں نے اس کے ننھے سے گول سر کو سہلایا کتنے نرم بال تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کی تو ابھی جھنڈ بھی نہیں اتروائی گئی تھی ـــ اور مجھے اپنی حماقت پر پشیمانی محسوس ہونے لگی "میں نے بھلا یہ کیا حرکت کی کہ بچے کو اُٹھا لایا؟ اس سے میرا کیا مقصد تھا؟ کیا میں اُسے مار ڈالنا چاہتا تھا کئی ایسے ہی سوالات میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں میں اسے مار نہیں سکتا!" میرے ضمیر نے مجھ سے کہلوایا "تو پھر اسے کیا کروں، واپس چھوڑ آؤں؟ اور میں قدم برداشتہ واپس پلٹ پڑا۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ میں دل میں عجب قسم کی تلخی محسوس کرنے لگا۔ احساس شکست

کی تلخی! ہزیمت خوردگی کی ندامت اور میرا دل مجھے کم ہمتی کے طعنے دینے لگا ایک دفعہ پھر انتقام کے جذبہ نے میرے دل و دماغ پر یورش کی، میں جھنجھلا سا گیا۔ سمجھ میں نہ آسکتا کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں؟ اس فرشتہ جیسے معصوم اور خوبصورت بچے کی جان تو مجھ سے نہ لی جائے گی۔ مگر واپس بھی نہیں دوں گا، اس کے باپ نے میری زندگی کی ساری مسرتیں چھین لیں، میری امیدوں کی کائنات میں آگ پھونک دی۔ میرا پورا مستقبل ویران اور تاراج کر ڈالا اب میرے اس وجود کا دنیا میں کوئی مقصد، معنی ہی باقی نہیں اگر میں منظفر کو مار ڈالوں تو وہ سارے رنج و غم سے چھوٹ جائے گا۔ موت تو کوئی سزا نہیں۔ اور اس کے بدلے میں خود دائمی لعنت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ بھائی کا قاتل بن کر گویا میں اپنے باپ کے مقدس خون سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کروں گا آخر اس سے انتقام کی ممکن صورت یہی نظر آئی کہ میں اُسے بچے کا زخم پہنچاؤں وہ عمر بھر اس کے لئے تڑپے اور میں کئی فرلانگ کا فاصلہ گھر کی جانب چلنے کے بعد یک دم اُلٹے پاؤں پھرا اور شہر کی طرف جانے والی سڑک پر تیز دوڑنے لگا کیونکہ مشرق کی جانب سے تباشیر سحر کی سفیدی جھلملانے لگی تھی اور مجھے دن نکلنے سے پہلے شہر سے نکل جانا تھا۔

اس سے بعد کے واقعات کی تفصیل میرے خیال میں ضروری نہیں یہ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ میں نے تمہیں کیسے ناز و نعم میں پالا — کہ حقیقی باپ بھی تمہارے لئے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا۔ اگر حقیقت سے آگاہ ہو کر تمہیں میرے قصوروار ہونے کا احساس پیدا ہو تو میں بھی تسلیم کروں گا کہ میں نے شاید زیادتی روا رکھی — مگر تمہارے فیصلہ سنانے سے قبل ہی اپیل کرنا چاہتا ہوں اسے مدنظر رکھ لینا —

سعید میرے نور نظر! یہ نہ بھول جانا کہ مجھے زندگی کی مسرتوں سے یکسر محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کے بدلے میں میں نے بھی انہیں دل کے سکون سے محروم کرنا چاہا۔ میرے پہلو میں گھاؤ ڈالتے ہوئے ذرا بھر رحم نہ کیا گیا

تھا۔ اگر میں نے بھی ان کے سینے میں ایک پھانس چبھو دی جس کی خلش عمر بھر محسوس ہوتی رہے تو ایسی بھی کیا زیادتی کی میں نے ؟"

اور معمر شخص انتہائی تفکّر کا انداز لئے ہوئے متوقع اور ملتجی نگاہوں سے اپنے مخاطب نوجوان کی طرف دیکھنے لگا جیسے واقعی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کی توقع رکھتا ہو۔ اور ان کی طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد سعید کو اگر ان کے خلاف کوئی شکایت پیدا بھی ہوئی تھی تو یک دم جاتی رہی — شفیق اور مجسم ایثار باپ کے چہرے پر اس انداز کا وہ متحمل نہ ہو سکا — "وہ تو اب بھی اسی کو باپ سمجھے گا۔" اس نے دل میں کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کر باپ کے قدموں میں جھکتے ہوئے انتہائی عقیدت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے

"ابو — ! آپ نے جو کیا مناسب کیا۔ آپ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس سے بہت کچھ زیادہ کرتا مگر — مگر مجھے آپ سے صرف ایک شکایت ہے ابو !"

اس نے نمناک آنکھیں باپ کی طرف اٹھا کر فریاد کے لہجہ میں کہا۔

"کیا — ؟" جعفر رضا نے سہم کر پوچھا۔

کہ آپ نے یہ خوفناک حقیقت مجھے اب کیوں بتا دی ؟ اسے سن کر تو مجھے اپنی ہستی سے نفرت ہونے لگی۔ کہ میں ایسے بدفطرت شخص کی اولاد ہوں جس نے سگے بھائی سے ایسا سفاکانہ ظلم روا رکھا۔ میں آپ سے شرمساری محسوس کیا کروں گا۔ کہ آپ نے میرے باپ کے ہاتھوں زندگی بھر کا دکھ پایا اور مجھے — ایک سپنولئے کو اس شفقت سے پالا۔ کہ باپ تو کیا کوئی ماں بھی اتنی مامتا اور قربانی کی اہلیت نہ رکھتی ہوگی — ؟"

وہ گلوگیر اور رقت بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔ جعفر رضا نے اسے سینے سے لگا لیا اور ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے — اب بھی تم میری آنکھوں کی روشنی ہو۔ میری روح کا چین اور میری زندگی کا حاصل ہو۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے حالانکہ اس سے پیشتر انہوں نے سعید سے کبھی زیادہ لاڈ پیار نہ کیا تھا اور بظاہر سنجیدہ شفقت کے سلوک سے تجاوز نہ کیا کرتے۔

"مگر آپ نے مجھے یہ بتایا ہی کیوں ابو — ؟"

سعید کو واقعی جعفر رضا سے شکایت تھی۔ کہ بھلا انہیں یہ کیا سوجھی کہ اس کی اچھی بھلی پرسکون زندگی کے ہموار تالاب میں یوں پتھر کھینچ مارا کہ اس کے ٹھہرے ہوئے پانی میں تکدر اور تموج پیدا ہو گیا۔

"بات ہی ایسی ہو گئی کہ مجھے بتانا پڑا — یہ پڑھو!"

اور انہوں نے پچھلے ہفتہ کا ایک پرانا روزنامہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جس کے ایک کالم میں چھپی ہوئی ایک خاص خبر پر انہوں نے سرخ پنسل سے نشان کیا ہوا تھا

چٹاگانگ کے متمول کارخانہ دار مظفر رضا سیٹھ انتقال کر گئے۔ ان کے وسیع کاروبار پٹ سن کے متعدد کارخانوں اور بے انداز دولت کا واحد اور بلاشرکت غیرے مالک ان کا اکلوتا فرزند ہے اس کے علاوہ ان کا کوئی وارث نہیں اہلیہ فوت ہو چکی ہے۔"

ان سطور کو پڑھ کر سعید استفسار کی نگاہوں سے جعفر کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہیں بلا توقف وہاں پہنچ کر اپنی وراثت سنبھالنی چاہیئے۔"

انہوں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ تو سعید کا سوالیہ انداز حیرت واستعجاب میں بدل گیا۔

"یہ — آپ کیا کہہ رہے ہیں ابو؟ آپ نے تو اس کے برعکس مجھے ہمیشہ یہ سبق دیا کہ ترکہ سے بدترین کوئی دولت نہیں۔ یہ نحس چیز اولاد کو ناخلف بناتی ہے۔ بچوں کے فرض شناسی اور سعادت مندی کے جذبہ میں زہر گھول دیتی ہے اخلاص کو تلف کر دیتی ہے اور وہ لالچ میں اس حد تک ناخلف ہو جاتے ہیں کہ والدین کی موت کا انتظار کرتے ہیں — اور آپ ہی اب مجھے ایسی دولت

کے حصول کے لئے کہہ رہے ہیں ؟" وہ حیرت زدہ صورت بنائے کہہ رہا تھا۔

" بیٹا! اپنے اپنے تجربات کے ماتحت، ذاتی مشاہدوں سے متاثر ہو کر ہر شخص کے چند ذاتی اصول بن جاتے ہیں۔ جنہیں کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یوں سمجھو کہ جو کچھ اس کے متعلق میں نے تم سے آج تک کہا۔ وہ میرے ذاتی اصول ہیں جو میرے مشاہدوں اور تجربوں سے تخلیق ہوئے اور بذات خود میں ان پر کاربند رہا۔

دیکھ لو عمر بھر کی کمائی سے جائداد کی قسم سے ایک رہائشی مکان تک نہیں بنوایا۔ ہزاروں روپیہ کی آمدنی کو ہمیشہ تمہاری تعمیر و آسائش پر صرف کرتا رہا — اور تمہیں اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنے کے قابل بنا دیا۔ اندوختہ یا جائداد کی قسم سے ایسی کوئی چیز نہ بنائی جس کے کبھی مستقبل قریب یا بعید میں تمہارے لئے میری ذات سے بڑھ کر پرکشش اور قابل توجہ ہونے کا احتمال ہو۔ تم ہمیشہ یہی سوچنے پر مجبور ہو کہ باپ جب تک زندہ ہے اس کا وجود تمہارے لئے نفع رساں ہے۔ یہ خیال تمہارے ذہن میں آنے کا امکان ہی باقی نہ رہا کہ باپ کی موت تمہاری خوشحالی اور امارت کی نوید لے کر آئے گی۔"

وہ سمجھانے کے انداز سے تقریر کرتے جا رہے تھے اور سعید ان کے منہ سے ایسے کلمات سن کر خجالت محسوس کر رہا تھا۔ کہ باپ نے اس کے متعلق ایسے خیالات کو تمثیلاً بھی کیوں دل میں جگہ دی۔

" ابو —! میری زندگی پر نفرین ہے کہ اگر آپ نے بالفرضِ محال بھی میرے متعلق یہ سوچا —! بخدا میرے لئے تو آپ دولت دو جہاں سے بڑھ کر قیمتی ہیں ابو! مجھے تو آپ کے ایک تنفس کے عوض کوئی دنیا بھر کی دولت دے تو بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں ؟" وہ روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ مجھے تمہارے متعلق خدانخواستہ یہ احتمال ہے میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے امکان یا خدشات کے پیش نظر میں نے اپنے چند جداگانہ اصول بنائے اور ان اصول کے ماتحت تمہاری تربیت اور پرداخت کی جس کے نتیجہ یہ اس وقت دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر تمہیں میری ہستی عزیز اور قیمتی ہے۔ میری موت کے بعد تمہیں محسوس ہوگا کہ تم نے ناقابل تلافی نقصان اٹھایا ہے کوئی چیز میری ذات کا نعم البدل ہونے کے لئے موجود نہ ہوگی اور یہ نقصان ایک مستقل یاد بن کر تمہارے ذہن پر نقش ہو جائے گا اور ـــــ میرے لئے آخری وقت میں یہ تسلی، سکونِ قلب کا باعث ہوگی کہ میں نے تمہیں کسی سہارے کے بغیر زندہ رہنے کے قابل بنا دیا۔"

انہوں نے دھیمی اور شفیقانہ آواز میں تقریر کی اور پھر محبت بار نگاہوں سے اس نوجوان کی طرف دیکھنے لگے جو آج تک انہیں اپنا حقیقی باپ سمجھتا رہا تھا۔

"الحمد اللہ کہ میں اس دنیا میں، آپ کے سوا کسی کے سہارے کا محتاج نہیں ہوں مجھے کوئی دولت درکار نہیں۔ جس شخص کے وجود تک سے میں آج تک بے خبر تھا اس کی دولت کا دعوے دار بن کر جاؤں؟ اس کو میری خودداری اور وقار برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس نے اپنے خوشنما سر کو غیرت مردانہ کے جوش میں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم مظفر رضا سیٹھ کے اکلوتے فرزند اور واحد وارث ہو اس کی دولت تمہارا جائز حق ہے اور اپنے جائز حق کو نظر انداز کرنا کفرانِ نعمت ہے اسی حق کے تحفظ کی خاطر میں نے تمہارے روبرو ایسا راز اگل دیا جسے میں اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کر چکا تھا اور اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جانے کا تہیہ کر چکا تھا ـــــ" انہوں نے کہا۔

"کاش! یہ راز آپ نے واقعی مجھے نہ بتایا ہوتا ـــــ ابو! مجھے بخدا آپ کی ہستی سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہیں۔ آپ نے محض مظفر سیٹھ کی دولت

کو میرے لئے حاصل کرنے کی غرض سے مجھے یہ دلآزار حقیقت بتائی اور اپنے اور میرے درمیان بُعد پیدا کر لینے کو گوارا کر لیا۔ مگر میں اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دوں گا کہ میں آپ کے سوا کسی دوسرے شخص کی اولاد ہوں مجھے کچھ نہیں چاہیے مجھے صرف آپ کی ضرورت ہے۔"

اُس کی آواز میں دکھ کا احساس موجود تھا۔ جیسے واقعی کوئی بے حد قیمتی چیز اس کے قبضہ سے نکلی جارہی ہو!"

"مگر بیٹا! اب تو تمہیں جاکر اپنی وراثت حاصل کرنا ہی ہوگی۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کر لیا۔

جو چیز آپ کو ہمیشہ ناپسند رہی اب اُس کی طرف آپ کا میلان کیوں ہو گیا ابو؟ کیا میرے فائدے کے پیش نظر؟ تو مجھے کچھ نہیں چاہیے!"

اس نے ضد کرنے کے لہجہ میں کہا۔ جعفر رضا چند لمحے اُس کی طرف غور سے دیکھتے اور کچھ سوچتے رہے۔

"میری ناپسندیدگی کی معقول وجوہات تھیں —— میں نے اپنے ماحول میں کئی ایسی قابلِ نفرت مثالیں دیکھیں کہ میرے ذہن میں اُن لوگوں کے خلاف استکراہ اور شدید نفرت کا احساس پیدا ہو گیا جو متمول والدین یا کسی صاحب حیثیت رشتہ دار کی جائداد اور دولت پر حرص و آز کی نگاہیں جمائے اس کی موت کا انتظار کیا کرتے ——" وہ کہہ رہے تھے۔

"تو پھر اسی لئے ——" سعید نے بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے اُسے چپ کراتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

مجھے ایسے شخص تو مردار خور گِدھوں سے بھی بدتر نظر آتے ہیں۔ وہ بھی کسی بیمار اور قریب المرگ جانور پر قبل از وقت تاک لگا کر نہیں بیٹھتے بلکہ اُسی وقت اُسے نوچنے کے لئے جھپٹتے ہیں۔ جب وہ مر جائے۔ مگر ان حریص لوگوں کی درندگی حیرت انگیز ہے۔ کہ وہ دوسرے کی محنت سے پیدا کی ہوئی، ایثار اور خود انکاری، نفس کشی اور خود ضبطی سے پس انداز کی ہوئی دولت کو سمیٹنے کے لئے اُس شخص کے مرنے کا بے تابی سے انتظار کرتے ہیں۔

ان کی حالت دیکھ کر تو بلا مبالغہ وہ کتے یاد آتے ہیں جو کان کھڑے کئے ہوئے حرص کی منتظر نظروں سے تاک میں بیٹھے ہوں، کہ کب ہڈی چھوڑ کر پھینکی جائے اور وہ اس پر جھپٹیں ——! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ایک ماموں تھے انہیں اپنے والد یعنی میرے سن رسیدہ نانا سے اس امر کی شدید شکایت رہتی کہ انہوں نے اتنی طویل عمر پائی کہ اولاد بھی ان کی موجودگی میں بڈھی ہونے لگی ہے مگر وہ ہیں کہ کس مستعدی اور پامردی کے ساتھ جیئے چلے جاتے ہیں ——وہ جب بھی ہمارے ہاں آتے اسی قسم کی باتیں کرتے اور امی انہیں لعنت پھٹکار کیا کرتیں۔

" مگر کیا اب پانچ سو سال زندہ رہنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں بڑے میاں؟" وہ ڈھٹائی سے کہتے۔

" والدین کا سایہ غنیمت ہے میاں! ان کی دعاؤں سے بڑی کوئی دولت نہیں اور پھر آخر کو تو سب کچھ تمہارے ہی لئے ہے گھبراتے کیوں ہو؟" امی سمجھاتیں

" واہ! اچھا سایہ ہے نحوست کہیں کی۔ ہر چیز کو ترستے رہو ان کی دعاؤں کو اوڑھوں یا بچھاؤں لے کر! چالیس برس کا تو میں بھی ہونے کو آیا اب خبر نہیں وہ "آخر" کب ہوگا جب سب کچھ میرا ہوگا۔

ماموں جھنجھلاہٹ میں آ کر امی سے الجھ پڑتے اور مجھے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ان کی باتوں پر نفرت محسوس ہونے لگتی اور جب میں سمجھ دار ہوا اور ماموں، نانا کی جائداد پا کر مطمئن اور خوشحال نظر آتے تو مجھے وہ بہت برے لگتے۔ میرے ذہن میں ان کے لئے کبھی بلند مقام پیدا نہ ہو سکا۔ میرے دل میں ان کے لئے ہمیشہ ہی نفرت کا احساس ابھر آیا۔ یہ اور ایسے ہی کئی تلخ حقائق نے مجھے دولت جمع کرنے اور جائداد بنانے کے خلاف کر دیا۔ خود ہمارے دادا مرحوم نے بھی چھوٹے بھائی کا حق غصب کیا ایسے ہی مشاہدوں سے متاثر ہو کر میں نے چند ذاتی اصول بنائے جن پر میں ہمیشہ کاربند رہا۔ مگر اس سے یہ تو پابندی نہیں ہو گئی کہ تمہیں مجھ سے کچھ نہ ملا تو تم اپنے حقیقی باپ کا ترکہ بھی چھوڑ دو۔ تم اس دولت کے واحد وارث ہو اگر تم دعوے دار نہ بنو گے تو وہ کہاں جائے گی —— ؟ اور پھر ہمارے مذہب

کی رو سے ترکہ حلال چیز ہے اور حلال کو حرام قرار دے کر مسترد کر دینا گناہ ہے۔"

جعفر رضا نے متعدد دلیلیں پیش کیں، خفگی کا اظہار کیا اور سعید کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا۔ کہ وہ چٹاگانگ جائے۔ لیکن رضامندی کے بعد بھی اس نے پھر ایک آخری حجت پیش کی۔

" اور ابو! اگر میرے گم ہو جانے کے بعد کوئی اور لڑکا پیدا ہوا ہو اور اس خبر میں اکلوتے بیٹے سے وہی لڑکا مراد ہو تو پھر؟"

سعید نے کہا تو جعفر یک دم چونک پڑے جیسے انہوں نے بھی محسوس کیا کہ ایسا امکان خاصہ قرین قیاس ہے۔

" ہوں — واقعی ایسا بھی ممکن تو ہے — لیکن اس کے باوصف تمہارا دعوٰے اپنی جگہ درست ہے۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے کہ تم مظفر سیٹھ کے پہلے بیٹے ہو۔

تمہاری تاریخ پیدائش کا سارٹیفکیٹ میں نے حاصل کر لیا تھا، جس میں تمہاری ولدیت درج ہے۔ میں بذاتِ خود تمہیں اپنی تحریروں کا جس میں میں نے اقبال کیا ہے کہ میں مظفر کے نوزائندہ بیٹے کو اٹھا کر لے آیا تھا۔"

آخر سعید کو اس شخص کے حکم پر صاد کہنا ہی پڑا جسے وہ آج تک اپنا باپ سمجھتا چلا آیا تھا۔"

(۳)

شہر پہنچ کر سعید نے پتہ دریافت کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کی منزل شہر کے دور افتادہ نواح میں ہے منظر سیٹھ کی اسٹیٹ اور رہائش گاہ "نکم" سے شہر کا ہر فرد واقف تھا۔ وہ ٹیکسی لے کر روانہ ہوا لیکن مشکلات نے شاید جلد ہی اس کا خیر مقدم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ کہ دو ڈھائی میل ادھر گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا اور اُسے باقی راستہ پیدل چلنے کی کوفت اٹھانی پڑی۔

شام ہو چکی تھی۔ بید اور بانس کے گھنے اور اونچے اونچے جھاڑ تنگ سڑک کے دو طرفہ یوں جھکے ہوئے تھے کہ خاصہ اندھیرا ہو گیا تھا۔ سڑک ویسے تو پختہ تھی مگر پیچ و خم اس قدر تھے کہ دس قدم پر وہ کناروں پر اُگے ہوئے گنجان پیڑوں میں گم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ چڑھائی شروع ہو گئی۔ راستہ اور بھی تنگ محسوس ہونے لگا۔ دونوں طرف چٹانیں ابھرنے لگیں اُن کے دامن میں اُگی ہوئی ناگ پھنی اور تھوہر کی گھنی جھاڑیاں راہگیروں کا دامن الجھانے کو راستہ روکے پڑی تھیں دشوار راستہ، اجنبی جگہ۔ مخدوش حالات ان سب کے تاثر سے بیچارا سعید بے حد گراں خاطر اور بیزار ہو رہا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے جب اُسے آبادی کی روشنیاں نظر آنے لگیں اور سڑک نشیب کی طرف مائل ہوئی اب اُس کی بوجھل اور تھکی ہوئی ٹانگیں اُسے

غیر اضطراری طور پر ہی اترائی کی طرف دوڑائے لے جاتی تھیں۔ خدا خدا کر کے وہ آبادی میں داخل ہوا۔ بہ مشکل ڈیڑھ سو گھروں کا چھوٹا سا گاؤں تھا کھپریل کے گھروندوں میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ جن کے عقب میں ایک دو منزلہ عمارت مغرورانہ جیسے انداز میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ ان حقیر جھونپڑوں کے ماحول میں اس کی یہ سرفرازی ایک مرعوب کن اور بارکانہ طبیعت لئے ہوئے گویا زبان حال سے کہہ رہی تھی ۔" میں ایمن سپہر سایہ فگن ہوں ۔

سعید قدم برداشتہ اُسی حویلی کی طرف بڑھا اُسے کم از کم آدھا میل اور چلنا تھا۔ اب وہ گاؤں کے بازار میں سے گزر رہا تھا۔ دوکانوں پر بیٹھے ہوئے دوکاندار اور اکا دکا گاہک پلٹ پلٹ کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک شخص نے اس کے راستہ میں آکر پوچھا۔

" صاحب! کس طرح آنا ہوا!؟ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

" مجھے مظفر رضا سیٹھ کے ہاں جانا ہے بھیا!" سعید نے نرم لہجہ میں کہا۔

" سیٹھ تو فوت ہو چکے ۔" اس نے کہا۔

" ہاں مجھے معلوم ہے — جو کوئی ان کے ہاں رہتا ہے اُسی سے ملنا ہے مجھے ۔" سعید کہنے لگا۔

ان کا بیٹا ہی رہتا ہے — اور کون رہتا ہے ان کے ہاں ؟"

وہ شخص سعید کی لاعلمی پر ہنس دیا اور سعید کا دل متوقع حالات کے پیش نظر مکدر سا ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ بھی اُس کے گرد و پیش جمع ہو گئے تھے انہیں میں سے ایک بولا۔

چھوٹے سیٹھ تو ابھی مینجر جلیل کے ہاں بیٹھے تھے، آئیے میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں —!"

اور وہ سعید کو ساتھ لے کر ایک تاریک جیسی گلی میں گھس گیا سعید حیران تھا کہ وہ کن لفظوں میں اپنا تعارف کرائے گا اُس کے بھائی نے اُسے اپنا بڑا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ؟ اگر وہ اپنے بڑے بھائی کی گمشدگی کے واقعہ سے ہی بے خبر ہوا تو ؟ سوچ رہا تھا۔

"کیا نام ہے سیٹھ کا؟" اس نے اپنے رہنما سے پوچھا۔

"ذاکر رضا" اس نے جواب دیا۔

"یہ مظفر رضا سیٹھ کے چھوٹے بیٹے ہوں گے؟"

سعید نے پوچھا تو وہ شخص مارے حیرت کے یک دم اُس کی طرف پلٹا۔

"چھوٹے بیٹے؟" اُس نے حیرانی کے واضح لہجہ میں پوچھا۔

"جی ہاں — سیٹھ کا بڑا بیٹا تو —"

وہ سعید کی بات کاٹ کر ہنسنے لگا۔ اور بولا۔

"بھائی! سیٹھ کا یہی تو ایک بیٹا ہے اور کوئی اولاد نہیں۔ یہ ابھی چند سال کا تھا کہ ماں مر گئی۔ سیٹھ نے دوسری شادی ایک بیوہ عورت سے کی جس سے کوئی اولاد نہ ہوئی!"

سعید کی عجب حالت تھی اس دور افتادہ مقام سے اب وہ آسانی سے واپس جا سکتا تو سیٹھ ذاکر سے ملے بغیر ہی واپس چلا جاتا، اُسے کسی پیچیدہ مسئلہ میں الجھنا پسند نہ تھا۔ جس شخص نے اُسے آج تک نہیں دیکھا نہ ہی وہ اس وقوعہ سے واقف ہے کہ کوئی اس کا بڑا بھائی بھی تھا جسے اغوا کر لیا گیا تو کیونکر اس کے حق کو تسلیم کرے گا۔ پھر بڑے بچے کی گمشدگی کو اتنا پوشیدہ رکھا گیا۔ کہ لوگوں کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں — اور اتنے ہی میں رہنمائی کرنے والا شخص ایک مکان کے سامنے ٹھہر گیا۔

"یہاں سیٹھ کا مینجر رہتا ہے"

یہ ایک نیم پختہ مکان تھا جس کے برآمدہ پر گھنی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ معاً سامنے کمرے سے کسی نے غصہ میں چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

"اور میرا نام بھی سیٹھ ذاکر نہیں اگر میں اُسے زندہ چھوڑ دوں —!

میں اس کا عادی نہیں کہ کوئی میرے منہ آئے اور میں چشم پوشی کر جاؤں!

میرا حریف بن کر کوئی دندناتا پھرے؟ ناممکن!"

اور ساتھ ایک دھماکے اور جھنکار کی آواز آئی جیسے اس نے اپنے الفاظ کو پُر زور بنانے کے لئے میز پر مکا مارا تو میز پر پڑے ہوئے شیشے کے

گلاس جھنک اُٹھے — جو آدمی سعید کے ساتھ آیا تھا، اس نے اندر جا کر اطلاع کی کہ کوئی ملنے آیا ہے۔

کون بدبخت اس وقت ملنے آیا ہے؟ دن نہ چڑھتا تھا کیا اس مردود کے لئے؟"

ذاکر سیٹھ اپنی بھاری آواز میں غرایا اور سعید نے اُس کے اخلاق اور مزاج کا اندازہ انہیں چند لفظوں سے کر لیا- اور اسے افسوس ہوا-

کہیں باہر سے آیا ہے" اُس شخص نے بتایا۔

" باہر سے؟ کہاں سے پھر بھی — ؟"

اس شخص نے دبی زبان سے کچھ کہا تو اس کے جواب میں پھر سیٹھ کی تند آواز آئی اور چند لمحوں کے بعد وہ خاصے دھماکے کی آواز سے چلتا ہوا باہر آیا۔ سعید کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ شخص اس کا حقیقی بھائی تھا! وہ کن لفظوں میں اپنا تعارف کرائے — ؟ کیا وہ اسے اپنا بھائی تسلیم کرے گا؟ یہ سوالات پھر تیزی سے اس کے ذہن میں گونجے اور وہ حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے ہوئے گوشت پوست کے گرانڈیل مجسمہ کو دیکھنے لگا۔ جو انسان سے زیادہ کسی جنگلی ریچھ سے مشابہ تھا نکھری ہوئی چاندنی میں اُس کے نقش و نگار جہاں تک واضح تھے سعید نے دیکھا کہ وہ نہایت کریہہ منظر اور بدہئیت انسان تھا، چوڑے چوڑے پرگوشت شانے اُوپر کو اُٹھے ہوئے تھے۔ کوتاہ سی گردن آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ تنگ پیشانی پر حیرت سے شکن ڈالے ہوئے اُس نے گھنی پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھوں سے سعید کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ کی تعریف؟"

مگر اس رسمی تپاک کے باوصف، اس کے لہجہ اور آواز میں گھرکنے کی سی کرختگی اور روکھا پن تھا۔

" آپ ہی مظفر رضا سیٹھ کے فرزند ہیں؟" سعید نے پوچھا۔

جی ہوں تو سہی — ! آپ اپنے متعلق فرمایئے کون ہیں؟ کہاں سے آئے

ہیں ؟ اس وقت تکلیف فرمانے کی وجہ کیا ہے ؟"

وہ یوں غرائی ہوئی پُرشور آواز اور غصیلے لہجہ میں پوچھ رہا تھا جیسے لڑنے پر آمادہ ہو۔ اور سعید کو حقیقت حال بتانے میں تامل ہوا۔

"میں سعید جعفر ہوں — آپ کے چچا جعفر رضا خاں کا بیٹا —"

سعید نے معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تو اس کے مخاطب نے بھی اپنا لمبا سا بازو جو گھٹنے تک پہنچتا تھا کچھ بے دلی سے اٹھا کر اس سے ہاتھ ملایا۔ مارے حیرت کے اس کی پیشانی اور بھی شکن آلود ہو گئی اور اس کے انداز میں خوشی کی کوئی علامت پیدا نہ ہو سکی جو عموماً کسی عزیز کو غیر متوقع طور پر پا کر ایک شخص کو ہوتی ہے۔

"اندر آ جائیے —"

اس نے مشکوک جیسی نظروں سے سعید کی طرف دیکھتے ہوئے شبہ کے لہجہ میں کچھ اس طرح کہا جیسے اُسے اپنے اس ناخواندہ مہمان کے بیان پر مطلق یقین نہ ہو۔

سعید کو لئے ہوئے جس کمرے میں اُس کا میزبان داخل ہوا۔ وہ ایک معمولی جیسا کمرہ تھا۔ ایک طرف چمڑے سے منڈھا ہوا لمبا صوفہ پڑا تھا جسے شاید بیٹھنے کے لئے زیادہ استعمال نہ کیا جاتا تھا کہ اس پر ردی اخباروں، میلے کپڑوں اور مختلف دور از کار چیزوں کا ایک خاصا بڑا انبار پڑا تھا درمیان میں ایک غالیچہ بچھا ہوا تھا جس پر ایک گول میز پڑی تھی۔ اس پر رکھے ہوئے سامان سے ظاہر تھا کہ وہ لوگ اس وقت ناؤ نوش کے شغل میں تھے۔ میز کے گرد بید کی چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ سیٹھ نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے گویا سعید کو بیٹھنے کی دعوت دی اور خود ایک کرسی کے دونوں پہلوؤں کی جانب ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ بلکہ موزوں لفظوں میں کرسی پر سوار ہو گیا جو اس کی جسامت کے لحاظ سے بہت چھوٹی اور کمزور سی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ٹوٹ جائے گی۔

بڑے سے گلوب والا شیشے کا لمپ قریب ہی ایک سٹول پر رکھا تھا اپنی

نشست پر آرام سے بیٹھتے ہوئے سعید نے ذاکر کی طرف دیکھا تو وہ کسی تندر جاموش صحرائی کی مانند اُسے گھور رہا تھا۔ اس کے متوجہ ہوتے ہی بولا۔

" ہوں — " تو آپ فرماتے ہیں کہ آپ میرے چچا کے بیٹے ہیں ؟"

اُس نے دوسرے شخص سے جو کمرے میں موجود تھا سعید کا تعارف کروانے کی ضرورت محسوس کئے بغیر استفسار کیا اُس کے لہجہ میں صریحاً شبہ موجود تھا۔ اور اس کا منیجر واضح حیرت کے انداز میں سعید کی طرف دیکھنے لگا۔ سعید کی عجب کیفیت ہوئی لیکن وہ اپنی طبعیت پر قابو پاتے ہوئے متین اور دھیمے لہجہ میں کہنے لگا۔

" جی ہاں — میرے والد جعفر رضا، آپ کے والد کے چھوٹے بھائی ہیں۔"

ہیں — ؟ گویا کہ — ہیں ؟"

ذاکر سیٹھ نے اپنی چپٹی ناک کے غیر واضح سے نتھنے پھیلا کر پوچھا۔

" جی ہاں — الحمد اللہ! میرے والد اللہ کے فضل سے بقید حیات ہیں!"

سعید نے جواب دیا۔

مگر وہ سالہا سال سے لاپتہ ہیں۔ ان کی کبھی کوئی خبر خیریت ہمیں موصول نہ ہوئی۔ سنا ہے جن دنوں میں پیدا ہوا۔ وہ پاگل خانہ میں تھے۔ ایک دن نگرانوں کی غفلت سے نکل بھاگے اور جوش جنون میں کسی طرف نکل گئے، پھر کبھی انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ مگر اب اتنی مدت کے بعد آپ آکر کہتے ہیں کہ آپ ان کے بیٹے ہیں — ؟"

ذاکر نے جرح کا انداز اختیار کر لیا تو بیچارا سعید بہت گھبرایا۔

مجھے خود معلوم نہ تھا کہ والد کے سوا بھی میرا کوئی عزیز رشتہ دار موجود ہے انہوں نے اخبار میں بڑے ابو کے انتقال کی خبر پڑھی تو — کوائف معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔"

سعید نے کچھ جھینپ کر کہا، ذاکر نے اس کے جواب میں ایک نہایت پر شور قہقہہ بلند کیا اور چندیا سی آنکھیں پھاڑ کر تمسخر اور طنز کی نگاہوں سے

سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا — ! تو یہ بات ہے؟"

مینجر بھی ہنس رہا تھا۔ سعید کی عجب کیفیت تھی جوشِ غضب اور خفت کے احساس سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن مہذب اور با اخلاق نوجوان تھا اپنے جذبات پر قابو رکھنا جانتا تھا۔ خصوصاً جب کہ ایسے مخمصہ میں آ پھنسا تھا کہ جہاں "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والا معاملہ تھا، اس نے ضبط اور تحمل سے کام لینے کا فیصلہ کیا، اسے اپنے خطرہ کا اندازہ اُسی وقت ہو گیا تھا۔ جب ذاکر سیٹھ نے کہا تھا کہ جن دنوں میں پیدا ہوا وہ پاگل خانہ میں تھے" حالانکہ جعفر رضا کے بیان کے مطابق تو ان دنوں ہی خود سعید پیدا ہوا تھا جب وہ پاگل خانہ سے فرار ہوئے اور جوشِ انتقام میں نوزائیدہ بھتیجے کو جو سعید کے کوئی نہ تھا وہ اغوا کر لے گئے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ یہ شخص ذاکر سعید ہی کا مثنیٰ اور جانشین تھا۔ اور اس کے اندازے کے مطابق اس کا چھوٹا بھائی نہیں تھا یہ سب باتیں نہایت سرعت کے ساتھ اس کے ذہن میں آئیں اور وہ مصلحت بینی کے پیشِ نظر نرمی سے کہنے لگا۔

دیکھئے نابرادر! مانا کہ میرے والد کسی رنجش یا محض دماغی اختلال کی وجہ سے روپوش ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ماضی کے متعلق کبھی کچھ بتایا ہی نہ تھا نہ ہی مجھے کبھی جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ اپنے ماضی میں ان کے لیے کوئی خوش گوار کشش نہ تھی لیکن موت ساری کدورتیں دھو دیتی ہے۔ جب اخبار میں بھائی کی وفات کی خبر پڑھی تو بے حد رنجیدہ ہوئے۔ خود بے حد کمزور اور ضعیف ہو چکے ہیں۔ مجھے اپنی جگہ بھیجا کہ خبر لوں کہ اُن کے پسماندگان میں سے کون کون ہے اور ان کی دلجوئی کروں کہ اگر باپ کا سایہ اٹھ گیا تو ان کی بجائے چچا ابھی بقیدِ حیات ہے۔ انسان کے لیے بزرگوں کی ہمدردانہ موجودگی کی ہر حالت اور ہر عمر میں ضرورت ہوتی ہے بس یہی غرض میرے یہاں آنے کی تھی اگر میرا آنا آپ کے لیے گراں خاطر ہوا تو میں صبح ہی واپس چلا جاؤں گا، راستہ بے حد خراب ہے ورنہ ابھی واپس جانے سے گریز نہ کرتا۔ اگر آپ اس وقت کسی

سواری کا انتظام کر سکیں تو میں احسان مند ہوں گا، میرا وقت بھی بچ جائے گا کہ صبح آٹھ بجے کے طیارہ سے واپس پرواز کر جاؤں گا۔"

ذاکر اور اُس کا منیجر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے خوبرو اور تنومند نوجوان کی مہذب تقریر کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ ذاکر کے کریہہ چہرہ پر طنز کا انداز قدرے پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر اس کی وہ عیاری مسلسل اس پر گڑی ہوئی تھیں منیجر کے رویہ میں البتہ نمایاں تبدیلی واقع ہوئی اُس نے بنگالی میں زیر لب کچھ کہا تو ذاکر سعید کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

واہ! یہ آپ نے کیا کہا۔ اگر واقعی آپ میرے چچا زاد بھائی ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو اس طرح واپس بھیج دوں، اس صورت میں اب چچا اور آپ ہی تو دنیا بھر میں میرے رشتہ دار ہیں۔ میں تو بعض اوقات اس کمی کو بے حد محسوس کرتا ہوں کہ میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ دور نزدیک سے کوئی ایسا نہیں جسے اپنا کہہ سکوں۔"

وہ کہہ رہا تھا مگر اس کے لہجہ میں اُس بیچارگی اور احساس تنہائی کا کوئی تاثر موجود نہ تھا جو وہ ظاہر کر رہا تھا اور سعید بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ منیجر بول اُٹھا۔

دیکھئے نا صاحب! اگر ایسے حالات میں کہ ہمارے بوس کو عمر بھر کسی چچا یا بھائی کی موجودگی کا علم ہی نہ تھا انہیں آپ کی شخصیت کے متعلق کچھ شبہ ہوا تو ان کا ایسا کرنا حق بجانب ہے۔ اس نکتہ پر آپ ان کی تسلی کر دیجئے تو پھر دیکھئے کہ یہ کیسے مخلص اور مشفق بھائی ثابت ہوتے ہیں۔"

سعید نے جیب سے کچھ کاغذات نکالے۔

"یہ میرے والد کا شناختی کارڈ ہے جس پر ان کی تصویر، نام اور ولدیت موجود ہے۔"

اس نے ایک پرانا کارڈ ذاکر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ذاکر غور سے تصویر کو دیکھنے لگا جعفر چچا کی جوانی کے زمانہ کی ایک تصویر ابو اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ اتری ہوئی میرے پاس موجود تو ہے مگر۔"

وہ کچھ تذبذب سے کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

" یہ ڈھاکہ کے ایک آفیسر کے نام ابو نے تعارفی خط دیا تھا، جس کا جواب انہوں نے دیا ہے وہ ابو اور ان کے گزشتہ حالات سے اچھی طرح واقف ہیں"

اور وہ خط سعید نے ذاکر کی طرف بڑھایا۔ ذاکر بڑے غور سے پڑھتا رہا

" ہوں — ٹھیک!" اس نے گویا نیم فائل بہتے ہوئے کہا۔

" یہ میرا شناختی (آیڈینٹی فیکیشن) کارڈ ہے۔ میں نے ایم۔ بی۔ بی ایس کر کے حال ہی میں ملٹری میں کمیشن لیا ہے۔ اپنے یونٹ کے ساتھ فرنٹ پر جانے والا تھا کہ والد نے فوری طور پر طلب کیا اور یہاں بھیجا۔"

سعید بیان کر رہا تھا اور دونوں کارڈ پہلو بہلو رکھے ہوئے بڑے غور سے دونوں تصویروں کا باہمی موازنہ کر رہا تھا۔

" بس میرے پاس تو اپنی شخصیت کے یہی شناختی ثبوت ہیں۔ اگر آپ انہیں تسلیم کر سکیں —!" سعید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے —! اور اب ہمیں واقعی بھائیوں کی حیثیت سے گلے ملنا چاہیے۔"

ذاکر نے اپنے بدہیئت اور کرخت چہرے پر اوپری سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ اور اپنی نشست سے اٹھ کر سعید کی طرف بڑھا جواب میں سعید بھی کرسی سے اٹھا اور دونوں بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے لیکن اس کے باوجود نہ صرف سعید کا دل بجھا بجھا اور مکدر سا رہا بلکہ اس کے جسم میں ایک عجب قسم کی سنسنی جیسی دوڑ گئی۔ جیسے کوئی پراسرار اور غیر مرئی قوت اسے کسی خطرہ کا احساس دلا رہی ہو۔ اب تو منیجر نے بھی بڑے مودبانہ خم کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور اس مبارک موقعہ پر مہمان عزیز کی صحت کا جام پینے کی تجویز پیش کرتے ہوئے، میز پر رکھی ہوئی بوتل اٹھا کر اس میں سے آتشیں سیال کو گلاسوں میں ڈالنے لگا۔

" مجھے تو اس رسم سے معاف ہی رکھیئے بھائی میں اس چیز کا عادی نہیں ہوں —— آپ بخوشی شوق فرمایئے —" سعید کہنے لگا۔

وہ دونوں اپنی حریص نگاہیں جھلملاتے ہوئے گلاسوں پر سے ہٹا کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہیں ——؟ یہ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ آپ ملٹری آفیسر ہیں اور پینے کے عادی نہیں؟" ذاکر کا منیجر بولا۔

سعید ہنسنے لگا۔

پینا کوئی ملٹری کے ضوابط میں تو شامل نہیں۔!" اُس نے خندہ روئی سے کہا۔

"نہ سہی لیکن اخلاقاً دوستوں کے ساتھ شامل ہونا پڑتا ہے۔ اور پھر فیشن کی پابندی لازمی ہے۔" ذاکر نے بھی فقرہ ملایا۔

"خیر بھائی جیسا کچھ پیش آئے گا دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو میں اسی ماہ متعین ہوا ہوں۔"

سعید نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔ اس وقت شراب نوشی کے خلاف زیادہ کچھ کہنا اُسے آئین صلح جوئی کے منافی معلوم ہوا۔ اور اُس نے کچھ ایسے پیرایہ میں معذرت کی کہ دونوں میں سے کسی کو اُسے مجبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

"اچھا آیئے اب گھر چلیں۔ کھانے کا وقت بھی ہو گیا۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز سے سعید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اچھا جلیل! شب بخیر! میرے بھائی کا بیگ کسی چھوکرے کے ہاتھ بھیج دینا۔"

اس نے اپنے منیجر کی طرف مربیانہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا اور سعید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے جھومتا جھامتا کمرے سے نکل گیا۔

(۴)

سبزے کی باس میں رچی ہوئی نمناک ہوا کے تیز جھونکے سبز پھول دار مسہری کو ہلکورے دے رہے تھے کہ سعید کی آنکھ کھلی۔ اگرچہ وہ رات اچھی طرح سو نہیں سکا تھا۔

کمرے میں سیلی سیلی بو تھی جیسے مدتوں بند رہا ہو۔ بستر بھی چھپا اور مرطوب جیسا تھا۔ پھر اجنبی اور غیر مانوس جگہ۔ کہیں پچھلی رات اس کی آنکھ لگی ۔ تو بھی بے قرار اور شکستہ سی نیند آئی کبھی جاگ اٹھتا جیسے کسی کے قدموں کی آہٹ نے اُسے نیم خوابی سے ہشیار کر دیا ہو کبھی عالم نیم بیداری میں کچھ بیوے سے دیکھتا مبہم سی آہٹیں سنتا ہوا پھر نیند میں غافل ہو جاتا۔

اب جو بیدار ہوا تو خاصا دن نکل آیا تھا۔ فضا میں سبزی مائل نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ نماز صبح کے فریضہ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کے سامنے کی بالکنی پر نکل آیا اور گرد و پیش پر نگاہ ڈالی دور دور تک گنجان جنگلات پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ بنگلہ ایک اونچے ٹیلے پر تھا اور نشیب میں چاروں طرف کھلے اور وسیع مرغزار تھے۔ جن کے کناروں پر کھڑی ہوئی سبز پوش

چٹانیں اونچے نیچے درختوں سے ڈھکی ہوتی تھیں۔ افق مشرق سے طلوع آفتاب کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ گنجان درختوں کے گھنیرے سایوں میں شفق کی ہلکی ہلکی سرخی جھلملانے لگی تھی۔ گہرا لاجوردی آسمان یوں لگتا تھا، جیسے بہت قریب جھک آیا ہو۔ وہ اس حسین نظارہ میں کھویا ہوا تھا کہ اپنے پیچھے ایک سریلی سی آواز سے چونکا۔

"ناشتہ کے لیئے نیچے بلایا ہے سیٹھ نے!"

اس نے پیچھے پھر کر دیکھا تو وہی نوعمر بنگالی ملازمہ کھڑی تھی جو رات کھانے کی میز پر نہایت مستعدی اور ہنرمندی سے کھانے پیش کر رہی تھی چودہ پندرہ برس کی دبلی پتلی، سانولی رنگت والی یہ لڑکی خاصی دلکش تھی۔ اس کی ہرن جیسی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں کچھ ایسی گہرائی لیئے ہوئے تھیں جیسے کئی بھید اور اسرار ان کی گہرائیوں میں ڈوب چکے ہوں۔

دانت ہموار اور سفید تھے جن کی جھلک بہت ہی کم دیکھنے کو ملتی۔ کیونکہ چپ کا انداز لیئے ہوئے وہ گداز ہونٹ انہیں ہر وقت چھپائے رہتے۔ سعید اُس کی طرف دیکھتے ہی بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ کا سبب اس چھوکری کے نام کے سوا کوئی نہ تھا۔ رات بھی جب خاتون خانہ اسے پکارتی تو وہ ضبط کی کوشش کے باوجود مسکرا پڑتا۔ اور دل میں کہتا نام بھی تو عجیب ہی رکھ دیتے ہیں بعض لوگ۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے۔"

"بشو!"

"آیئے۔!" وہ جانے کو مڑتے ہوئے بولی۔

"چلو!" سعید کہنے لگا اور بشو کے پیچھے پیچھے زینہ اترنے لگا۔

اس دور افتادہ مقام پر رہتے ہوئے بھی سیٹھ کے ہاں مغربی طرز بود و باش رائج تھی۔ کیونکہ کاروبار کے سلسلہ میں اکثر بڑے سیٹھ کو مغربی ممالک جانا پڑتا اور وہ خود بھی جب کبھی اپنے غیر ملکی دوستوں کو مدعو کرتے تو شہر کی نسبت انہیں اس بنگلہ پر مدعو کر کے زیادہ خوشی اور فخر محسوس کرتے اور ذاکر سیٹھ تو پروان ہی اسی تہذیب کی آغوش میں چڑھا تھا۔ سعید بشو کی رہنمائی میں طویل غلام گردش

طے کرتا ہوا ایک آراستہ ڈائننگ ہال میں پہنچا۔ اس کے میزبان انتظار میں تھے دیکھتے ہی ذاکر نے خیر مقدم کیا مزاج پوچھا۔ اپنے قریب کی کرسی پر بٹھایا اور ناشتہ شروع ہوا، سامان خاصا پر تکلف تھا۔ نیم برشت انڈے، پڈنگ، تلا ہوا گوشت اتنی وافر مقدار میں ہر چیز موجود تھی جیسے کئی آدمیوں کے واسطے تیار کی گئی ہو۔ حالانکہ میز پر تین ہی آدمی تھے۔ خاتون خانہ ایک معمر عورت تھی جس سے رانا سعید کا تعارف کرواتے وقت ذاکر نے بتایا تھا کہ بچپن ہی میں جب اس کی والدہ فوت ہو گئیں تو انھوں نے ہی اسے پالا تھا۔

یہ سیٹھ مظفر کے ایک نہایت ہی عزیز دوست کی بیوہ تھیں ان کے شوہر سیٹھ کی مل میں ایک سٹرائک کے ہنگام قتل کر ڈالے گئے تو سیٹھ نے دوست کی جواں سال بیوہ کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ خاتون موصوفہ نے بھی اپنے محسن اور مربی کا حق نمک عمر بھر ادا کیا اور اب بنفس نفیس ذاکر کی ماں کی بجائے گھر کی مالکہ کی حیثیت سنبھالے ہوئے تھیں اور حقیقی معنوں میں سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ ان کا ہر حکم خود سیٹھ ذاکر کے حکم پر فوقیت اور برتری رکھتا تھا "ماں جی" کے متعلق یہ سارے اور بہت سے اور کوائف سعید کو اپنی "نگم" میں رہائش کے دوران مختلف لوگوں سے معلوم ہوئے ورنہ ذاکر نے تو اتنا ہی کہا تھا۔ "یہ ہے میری ماں جی جنہوں نے امی کے مرنے کے بعد مجھے ماں کی طرح پالا اور ماں سے بڑھ کر پیار کیا۔"

ذاکر بذات خود اپنے چچا زاد کی مدارت میں مصروف تھا ہر شے اپنے ہاتھ سے اٹھا اٹھا کر اس کے سامنے رکھتا اور اصرار کر کر کے اُسے کھلا رہا تھا۔ حسن سلوک میں "ماں جی" بھی ذاکر سے پیچھے نہ تھیں۔

"کھاؤ نا بیٹے! تم تو اس قدر تکلف کر رہے ہو جیسے کسی غیر کے ہاں بیٹھے ہو۔ بھیا! تمہارے تایا کا گھر ہے۔ اگر تم کبھی ان کی زندگی میں آتے تو وہ یقیناً تمہیں ذاکر سے کم نہ چاہتے۔ بہت یاد کرتے تھے جعفر کو۔ اکثر رو دیا کرتے تھے ڈھونڈنے میں بھی کسر نہ چھوڑی مگر وہ نیک بخت کہیں ایسا چھپا کہ کسی طور ملنے میں نہ آیا۔ لو یہ حلوہ تو کھاؤ میں نے خود بنایا ہے تمہاری خاطر۔"

وہ بات کو کسی موضوع سے شروع کرتی اور طول دیتے دیتے کسی اور موضوع پر جا کر ختم کرتی، گفتگو کا انداز اور لہجہ اس انتہا تک بیٹھا کہ غلو محسوس ہونے لگتا — اس کے باوصف خبر نہیں یہ کیا حرکت تھی - کہ جب سعید متوجہ ہوتا تو وہ اُسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہوتی جن میں خشونت اور کینہ کی واضح جھلک دکھائی دیتی اس کے متوجہ ہوتے ہی جھٹ وہ اپنی ارزقی آنکھوں کو تنگ کر کے نہایت شفقت سے مسکرا پڑتیں اور کوئی نہایت مشفقانہ سی بات چھیڑ دیتیں۔ ایسے موقعہ پر کبھی اتفاقاً جو اس کی نگاہ "بیٹو" کی طرف اُٹھ جاتی تو وہ صریحاً حیرت زدہ سی اپنے ہر دو آقاؤں کی طرف دیکھ رہی ہوتی جیسے وہ ان کے اخلاق و عادات کے اس خوشگوار پہلو سے قطعاً غیر مانوس ہو۔

پہلے دن ناشتہ سے فارغ ہو کر ذاکر نے سعید سے کہا کہ وہ جلدی جلدی تیار ہو جائے اور اس کے ہمراہ شہر چلے۔ جتنا عرصہ بھی وہ یہاں رہے گا۔ وہ اسے ہر گھڑی اپنے ساتھ رکھے گا اور ماں جی اپنی چھوٹی سی خاک سیکڑ کر منگولوں کی سی ترچھی ارزقی رنگت کی آنکھوں کو تنگ کر کے ہنسنے لگیں تو ان کے سرخ و سفید گداز چہرے پر چھوٹے بڑے کئی گڑھے نمودار ہو گئے۔

لو بھلا دیکھو تو سہی! اتنی جلدی ایسا پیار ہو گیا کہ بیچارے ایک پل کو نہ چھوڑیں گے بھائی کو —!" وہ نہایت خوشدلی سے بولیں۔

کیوں نہ ہو؟ خون کی کشش ہے!" ذاکر اپنے اونچے کندھوں کو کسمساتے ہوئے کہنے لگا۔

چلو شکر ہے تمہیں بھائی مل گیا۔ کتنا شوق تھا تمہیں کہ کوئی دوسرا بھائی ہوتا۔"

ماں جی کہنے لگیں۔ ذاکر الٹے ہاتھ کی پشت سے اپنی چپٹی ناک کو مسلتے ہوئے ماں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"ہاں — شکر ہے: اکیلا آدمی کس کام کا؟"

ہنستے میں اس کے چھدرے چھدرے زرد دانت کتنے بدنما لگتے تھے پھر ستم یہ کہ پورے کا پورا جبڑا پھاڑ کر وہ کریہہ منظر آدمی ہنستا تو بعینہٖ ہی کوئی

بن مانس دکھائی دیتا۔ بعض اوقات، تو مارے کراہیت کے سعید کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ۔" اچھی صورت بھی فاطر صادق کی کتنی بڑی دین ہے۔" وہ سوچتا مگر پھر اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا کہ "چلو قدرت نے جیسا بھی بنا دیا کسی کا اپنا اختیار تو نہیں، بہر حال خوش خلق تو ہے۔ یہی غنیمت !"

سعید لباس تبدیل کر کے نیچے آیا تو ذاکر ڈرائنگ روم میں تھا۔ جب یہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ مینڈل پیس کے آگے کھڑا ہوا سیٹھ مظفر کی تصویر کو دیکھنے لگا۔

" یہ میرے ابو کی تصویر ہے !"

ذاکر کہنے لگا اور ساتھ ہی پلٹ کر بغور سعید کی طرف دیکھا، کتنی واضح مشابہت تھی مظفر رضا اور سعید کے نقش و نگار ہیں ! چند لمحوں کے لئے تو ذاکر بھونچکا سا رہ گیا اور اسی لمحہ سعید اپنے دل میں کہہ رہا تھا ۔" یہ ہے میرے باپ کی تصویر !"

" میرے ابو سے بہت ملتی ہے ان کی صورت !" چند لمحوں کی محویت کے بعد سعید نے بلند آواز سے کہا۔

" ہاں ! بہت !"

ذاکر نے تائید کی اور اپنے لمبے لمبے بازوؤں کو لٹکائے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے حسب معمول درشت اور کرخت آواز میں پکارا۔

" اے چھوکری ! نیل کنٹھ سے کہہ جیپ باہر نکالے —!"

وہ غالباً بیٹو سے کہہ رہا تھا کیونکہ اُس کے سوا گھر میں اور کوئی ملازمہ نہ تھی ۔

" آؤ سعید بھیا ! اتنے میں تمہیں چمن کی سیر کراؤں ۔"

اور وہ سعید کو ساتھ لئے ہوئے ٹہلتا ٹہلتا گردش طے کرتا ہوا برآمدہ میں پہنچا، برآمدہ کے محرابوں پر گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں شگفتہ پھولوں کے گچھوں کی اتنی کثرت تھی کہ پتے کم نظر آتے تھے ۔ سامنے ایک نیم دائرہ بناوٹ کا لان تھا جس کے گرد صرف دو فٹ اونچی حنا کی باڑھ تھی جسے تراش

خراش سے دیوار کی صورت دے دی گئی تھی۔ اس وسیع نیم دائرہ میں رنگ برنگ اور ملک ملک کے اعلیٰ قسموں کے گلاب تھے۔

"میرے باغیچہ میں آپ کو ہر ملک کا گلاب مل سکے گا۔"

وہ باغیچہ میں ٹہلتے ہوئے مختلف جھاڑیوں کے قریب ٹھہر جاتے اور ذاکر ان پھولوں کی کیفیت اور ماہیئت بیان کرتا اور بتاتا کہ وہ کون سے ملک سے کس طرح منگوائے گئے اور وہ واقعی نادر نمونے تھے ایک تو بالکل سیاہ گلاب تھا۔ جس کی پتیوں میں نہایت خفیف سی سرخی جھلکتی تھی۔

یہ اسلامی عہد کا ہسپانوی گلاب ہے جس کے قلم ہسپانیہ کے امیر عبدالرحمٰن دوم نے دمشق سے منگوائے اور اپنے جنت نظیر باغوں میں گلاب کی اس قسم کو فروغ دیا۔

پھر اپنے ہمعصر شاہ فرانس کو انار اور گلاب کے پودے تحفۃً بھیجے ورنہ اس سے پیشتر اہل یورپ اس پھل اور پھول سے روشناس نہ تھے اب بھی فرانس میں دونوں چیزیں اسپین سے ہی منسوب کی جاتی ہیں۔ انار کو وہ لوگ عرف عام میں "غرناطہ کا سیب" کہتے ہیں اور سیاہ گلاب کو "ہسپانوی گلاب" کے نام سے موسم کیا جاتا ہے۔"

ذاکر بیان کر رہا تھا اور سعید پوری دلچسپی سے سُن رہا تھا۔

"خوب! آپ نے تو اپنے پھولوں کے تاریخی پس منظر بھی یاد کر رکھے ہیں"

وہ خندہ روئی سے ہنس کر کہنے لگا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ انسان گو کیسا ہی کم رو ہو وہ فطرت کے حسن کاملہ کی پرستش کرنے کا دل ضرور رکھتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ خود بدصورت ہی چیزوں کو پسند کرے اور یہ تو سعید کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ذاکر گو ظاہری اور باطنی حسن سے یکسر بے بہرہ تھا لیکن انتہا کا حسن پرست تھا

اتنے ہی میں ملازم نے اطلاع دی۔ کہ گاڑی ڈرائیور پر منتظر ہے۔

"آؤ! آج میں تمہیں کارخانے دکھا کر لاؤں۔ جنہیں میرے باپ نے اپنی عمر بھر کی کاوشیں صرف کر کے میرے لئے تعمیر کیا۔ بہت اچھے تھے میرے ابو!"

اور وہ سعید کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے بڑی ہی دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ جیپ کی طرف چلا ۔ سعید ان نوازشوں پر حیران تھا جب کہ یہ شخص بخوبی سمجھتا ہے کہ میرا اس سے کوئی خونی رشتہ نہیں تو کیوں یہ شخص اس قدر التفات جتاتا ہے" وہ دل میں سوچتا ہوا اُس کے پہلو کی سیٹ پر بیٹھ گیا ۔

(۵)

رات سعید بستر پر لیٹا تو پھر گذشتہ شب کی طرح اُس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ بظاہر وہی سیلی اور بوجھل جیسی بو اُسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بستر اور تکیے کی چپچپاہٹ اور بوسانده اُس کے دماغ کو پریشان کر رہی تھی۔ خبر نہیں کتنی مدت سے اُس بستر کو تبدیل نہ کیا گیا تھا نہ ہی کبھی اسے سوئیاں جیسی چبھنے کا احساس ہوا۔ متاثر جگہ پر خارش اور جلن محسوس ہو کر نشان اُبھر آتے اس نے اُٹھ کر مسہری کا پردہ ہٹایا بتی جلائی تو بستر کی سفید چادر پر بیسیوں موٹے موٹے کھٹمل روشنی سے بچنے کے لیے ادھر اُدھر دوڑ کر پناہ کی جگہ ڈھونڈنے لگے۔ ان مکروہ اور خون آشام کیڑوں کو دیکھ کر سعید نے ساختہ جھرجھری لی۔

"خدا کی پناہ! مہمانوں کا خون چوسنے کے لیے یہ اچھے خون آشام پال رکھے ہیں گھر والوں نے —!"

وہ زیر لب بڑبڑایا، روشنی بجھائی اور کشن سرہانے رکھ کر صوفے پر پڑ رہا اور گھر والے خود بھی اپنی فطرت میں ان مکروہ جانوروں سے کم نہیں بلکہ ان سے بھی بدتر — کہ اپنی تن پروری کے لیے اپنے ہی ہم جنسوں کا خون چوستے ہیں۔" کوئی آواز اُس کے بے چین اور بے خواب دماغ کی خلاؤں میں بار بار گونجتی، اس

نے ارادہ کیا کہ وہ کل ہی واپس چلا جائے گا۔ وہ اپنے بے آرام سر کو بار بار ادھر اُدھر پٹخ رہا تھا۔ کشن اور صوفے سے بھی وہی ناگوار مرطوب بُو پھوٹ رہی تھی اور اُسے کسی پہلو چین نہیں آ رہا تھا۔ اتنے ہی میں اُسے صوفے کی پشت پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا سفید سا ہیولیٰ نیم وا دروازہ سے باہر جا رہا تھا۔ حالانکہ اُس نے دروازے کے پٹ خود بند کئے تھے۔ اُسے اپنے گرد و پیش اسرار کے خوفناک سایوں کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی، جیسے وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں اپنی غیر مرئی نقل و حرکت سے اپنا نرغہ اس پر تنگ کرنے کو سمٹ رہے ہیں۔ قریب اور قریب آ رہے ہیں۔ خبر نہیں کس وقت وہ ایک جھٹکے سے اپنے جال کے پھندوں کو کس کر اُسے پھانس لیں اور وہ بے دست و پا ہو کر رہ جائے۔ اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ زبان پر کانٹے سے اُبھر آئے وہ بزدل نہ تھا مگر اس کی دلیری ایسے موقع پر کیا کرتی۔ دشمن للکار کر سامنے آئے تو کوئی اس کا مقابلہ بھی کرے۔ لیکن خطرہ، سکون کی آڑ لئے ہو حریف دوستی کا دعوےٰ کرے، زہر شیرینی کی حلاوت میں چھپا دیا جائے تو کوئی کیا کرے سعید کے لئے بھی اب اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ نہایت دوستانہ انداز سے رخصت طلب کرے اور جان سلامت لے کر چلا گیا۔ اُس نے رات جاگ کر گزارنے کا ارادہ کر لیا اور صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لحہ اس کی نگاہ دروازہ کی طرف اُٹھی کوئی پھر اندر آ رہا تھا وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا لحظہ بھر میں اُس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

"کون — ؟ بلیشو ؟ تم اس وقت یہاں کیا رہی ہو ؟" اس نے دبی آواز مگر غصّہ اور حیرت کے لہجہ میں پوچھا۔

"صاحب! میں — اے میں — پانی!"

اس نے جلدی سے پانی کا جگ اُس کے آگے بڑھا دیا اور گو مگو کے عالم میں کھڑی ہوئی اپنی حیران سی آنکھوں میں التجا بھرے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مگر — یہ اس وقت پانی لے کر آنے کی تمہیں کیا سوجھی ؟ پانی تو یہاں

موجود تھا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے پلٹ کر میز کی طرف دیکھا جہاں پانی کا جگ اُس نے لائٹ بجھانے سے پہلے خود دیکھا تھا۔ مگر وہاں جگ موجود تھا۔

" تھوڑی دیر پہلے بھی تم ہی کمرے میں آئی تھیں؟" سعید نے پوچھا۔

" جی — !" وہ بولی۔

" کیوں؟" سعید نے تحکمانہ لہجہ میں پوچھا۔ مگر وہ چپ رہی۔

" کیا پانی کا جگ اٹھا کر لے گئی تھیں؟"

اس نے نیچی نگاہیں کر کے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پانی کے جگ کو سینے سے لگائے قصوروار سے انداز میں کھڑی تھی۔

" کیوں؟" سعید نے پھر مواخذہ کیا مگر وہ چپ رہی۔ اور آگے بڑھ کر جگ میز پر رکھ دیا۔

" کچھ سمجھاؤ تو سہی؟ آخر میں تمہاری اس حرکت کا کیا مطلب سمجھوں؟" سعید نے حیرت سے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

" بس یہی کہ آپ کی بہتری اسی میں تھی — مالکن سے کچھ نہ کہئے گا!" اس نے جیسے اپنی پوری جرأت کو بحال کرتے ہوئے جواب دیا اور فوراً کمرے سے نکل کر چلی گئی۔

" اس کا مطلب؟"

وہ خود بڑبڑایا — اور ٹہلتا ہوا بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔

عجیب عجیب سوال اس کے ذہن کو پریشان کرنے لگے۔ کیا اُس پانی میں کوئی زہریلی چیز تھی؟ جسے یہ لڑکی تبدیل کر کے لائی؟ مگر اپنے آقاؤں کے برعکس اس لڑکی کو مجھ سے کیا ہمدردی ہے؟ کہیں یہ لوگ حقیقت کو پا تو نہیں گئے کہ میں مظفر رضا کا لڑکا ہوں جسے اغوا کر لیا گیا تھا۔؟ اور اب وہ اس فکر میں ہیں کہ اپنے اس طلسم کو برقرار رکھنے کے لئے مجھے یہاں سے زندہ نہ نکلنے دیں —؟"

اور یہ ایسے ہی کئی سوالات اپنے ذہن میں لئے ہوئے وہ بالکنی میں کھڑا گردوپیش کے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ خوابیدہ جیسے ماحول پر دھیلی چاندنی سحر

کی مانند محیط تھی۔

خاموش سکون چھایا ہوا تھا۔ ہوا ساکت تھی۔ درختوں کی گھنی شاخیں بازو دُر میں بازو الجھائے سو رہی تھیں گھنیرے سایوں سے مرطوب سی دھند اُٹھ اُٹھ کر غبار کی طرح معلق تھی۔ جس سے فضا مکدر سی ہو رہی تھی۔

سعید اپنے خیالوں میں کھویا ہوا نیم باز آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا اور عجیب بات تھی کہ اب جب کہ اس نے رات بھر نہ سونے کا تہیہ کیا تو اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ شاید وہ اس کیفیت کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اندر آ کر سو جاتا مگر اچانک اُسے بالکنی کے عین نیچے کسی کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے جھک کر دیکھا تو حیران ہوا کہ ماں جی اور ذاکر کھڑے تھے۔

ذاکر تو کھانا کھاتے ہی اس عذر پر اُٹھ گیا تھا کہ اُسے بے حد نیند آ رہی ہے اور رات کے ڈیڑھ بجے یہاں کھڑا تھا۔ وہ سرگوشیوں میں خبر نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ ماں جی نے کچھ کہا تو ذاکر نے آہستہ سے جواب دیا مگر چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ اسے سنائی دئیے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی ہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد اُس نے پھر۔ ۔ ۔ بھاری اگر کچھ۔ ۔ ۔ تو ضرور وہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"توبہ کرو! کہیں۔ ۔ ۔ ۔ تم نا جو کہتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے زیادہ زہریلا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پل بھر میں۔ ۔ ۔ ۔"

ذاکر آہستہ آہستہ کچھ کہتا رہا۔ ماں جی تسلیاں دینے کے لہجہ میں کچھ کہتی رہی، کسی وقت دفورِ جوش میں وہ سرگوشی بھول کر ذرا آواز میں بول اُٹھتی۔

"دھیان کہاں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ میرے ہوتے۔ ۔ ۔ ۔ جو دم مار جائے!"

وہ بڑی خود اعتمادی سے کہہ رہی تھی۔

"یہ سارا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیری خاطر میرے لال! اب وقت آیا تو کیا ایسا ہونے دوں گی کہ کوئی دوسرا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مارے جوش کے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی جا رہی تھی کہ ذاکر نے اس کے بازو پر

ہاتھ رکھتے ہوئے محتاط رہنے کا اشارہ کیا۔

"بھلا جاکر دیکھو تو۔۔۔۔"

اور ذاکر اُسے وہیں چھوڑ کر برآمدہ کی طرف پلٹا۔ سعید سمجھ گیا کہ وہ اب اُسے دیکھنے کے لئے آرہا ہے اس نے جیب سے اپنا ریوالور نکال لیا اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے اندر سے مقفل کر لیا۔ تاکہ وہ اسے جاگتا پاکر شبہ نہ کرے کہ ان کی ریشہ دوانیوں سے باخبر ہے اتنے ہی میں دروازہ دھکیلنے کی خفیف سی آہٹ ہوئی اور کچھ دیر بعد باسر کی تنگ غلام گردش میں واپس جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی اب تو سونے کے متعلق سوچنا واقعی اس مقولہ کی عملی تصدیق کرنا تھا کہ "نیند سولی پر بھی آجاتی ہے"

وہ واقعی موت کے منہ میں کھڑا تھا۔ دروازہ بند کر کے بھی محفوظ نہیں تھا اگر کوئی چاہے تو بالکونی کے راستے بڑی آسانی سے داخل ہو سکتا۔ ساتھ والی خوابگاہوں کی بالکنیاں مسلسل ایک دوسرے سے متصل تھیں۔ چنانچہ وہ رات سعید نے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے اور بالکنی میں کھڑے کھڑے گزار دی اس رات اس نے ایسی عقوبت اٹھائی کہ روایتی عذاب قبر بھی اس سے بڑھ کر اذیت ناک نہ ہوگا وہ رات اُسے کبھی نہ بھول سکی اسے وہ اپنی زندگی کے ناقابل فراموش لمحات میں شمار کیا کرتا اور مدتوں اُس کا خوفزدہ ذہن عالم خواب میں اُن لمحات کو دوہراتا تو وہ چونک کر جاگ اٹھتا تھا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی، پو پھٹتے ہی اس نے اپنا مختصر سا سامان بکس میں رکھا اور نماز سے فارغ ہو کر اپنا سفری لباس پہن لیا وہ بالکنی میں کھڑا اپنے میزبان کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ چائے لے کر اتنے ہی میں بلقیس دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ جا رہے ہیں؟" اس نے ایک گونہ مسرت سے پوچھا۔

"ہاں!"

اس نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ وہ بستر درست کرنے لگی۔

" رات آپ بستر پر نہیں سوئے — ؟" اس نے پوچھا۔
" نہیں — بستر پر اگر سو سکتا تو شاید تمہارے یہ پالتو کھٹمل صبح تک میرا سارا خون پی ڈالتے!"
سعید نے ہنس کر جواب دیا۔ کمبل تہ کرتے کرتے روک کر اس نے بازو منہ پر رکھ لیا جیسے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔
" اس جگہ کھٹمل ہوتے ہی بہت ہیں " کھلی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔
" ہوں — ! اور کیا سانپ بھی بہت ہوتے ہیں؟"
سعید نے طنز کے لہجہ میں کہا اور لپک کر اپنے بھاری بوٹ کی ایڑی سانپ کے سر پر رکھ دی جو کمبل جھاڑتے ہوئے فرش پر آن گرا تھا۔
" سانپ —؟"
لڑکی نے ایک طرف سمٹتے ہوئے سہم کر پہلے سعید کی طرف دیکھا اور پھر سانپ کی طرف — یہ گہرے سبز رنگ کا دو بالشت لمبا اور پتلا جیسا سانپ تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ رنگ کے نقش بیحد خوبصورت لگتے تھے۔
جس وقت کمبل کی کسی سلوٹ سے چھٹ کر وہ فرش پر پہنچا تو لحظہ بھر اُلٹا پڑا رہا پھر تڑپ کر سیدھا ہوا اور سیماب کی طرح لہرا کر پناہ گاہ کی تلاش میں لپکا ہی تھا کہ سعید نے اس کا سر اپنی ایڑی تلے دبا لیا۔ اب وہ فرش پر بے جان پڑا تھا۔ بشو نے چیخ روکنے کے لئے اپنی مٹھی منہ میں ٹھونس رکھی تھی اور پھٹی پھٹی دہشت زدہ نظروں سے سعید کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔
" دیکھتی کیا ہے؟ یہ سانپ بھی کھٹملوں کی طرح بستروں میں ہوتے ہیں اس جگہ؟" سعید نے پوچھا۔
" نہیں تو — !" اس نے سہمی ہوئی سی آواز میں کہا۔
" تو پھر یہ بستر میں کہاں سے آیا؟" سعید نے مسکرا کر پوچھا۔

"بستر میں تھا یہ؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں — تم نے کمبل جھاڑا تو اس میں سے یہ سانپ جھڑ پڑا یہ کچھ قدرت نے خود ہی بچاؤ کی صورت پیدا کر دی کہ میں کھٹملوں کے ڈر سے بستر میں نہ سویا ورنہ اس موذی نے مجھے مار ڈالا ہوتا۔"

اور اتنے ہی میں ذاکر جھومتا جھامتا داخل ہوا۔ وہ کھلے گریبان اور نیم آستین کی قمیض پہنے تھا۔ الٰہی توبہ! وہ انسان تھا یا ریچھ؟ سارے جسم اور بازوؤں پر تین تین انچ بھر گھنے سیاہ بال تھے — جنہیں دیکھ کر بے اختیار اکراہ پیدا ہوتا تھا۔

"کیا بات ہے سعید بھیا! اتنی سویرے کہاں کی تیاری ہے؟"

ابھی سعید کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ اس کی نظر بیتو پر پڑ گئی جو اس کے آتے ہی پھر بستر ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔

"اری اے چھوکری! تجھے کب سے ماں جی پکار رہی ہیں۔ کہاں تھی تو۔؟"

وہ سعید کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی خادمہ سے مخاطب ہو گیا۔

"بیچاری بستر درست کرنے لگی تھی کہ سانپ دیکھ کر ڈر گئی۔"

سعید نے ہنس کر کہا اور پھر مختصراً ساری روداد ذاکر کو سنا دی ذاکر نے بغیر تعجب کا اظہار کئے سارا واقعہ سنا جیسے معمولی بات ہو۔

"یہ جنگلی لڑکی ڈر گئی اتنا سا سانپ دیکھ کر؟ خیر آپ ڈرتے تو الگ بات تھی۔ یہ ملازم تو ایسے کئی سانپ روز کوڑے کرکٹ میں سمیٹ کر پھینک چھوڑتے ہیں! ہاں تو میں پوچھ رہا تھا کہ آپ صبح ہی صبح کمر بستہ نظر آ رہے ہیں کہاں کا ارادہ ہے؟"

اس نے ٹھوکر مار کر مرے ہوئے سانپ کو کونے میں پھینک دیا اور الٹے ہاتھ کی پشت سے حسب عادت ناک کو زور زور سے رگڑتے ہوئے سعید کی طرف بغور دیکھا۔

"میں واپس جاؤں گا بھیا!" سعید نے مختصر جواب دیا۔

"ارے! وہ کیوں؟" ذاکر ایک دم چونک اٹھا۔

میں نے بتایا تو تھا کہ یونٹ میں جانے کو تھا کہ ابو نے مجھے بلوا کر یہاں بھیجا۔ اب مجھے اپنی ملازمت پر حاضر ہونا چاہیئے۔"

سعید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر معذرت کے لہجہ میں کہا۔

نہیں نہیں! میں تمہیں ہرگز جانے نہ دوں گا۔ دو ہفتہ کی چھٹی لے کر آئے ہو ابھی تو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے نہ سیر کی نہ شکار کو گئے۔ چچا کہیں گے میرے بیٹے کی مہمان داری بھی نہ کی جا سکی ــــ نا بھائی ابھی تو نام بھی نہ لینا جانے کا ــــ!"

وہ سعید کا ہاتھ پکڑ کر لے چلا۔ سعید متواتر معذرت کرتا جا رہا تھا۔ اسی طرح وہ ڈائننگ ہال میں پہنچے۔

"یہ دیکھو ماں جی! اس سعید نے مجھے پریشان کر چھوڑا ہے۔"

وہ ماں سے شکایت کرنے لگا۔

"کیا ہوا ــــ؟" ماں جی، آنکھوں کو سکیڑ کر گھورتے ہوئے مسکرائیں۔

یہ سعید ابھی واپس جانے کو کہہ رہا ہے، اسے روکو نا ــــ!"

وہ بچوں کی طرح ہونٹ سکیڑ کر بولا تو سعید اس کی ہیئت کذائی پر ہنسی نہ روک سکا۔

"بیٹے ابھی تو آئے ہو، بھائی کا جی نہیں بھرا۔ کچھ دن رہ جاؤ سیر و شکار پر جاؤ۔ اس نے تو تمہاری خاطر دوستوں کو لکھ کر بلا دا بھیجا ہے شکار کے لئے۔"

سعید کو ان دونوں نے اتنا مجبور کیا کہ اب اُسے انکار کرتے شرم آنے لگی بلکہ اپنے خدشات تک ان کے اس التفات کے پیش نظر بے معنی معلوم ہونے لگے۔ سانپ کا واقعہ محض اتفاق نظر آنے لگا۔ وہ چند دن اور رہ جانے پر رضامند ہو گیا۔

ناشتہ پر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سیر و تفریح کے دلچسپ پروگرام بنتے رہے۔ میزبان پہلے سے بھی زیادہ مدارت پر مائل تھے۔

"اب کے آؤ تو جعفر کو بھی ساتھ لیتے آنا ــــ میں تو کہتی ہوں انہیں کہو اب

وطن ہی لوٹ آئیں ۔ ساری عمر پردیس میں گذری ۔ اب گھر آجائیں ۔ ذاکر بھی تو ان کا بیٹا ہے چچا کو باپ کی جگہ سمجھ کر خدمت کرے گا ۔"

ماں جی نے حسبِ عادت بالکل نیا موضوع شروع کیا ۔

" ہاں — کیوں نہیں ؟ کیوں نہیں ؟"

ذاکر نے تلے ہوئے پسندے کا بڑا سا مچا دانتوں سے نوچ کر کہا ۔

" ضرور کوشش کروں گا ۔ لیکن وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں سفر سے گریز کرتے ہیں ۔" سعید نے جواب دیا ۔

میں خود لے آؤں گا جاکر — میرا تو جی چاہتا ہے تمہارے ساتھ چلوں اور ان سے ملوں ۔ میرے ابو کی شکل کے ہوں گے چچا جعفر ! ذاکر نے اشتیاق سے کہا ۔

" تو چلو میرے ساتھ — !" سعید نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا ۔

کیوں ماں جی ! چلا جاؤں سعید کے ہمراہ اور چچا کو ساتھ لے آؤں ۔" وہ پوچھنے لگا ۔

" شوق سے جاؤ بھیا ! بھلا اس بات سے میں تمہیں روک سکتی ہوں ؟ کاروبار کے لئے اتنے دور دراز کے سفر کرتے ہو ۔ بلکہ یہ تو فرض ہے تمہارا ۔"

ماں جی بڑی عقیدت مندی سے بولیں ۔

" تو اچھا طے رہا کہ میں چلوں گا تمہارے ساتھ !"

وہ فیصلہ کن انداز میں بولا ۔ سعید کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ ماں جی بول اٹھیں ۔

" میں نے کہا — ؟ کئی دنوں سے اپنی جوہر کا کوئی خط نہیں آیا ؟"

ہاں بہت دن ہوئے لکھا تھا ۔ کہ نیویارک سے کراچی آرہی ہے ، پھر پتہ چلا کہ آئی یا نہیں — اصل میں —"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا ۔ ماں جی منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی ۔

" کیا سوچنے لگے — ؟" آخر وہ پوچھنے لگی ۔

میں سوچتا ہوں کہ ہم نے غلطی کی اُسے اس قدر آزادی دے کر —

وہ پہلے ہی فخر سے دور بھاگتی تھی اب تو اس نے دنیا دیکھ لی ہے ۔ ذاکر سچ مچ رنجیدہ اور فکر مند ہو گیا ۔

" واہ ! دنیا دیکھ لی تو کیا ہوا ۔ وہ میرے کہنے سے باہر نہیں ہو سکتی ۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کبھی میری نافرمانی نہیں کرتی ۔" ماں جی خود اعتمادی سے بولیں ۔

" ہاں معلوم تو ہے مگر یہ معاملہ کچھ — خیر میرا نام بھی ذاکر ہے جو بات دل میں ٹھان لوں تو کر کے چھوڑتا ہوں ۔ اور فخر میرا محسن ہے ۔ اس نے میری جان بچائی ہے ۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں ۔"

وہ مایوسی سے یک دم یقین کا پہلو اختیار کر کے جوش سے بولنے لگا ۔

" تم لوگوں کا اب کیا پروگرام ہے ؟"

ماں جی نے حسب عادت یکدم پہلے موضوع کو چھوڑ کر نیا موضوع پکڑا ۔

" آج تو ہم شکار کو جائیں گے ۔ میں نیل کنٹھ کو بھیج کر شہر سے سب کو بلوائے لیتا ہوں ۔"

اتنے میں ملازم چھوکرا للو اندر آیا اور وہ دروازہ میں کھڑا ہو کر ہاتھوں کو مسلتے ہوئے مالکوں کی توجہ کا انتظار کرنے لگا ۔ ماں جی کی نظر پڑی تو یک دم تیوری چڑھا کر غصہ سے گھورتے ہوئے پوچھا ۔

" کیا ہے رے ؟ تو یہاں کیوں — ؟"

کھاتے پیتے ہر کس و ناکس کی نگاہ پڑے اس کا انہیں بڑا وہم تھا !

میز پر بیٹھو کے سوا کسی کو آنے کا حکم نہ تھا ۔

" ماں زی ! ذیل صاحب آئے ہیں — ذیل صاحب (جلیل صاحب)

اس نے جلدی سے اپنی حاضری کی وجہ پیش کی اور فوراً کمرے سے نکل گیا ۔

" لو اچھا ہوا جلیل خود ہی چلا آیا ۔" ذاکر خوش ہو کر بولا ۔

اور اتنے ہی میں وہ کمرے میں داخل ہوا ۔

" سلام ماں جی !" اس نے خاتونِ خانہ کو تعظیم دی ۔

"سلام بیٹا! بہت دنوں بعد ادھر آنا ہوا؟" ماں جی نے مارے شفقت کے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

"جی بس کام سے آئیں تو طبیعت آرام پر مائل ہوتی ہے۔ آج چھٹی تھی میں نے کہا آپ کو سلام کر آؤں۔" وہ مودبانہ انداز سے بولا۔

بہت اچھا کیا — آؤ چائے پیو!" ماں جی بولیں۔

"بس ناشتہ کر کے ہی چلا آرہا ہوں۔" وہ کہنے لگا۔

"ارے بھئی تم نے کب سے تکلف سیکھا —؟ ادھر بیٹھ جاؤ! یہ حلوہ چکھو تھوڑا سا —!"

ذاکر نے میٹھے کا ڈش اس کے سامنے سرکاتے ہوئے کہا اور جلیل نے تکلف بر طرف، حلوے پر بے تکلفانہ ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔

ذاکر نے شکار کا پروگرام پیش کیا تو وہ بے حد خوش ہوا۔ ناشتہ ختم ہوا تو سب لوگ باہر لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ ماں جی پان بنا کر لے آئیں۔ نیل کنٹھ کو جیپ دے کر چند منتخب دوستوں کو لینے بھیج دیا گیا۔ خود ذاکر جلیل، سعید اور چار پانچ ملازموں کو لے کر شکار کے لئے جنگل کی طرف روانہ ہوا ماں جی بنگلے کے گیٹ تک تاکید کرتی ہوئی ساتھ ساتھ آئیں کہ سعید کے لئے یہ اجنبی جگہ ہے اُسے اکیلا نہ چھوڑا جائے —!

(۶)

شام گہری ہو چلی تھی۔ شکاری پارٹی واپس آئی تو ماں جی گیٹ کے پاس ہی موجود تھیں۔ وہ گھنٹوں سے کچھ منتظر سی، مضطرب سی ڈرائیو پر چکر لگا رہی تھیں ۔ وہ گھنٹوں سے جیسے القاء ہوا تھا ۔ کہ آج کوئی نہ کوئی غیر معمولی سانحہ پیش آئے گا۔ اور وہی ہوا۔ گہرے جھٹپٹے میں انہوں نے دیکھا کہ تین چار آدمی کسی کو سہارا دئے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے بے اختیار ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا اور گیٹ سے باہر نکل آئیں۔

" ارے کیا ہوا ؟" وہ پکاریں ۔

گھبراؤ نہیں ماں جی! خیر گزری ۔ آپ کی دعاؤں سے سعید کی جان بچ گئی"۔ ذاکر نے جواب دیا ۔

" شکر ہے! مگر ہوا کیا آخر ؟" وہ گھبرا کر پوچھنے لگیں ۔

" سارا دن ہنسی خوشی گزرا ۔ بس آتے آتے یہ خواہ مخواہ کی پریشانی پیش آ گئی !"

جلیل منیجر کہنے لگا ۔ اب ساری بھیڑ اندر برآمدہ کی طرف بڑھ رہی تھی دو آدمی سعید کو سہارا دیئے ہوئے تھے

دیکھو لوگو! میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیتا!" ماں جی نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

جنگل میں کوئی اور پارٹی بھی شکار کے لئے آئی تھی۔ انجانے میں کسی نے فائر کیا۔ سعید کے شانے پر زخم آگیا۔ زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ فوجی آدمی ہے — !" ذاکر نے اُس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

" بھی بڑا حوصلہ مند جوانمرد ہے! زخمی حالت میں میلوں چل کر آیا ہے" ذاکر کے دوست نے کہا۔

" سعید؟ سعید بیٹا؟ ہوش میں تو ہونا؟" وہ سعید کے منہ کو گھورتے ہوئے بولیں۔

" جی خوب ہوش میں ہوں —!" سعید نے کمزور آواز میں کہا۔

" ماں جی کی بھی عجب باتیں ہیں! لو دیکھنا بھلا وہ بیہوشی میں اتنی دور سے چل کر آرہا ہے؟" جلیل ہنسنے لگا۔

لو خوشی کے موقعہ پر پریشانی پیش آگئی اور میں تمہیں خوشخبری سنانے کو کھڑی تھی۔" ماں جی نے کہا۔

" ہاں ہاں کیا؟" ذاکر نے ماں کا شانہ ہلا کر پوچھا۔

" جوہر آئی ہے۔ تم گئے ہی ہو تو وہ پہنچی!"

" اچھا — کچھ دن رہے گی؟" ذاکر نے پوچھا۔

" دس دن کی چھٹی پر آئی ہے" ماں جی نے جواب دیا۔

" ہوں —" ذاکر نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

باتیں کرتے ہی کرتے وہ لوگ اندر پہنچے، جلیل بڑے اہتمام سے آگے بڑھا اور ایک کشادہ دیوان پر تین چار کشن سہارے کے واسطے رکھتے ہوئے کہنے لگا —

یہاں لٹا دو اور لیمپ لے آؤ میں زخم دیکھوں"

رلدو نے لیمپ اٹھا کر قریب ایک تپائی پر لا رکھا۔ سعید کا سارا لباس خون تربتر تھا۔ رنگت زرد تھی تکان اور نڈھالی کے مارے آنکھیں بند

ہوئی جاتی تھیں لیکن وہ اپنی قوت ارادی کے بل پر ہوش سنبھالے ہوئے تھا کیونکہ اسے اپنے خطرہ کا بخوبی احساس تھا اور ڈر تھا مبادا وہ بے ہوش ہو کر پھر کبھی ہوش میں نہ آ سکے۔

خون تو بہت ضائع ہو گیا۔ لڑکا بے ہوش ہوا چاہتا ہے۔ ٹھہرو میں اس کے لئے دودھ لے آؤں۔"

ماں جی تیزی سے چلتی ہوئی خود دودھ لینے گئیں اور چند منٹ کے بعد گرم دودھ کا پیالہ لئے ہوئے واپس آئیں۔ اسی لمحے دوسرے دروازے سے بیشو داخل ہوئی۔ اس کی حیران حیسی آنکھیں دہشت کے مارے اور بھی فراخ نظر آ رہی تھیں۔

لو اٹھاؤ اسے یہ سارا دودھ پلا دو کچھ تو قوت آئے!" وہ ہمدردی سے کہنے لگیں۔

جلیل نے سعید کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ذاکر تو جوہر کی آمد کی خبر پا کر اُسے ملنے چلا گیا تھا۔ کچھ لوگ برآمدہ میں نکل گئے تھے کچھ دور ہٹ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

سعید کے مجروح شانے سے غپا غپ خون نکل رہا تھا۔ بیشو تلملا کر کبھی ادھر ہوتی کبھی اُدھر آخر ماں جی کے پہلو میں آ کر کھڑی ہوئی اور پھٹی پھٹی سی نگاہیں دودھ کے پیالے پر گاڑ دیں۔

"سعید! سعید بیٹے! لو یہ ذرا سا دودھ پی لو۔"

وہ کہنے لگیں اور بیشو دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ کہ سعید پینے سے انکار کر دے۔

"ہاں بھیا! اٹھو یہ دودھ پی لو۔" جلیل نے بھی اُس کا زخمی شانہ جھنجھوڑا درد کی شدت سے بیتاب ہو کر اُس نے آنکھیں کھول دیں ماں جی نے پیالہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔! بیشو نے غیر اضطراری طور پر ہاتھ آگے بڑھایا جیسے پیالہ پکڑ لینا چاہتی ہو۔ لیکن اسی لمحے سعید نے دوسرے ہاتھ سے خود پیالے کو آہستہ سے اپنے ہونٹوں سے پرے دھکیل دیا۔

زخم سے خون جاری ہے — کوئی — کوئی چیز پینے سے زیادہ خون زائل ہوگا - اس نے رکتے رکتے کہا اور سر گرا دیا -

کوئی میرا بیگ اٹھا لائے — زخم پر — اور وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر نقاہت سے چپ ہو گیا -

" دودھ پی لیتے تو اچھا تھا - کچھ قوت بحال ہوتی -"

لیکن سعید نے آنکھ نہ کھولی —

" نہیں پیتا تو رہنے دیجئے -" جلیل کہنے لگا -

ماں جی نے بھویں چڑھا کر ماتھے پر شکن ڈالے اور پیالہ قریب کی میز پر رکھ دیا - بیشو سعید کی بات سنتے ہی دوڑی ہوئی اوپر گئی اور چشم زدن میں سے اس کا بیگ لے آئی - ماں جی نے قہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورا -

" اے چھوکری ! تو کیا منکتی پھر رہی ہے - جا ! جا کر مسی کا کوئی کام دیکھ !

اور بیچاری بیشو بیگ سعید کے قریب رکھتے ہوئے بھیگی بلی کی طرح باہر نکل گئی - لیکن اُسے سعید کے خطرہ کا بخوبی احساس تھا وہ مسی کے کمرے میں پہنچی تو ذاکر عجب بے فکری سے ٹانگیں پھیلائے ہوئے آرام کرسی پر نیم دراز تھا سگریٹ کا دھواں پھونک پھونک کر قہقہہ اڑاتا ہوا - نہایت خوش مذاقی سے باتیں کر رہا تھا - سامنے صوفہ پر ایک خوش شکل لڑکی ساڑھی اور نیم آستین کی سفید جیکٹ پہنے ہوئے سنجیدگی سے اس کی باتیں سن رہی تھی -

" صاحب ! چل کر ان صاحب کی پٹی کر دیجئے - انھوں نے بیگ اوپر سے منگوایا ہے شاید اس میں کوئی سامان مرہم پٹی کا ہوگا -" بیشو نے کہا -

" کس کی پٹی ؟ کیا ہوا ؟"

لڑکی جیسے تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی -

" اوہ ! لو دیکھو تمہاری آمد کی خوشی میں، میں تو بھول ہی گیا - ! ہم لوگ شکار کھیلنے گئے تھے ایک ساتھی جو مہمان آیا ہوا تھا زخمی ہو گیا — میں اُسے کمرے میں لٹا کر تمہیں ملنے چلا آیا اور اُسے مطلق بھول ہی گیا -"

ذاکر نے یوں قہقہہ لگا کر واقعہ بیان کیا جیسے اس کے نزدیک یہ واقعہ کچھ اہمیت نہ رکھتا ہو۔ لڑکی انتہائی حیرت سے اُس کی طرف دیکھتی رہی اور ملامت و نفرت کا انداز اس کی نگاہوں میں جھلک آیا۔

" آؤ میرے ساتھ ، کہاں ہے وہ زخمی ؟" اس نے بیشو کا بازو پکڑ کر اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کہا۔

" بھاگ کر تمرے سے پٹی کیس اٹھا لاؤ۔"

بیشو کے اشارہ سے لڑکی نے مریض کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے حکم دیا۔ لمپ کی مدھم روشنی میں وہ مجروح مہمان کی صورت دیکھتے ہی چونک سی پڑی یہ چہرہ اُسے چشم آشنا معلوم ہوا۔ لیکن وہ زیادہ غور کئے بغیر اس کے زخم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

" ادھر آؤ بھیا ! ان کی شرٹ ! وغیرہ اتارنے میں میری مدد کرو ۔"

سعید لاکھ کوشش اور جد و جہد کے باوجود پوری طرح بیہوش ہو چکا تھا۔ اس کے خون سے بلاس کے علاوہ سہارے کے لئے رکھے ہوئے کشن اور دیوان تک تر بتر ہو رہے تھے۔

" تم نے بے حد غفلت برتی بھیا ! اس غریب کا بہت خون ضائع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کرنا آپ سب کا فرض تھا ۔ آپ یوں چپ بیٹھے رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی !"

اس نے خشمناک نظروں سے اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوئے لوگوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

" اوہ ! ہماری مسی تو خفا ہونے لگیں ۔ اب بتایئے ہم میں سے ڈاکٹر تو کوئی بھی نہیں آتے ہی نیل کنٹھ کو جیپ دے کر بھیجا ہے کہ ڈاکٹر کو لے آئے۔"

—— جلیل کہہ رہا تھا۔

" خدا نے آپ کو عقل دی ہوتی تو جیپ میں مریض کو لے جاتے ۔" وہ اُسی غصہ بھری آواز میں کہنے لگی۔ سعید کی شرٹ اتاری جا چکی تھی اور وہ ٹارچ کی لائٹ ڈال کر زخم کا معائنہ کر رہی تھی۔

"زخم تو کوئی خاص گہرا نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شریان کٹ گئی جو خون اس قدر تیزی سے نکل رہا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ اس نے میتھیلڈ اسپرٹ سے زخم کے اطراف میں جمے ہوئے خون کو دھویا اور زخم کے اوپر ٹنکچر بنزین کا پھاہا بنا کر چسپاں کر دیا۔ اس کے کے بعد مجروح آدمی کی نبض محسوس کی۔ اسپرٹ لمپ جلا کر انجکشن دینے کا سامان اُبالا اور بڑی ہنرمندی کے ساتھ انجکشن دے دیا۔

"ادھر آؤ لڑکی! ان کے جوتے اتار دو!"

اس نے بلیشو کو حکم دیا "اب آپ ذرا مریض کو درستی سے لٹا دیں جلد از جلد طبی امداد کا انتظام ہونا چاہیے ورنہ مریض کی جان کا خطرہ ہے۔ اس کا خون کثیر مقدار میں ضائع ہو چکا ہے اور یہ سب آپ لوگوں کی غفلت کا نتیجہ ہے!" اس نے جلیل اور ذاکر کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ بے حد متفکر نظر آتی تھی۔

"تو تم بھی حد کرتی ہو —— آخر ہم کر ہی کیا سکتے تھے ——؟" ذاکر نے اپنی شوریلی آواز میں تندی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"یہی جو میں نے کیا۔ اُسی وقت کر دیا جاتا جس وقت یہ وقوع ہوا تو یہ اب تک بالکل ٹھیک ہو گیا ہوتا ——"

وہ کہہ رہی تھی کہ ذاکر نے بات کاٹی۔

"وہاں جنگل میں ہمارے پاس یہ مرہم پٹی کا سامان تھوڑے ہی موجود تھا" ذاکر نے بے پروائی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

سعید کو دیوان پر لٹا دیا گیا تھا۔

"محتاط شکاری ہمیشہ اپنے ساتھ اس قسم کا سامان رکھتے ہیں۔"

وہ پھر سعید کی نبض پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔ نبض بے حد کمزور تھی اور خطرہ کے احساس سے لڑکی جس کا نام جوہر تھا پریشان ہو رہی تھی۔

"کون گیا تھا ڈاکٹر کو لینے؟" اس نے ذاکر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"شاید نیل کنٹھ گیا تھا گاڑی لے کر۔ مگر اب تو سب کام تم نے خود ہی کر

دیا۔ اب ڈاکٹر کیا کرے گا آکر ــ ؟" ذاکر نے بدستور بے توجہی سے کہا ــ جوہر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور سعید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"تم مریض کی حالت نہیں دیکھ رہے ــ ؟"

"کیا ہے ؟ بس اب سونے دو آرام سے !" ذاکر کہنے لگا۔

"یہ بیہوش ہے ! عین ممکن ہے کہ بیہوشی ہی میں خون کی کمی کے باعث اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے !"

لڑکی نے خدشہ ظاہر کیا اور اس کی آواز صریحاً خشمگیں تھی اُسے ان لوگوں کی بے حسی پر غصہ آرہا تھا۔ کیسے غیر ذمہ دار تھے یہ لوگ !

"مجبوری ہے۔ جو کیا جا سکتا تھا کر دیا گیا۔ آگے خدا کی مرضی !"

وہ کہنے لگا اور جوہر نے حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور غور سے سعید کے زرد چہرے کو تکنے لگی۔ وہ ابھی تک یاد نہ کر سکی تھی کہ اس سے پیشتر اُسے کہاں دیکھا ہے۔ معاً "چپ چاپ" کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اور ساتھ ہی ماں جی کی گونج دار آواز سے سب متوجہ ہوئے ان کی پالتو بلی چندن دودھ پی رہی تھی !

"ہا ــ ! تیرا ستیاناس !" انہوں نے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ کہا اور بجلی کی طرح تڑپ کر بلی کو آغوش میں بھر لیا۔ دودھ کا پیالہ پلٹ گیا اور وہ بلی کو بغل میں دبائے تیزی سے باہر نکل گئیں۔

"ماں جی کو کیا ہوا ــ ؟ جوہر چونک پڑی اور حیرت سے جانے نہیں کسے پوچھنے لگی ــ صریحاً ظاہر تھا کہ وہ محض بلی کے دودھ خراب کرنے پر اس قدر ہراساں نہ ہوئی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ ان کی لاڈلی چندن اتنا دودھ دن میں کئی بار پیتی ہے۔

جوہر اُن کے پیچھے چلی تو ذاکر نے پکارا۔

"جانے دو جوہی، کوئی بات نہیں تم یہیں ٹھہرو اور اگر سعید بے ہوش ہے تو اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرو۔"

مگر اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی جوہرا اور اُس کے پیچھے پیچھے بیٹو باہر نکل گئی۔ وہ ماں جی کو ڈھونڈتی ہوئی کمرے میں پھریں جب سارے گھر کا چکر کاٹ کر پھر اُسی ساؤنڈ روم کے باہر پہنچیں جہاں سعید پڑا تھا تو دروازہ پر ماں جی نظر آئیں۔

"کیا ہو گیا تھا ماں جی؟" جوہر نے تحیّر زا نظروں سے دیکھ کر پوچھا تو وہ ہنسنے لگیں۔

"تم کیوں پریشان ہو گئیں چاند! یہ چیذن مجھے بہت ستانے لگ گئی ہے ادھر چیز رکھ کر چوکے اور اس نے منہ ڈالا! میں اس کی بدعادت سے تنگ آ گئی ہوں میں نے بھی مردار کو خوب پیٹا ہے اور جالی میں بند کر کے آئی ہوں!"

جوہر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ اس نے حیرت سے سر ہلایا اور دوسری طرف چلی گئی۔ بیٹو اس کے ساتھ ساتھ تھی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہ سکتی ہو۔

لیکن جوہر نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور ذاکر کے دفتر کے کمرہ کی طرف گئی جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ اُس نے ایئرپورٹ پہ ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر کو فوراً آنے کی ہدایت کی، مریض کی کیفیت بیان کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید خون دینا پڑے۔ اس لیئے ضروری آپریٹس ساتھ لائے جائیں۔ اس کے بعد وہ پھر مریض کے کمرے میں آئی۔ نبض محسوس کی تو اس کے چہرے سے ہراس ٹپکنے لگا۔ اس کے ناخن نیلے پڑ گئے تھے۔ چہرے کی زردی بھی نیلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی ہونٹ بے رنگ اور سفید تھے۔ جسم سرد تھا۔ اوپر کے ہونٹ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے

جوہر نے ذاکر کی باتوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ ان لوگوں کو مجروح شخص کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ تو گویا اس کی موت کے منتظر ہیں۔ اسی لیئے اس نے کسی سے اپنے خدشہ کا اظہار نہ کیا بلکہ خاموشی سے اس کی جان بری کی تدبیر کرنے لگی ۔ اس نے طاقت کا ایک اور انجکشن دیا اور نبض پہ ہاتھ رکھے مسلسل کئی منٹ بیٹھی رہی ۔ ذاکر کو اس کی کاوش پر بے اختیار جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔

میرا خیال ہے وہ اب آرام سے سو رہا ہے ۔ تم خواہ مخواہ اتنی پریشان ہوئی جاتی ہو۔ یہ سب لوگ بھی مفت میں تکلیف اٹھا رہے ہے۔ انہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ سعید کے پاس کسی ملازم کو بٹھا دیتے ہیں۔ اب چل کر کھانا کھا لو ـــ"

ذاکر نے اپنی نشست سے اُٹھ کر کسلمندی کے ساتھ لمبی انگڑائی لی اور مخمور آواز میں جوہر سے مخاطب ہوا ۔

آپ لوگ کھانا کھائیں جاکر ـــ میں نے شام کو دیر سے چائے پی تھی بھوک نہیں اس وقت !"

اس نے بیزاری اور نفرت کے لہجہ میں کہا۔ ذاکر کو اس کی عادت سے خوب واقفیت تھی کہ اب ایک مرتبہ انکار کر چکی تو بیس مرتبہ کہنے پر بھی رضامند ہو گی علاوہ ازیں وہ مصلحتاً بھی اس مرتبہ اُسے چڑانا نہیں چاہتا تھا۔

" چلئے جی ہم تو کھانا کھائیں ـــ!"

وہ اپنے دوستوں سے مخاطب ہوا۔ ہاں جی سب کے ساتھ اُٹھ آئیں۔

نیل کنٹھ کو راستہ میں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا؟ وہ اب تک ڈاکٹر کو لے کر نہ آسکا ـــ ؟' آخر جوہر نے ذاکر سے پوچھا۔

" اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے ـ"

وہ کمرے سے نکلتے ہوئے کہتا گیا۔ سب چلے گئے تو جوہر نے بنٹو کو اشارہ سے بلا کر قریب بیٹھنے کو کہا۔ وہ قریب ہی ایک چھوٹی سی تپائی پر بیٹھ گئی ۔

کچھ مجھے بھی تو سمجھاؤ آخر یہ قسمت کا مارا یہاں کیسے آن پھنسا ؟ کون ہے ؟ کس غرض سے آیا ہے ؟" اس نے زیر لب یہ سارے سوال بنٹو سے پوچھ ڈالے ـــ

یہ سیٹھ کے چچا کے بیٹے ہیں ـــ سیٹھ کے کوئی چچا کئی سال ہوئے گھر سے بھاگ گئے تھے بھائی سے خفا ہو کر ؟" بنٹو کہہ رہی تھی۔

" ہوں ـــ!"

جوہر نے سر ہلایا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"انہیں کے بیٹے ہیں یہ — !"

بشو نے جیسے قصہ ختم کر دیا۔

"تو ان کے سر پر کیا شامت سوار ہوئی جو انہیں امن نہ بھایا اور بھڑکتے شعلوں میں چھلانگ مارنے چلے آئے ؟"

وہ سعید کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بشو پر پھر وہی گومگو کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس سے کچھ کہے بن نہ آ رہی تھی۔ بات جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ اس کی حیثیت سے بہت بڑی تھی۔

"یہ بیچارے تو صبح سویرے جا رہے تھے سیٹھ ہی نے جانے نہ دیا۔"

وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

میں پوچھ رہی ہوں یہ آئے کس غرض سے تھے ؟"

جوہر نے پھر تلخ ہو کر پوچھا جیسے اُسے سعید پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے یہ حماقت ہی کیوں کی۔

"بڑے سیٹھ کے مرنے کا اخبار میں پڑھ کر ان کے باپ نے بھیجا۔"

بشو نے بتایا۔ اتنے ہی میں دروازہ پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پردہ اٹھا کر گھر کا سب سے بڑا منتظم خادم نیل کنٹھ اندر آیا۔ جوہر نے استفسار سے اُس کی طرف دیکھا۔

"کہو ؟" اس نے تحکم سے پوچھا

"سیٹھ کہاں ہیں ؟" جوہر کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے بذات خود سوال کر دیا۔

میں پوچھ رہی ہوں کہ تم ڈاکٹر کو لینے گئے تھے۔ لے آئے ؟" جوہر نے غصہ کے لہجہ میں پوچھا۔

جی وہ ڈاکٹر تو کوئی نہیں آتا اس وقت" اس نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تمہارے جیسے مزاج شناس ملازم کو ڈاکٹر ہر

گز نہ مل سکے گا۔ !" جوہر نے اُسے غضب ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے تو اپنی طرف سے بڑی کوشش کی۔ مگر کوئی مانا ہی نہیں آنے کے لئے۔" وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔

"خیر جاؤ — کوئی بات نہیں !"

اور وہ سر جھکاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اگر یہ سیٹھ کے چچا کا بیٹا ہے تو اس کے لئے اب یہاں سے بچ نکلنا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔"

وہ جیسے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"مسی خدا کے لئے آپ ان کی مدد کیجیے۔ ان کی جان سچ مچ خطرے میں ہے۔" بسیشو نے منت کرتے ہوئے کہا اور پھر جو واقعات اس کے علم میں تھے سب جوہر کو بتائے۔

"تو کیا اس دودھ میں بھی زہر تھا جو اس زخمی حالت میں انہیں پلایا جانے کو تھا — ؟"

جوہر نے پھٹی پھٹی دہشت زدہ نظروں سے بسیشو کی طرف دیکھ کر پوچھا

"جی ہاں — ماں جی زارا باورچی سے دودھ کا پیالہ لے کر ادھر آنے کی بجائے اپنے کمرے کی طرف گئیں تو میں پچھلے دروازہ کی راہ اُن کے کمرے کے ساتھ والے غسل خانہ میں گئی اور شیشے سے اندر جھانک کر دیکھا انہوں نے الماری میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر کچھ قطرے دودھ میں ٹپکائے اس شیشی کو بڑا سنبھال کر ایک ڈبیہ میں رکھا اور الماری پہ تالا ڈال کر دودھ ان کے پینے کو لے آئیں۔ مگر شکر ہے کہ انہوں نے نہ پیا۔" بسیشو نے سرگوشیوں میں سارا واقعہ بیان کیا۔

"مگر ہو سکتا ہے کہ دودھ میں انہوں نے کوئی طاقت کی دوا ڈالی ہو۔"

جوہر نے جیسے یقین نہ کرنے کا عذر تراشا۔

"جی نہیں مسی! تو کیا پانی میں بھی — ؟ اور پھر وہ سانپ ؟ میں نے خود

ناجو کو کہتے سنا کہ بڑا اہی زہر یلا ہے۔ جب وہ ٹین کی ڈبیہ مالکن کو دے رہا تھا۔ اب دیکھ لینا چند دن ضرور مر جائے گی۔"

لڑکی نے پھر اپنے بیان کو شکستہ فقروں میں دہرایا ادھر جوہر کا ہاتھ بدستور سعید کی نبض پر تھا اور نگاہیں کبھی گھڑی کی طرف جاتیں کبھی اُس کے لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتے ہوئے چہرے کا طواف کرتیں اُس کی ڈوبتی ہوئی نبض کے ساتھ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس اسیر بلا نوجوان کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی۔ اُس کے چشم آشنا چہرے کو شناخت کرنے کی کوشش میں اس نے بارہا اُسے غور سے دیکھا تھا۔ اور اس کے دلکش نقوش کا پروقار مردانہ حسن اسے جاذب توجہ محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے خطرے سے یکسر بے خبر اس بے بسی کے عالم میں بیہوش پڑا تھا اور یہ اُس کی پوری پوری حفاظت کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ گو اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے سلسلہ میں اُسے جن مشکلات کا سامنا کرنا تھا ان سے بھی وہ لاعلم نہ تھی۔ ذاکر اور ماں جی کی فطرت سے بخوبی واقف تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر کچھ مہمان جانے لگے۔ کچھ وہیں رہ گئے۔ ذاکر انہیں لے کر ڈرائینگ روم میں جا بیٹھا اور کافی اور تاش کا شغل ہونے لگا جیسے گھر میں کوئی غیر معمولی وقوعہ ظہور میں نہ آیا ہو۔ رخصت ہونے والے مہمانوں کو چھوڑنے گاڑی جا رہی تھی ماں جی دروازہ پر کھڑی ہوئی نیل کنٹھ سے کہہ رہی تھیں۔

"ایک بار پھر کوشش کر دیکھنا شاید کوئی ڈاکٹر مل جائے۔"

مل تو جائے گا یہاں آنے کے لئے ملنے گا۔"

نیل کنٹھ کہنے لگا۔ لیکن وہ لوگ روانہ ہوئے تھے کہ ڈرائیو پر کار کا ہارن سنائی دیا۔ سب حیران تھے کہ یہ اس وقت کون آگیا۔ لیکن جوہر فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے نکل آئی۔ ماں جی پہلے ہی برآمدہ میں حیران کھڑی تھیں۔ جوہر نے ان کے استفسار کے جواب میں جلدی سے زیر لب کچھ کہا اور آگے بڑھ گئی۔ ماں جی حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ کہ اس کے ہاتھ میں چرمی بیگ تھا۔

"اب کیسی حالت ہے۔ خون بند ہوا؟" آنے والے نے پوچھا۔

"خون بند تو ہو گیا۔ لیکن بے حد کمزوری ہے کیونکہ اس سے پیشتر کہ کوئی تدبیر کی جا سکتی خون کثرت سے ضائع ہو چکا تھا۔"

جوہر بتا رہی تھی اور وہ سب مریض کے کمرے میں داخل ہو گئے، ماں جی بھی پیچھے پیچھے گئیں۔ ڈاکٹر کی آمد پر وہ صریحاً حیران نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کیا۔ مختلف گروپوں کے خون کی چند بوتلیں وہ احتیاطاً ساتھ لیتا آیا تھا۔ سعید کا خون لے کر اس نے ملانا ملانا شروع کیا۔

"آپ نے بڑی دوراندیشی کی کہ مجھے خون دینے کے متعلق بتا دیا ورنہ چند گھنٹے اور ضائع ہو جاتے تو سب کوششیں بعد از وقت ثابت ہوتیں۔"

ڈاکٹر نے جوہر کی طرف تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو بات ماں جی کی سمجھ میں بھی آ گئی اور انہوں نے ذاکر کی طرف پُرمعنی نگاہ ڈال کر اشارہ کیا کیونکہ ذاکر

اشارہ ہی سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیسے آن پہنچا؟ اور ذاکر کی چپٹی ناک کے نتھنے جوش غضب سے پھیل گئے اُسے جوہر پر بے حد غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں ایک اجنبی کے لئے اتنی پریشان ہو رہی ہے۔ مگر اب ڈاکٹر کی موجودگی میں وہ کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔ ڈاکٹر کچھ دیر بڑے انہماک سے مصروف رہا مگر آخر کار مایوسی کے انداز میں نگاہ اٹھا کر جوہر کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"مجھے بے حد افسوس ہے مس جوہر! اس میں سے تو کوئی گروپ بھی مریض کے خون سے نہیں ملتا —!"

جوہر کا دل ڈوب گیا وہ ایک لمحہ تک کچھ نہ کہہ سکی۔

"تو — پھر کیا کیجئے گا؟" آخر وہ کہنے لگی۔

خون دیا جانا لازمی ہے۔ اس کے بغیر مریض کا جان بر ہونا ناممکن ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"مریض کی جان بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کیجئے گا ڈاکٹر صاحب، یہ میرے عزیز مہمان ہیں اور میرے ہاں انہیں حادثہ پیش آ گیا۔ ان کا گروپ مجھے

لکھ کر دیجئے میں خود جا کر شہر سے لے آتا ہوں ۔"

ذاکر نے معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے پہلی بار دلچسپی ظاہر کی۔

" نہیں صاحب ! اتنا وقت نہیں کہ آمد و رفت کا انتظار کیا جائے مریض کی حالت کا تقاضا ہے کہ اُسے فوری طور پر خون ملے ۔" ڈاکٹر نے تشویش ناک لہجہ میں کہا ۔

تو پھر اب کیا کیا جائے ؟" ذاکر نے پوچھا۔

اس کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے کہ آپ صاحبوں میں سے کوئی اُن کی جان بچانے کے لئے قربانی کرے۔ آپ سب نوجوان ماشاء اللہ تندرست و توانا ہیں "

ڈاکٹر نے ذاکر اور اس کے دوستوں کی طرف غائر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ سب گومگو کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ۔

" آپ لوگ مطلق کچھ خدشہ نہ کیجئے ۔ تندرست جسم سے ایک آدھ پاؤنڈ خون نکال لیا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ نارمل جسم میں تو خون کی اتنی مقدار دنوں میں پھر بڑھ جاتی ہے ۔ تھوڑا سا حوصلہ کر کے اس نوجوان کی جان بچایئے ۔ یہ کار ثواب ہے ۔"

انہیں متامل پا کر ڈاکٹر نے موثر پیرایہ میں کہا ۔

ڈاکٹر آپ بسم اللہ کر کے میرا خون ٹسٹ کیجئے کیا خبر قدرت اس غریب الوطن آدمی کی مدد کرے اور میرا خون مل جائے ۔" ان کے تذبذب پر جوہر نے کہا ۔

جزاک اللہ ! ہمت مردانہ تو اصل میں اسے کہتے ہیں ! ــــ ادھر تشریف لے آیئے ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔

اس پر شاید مردوں کی غیرت کو دھکا لگا ۔

" جی نہیں ڈاکٹر صاحب ! مردوں کے موجود ہوتے ہوئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں اپنی بہن کا خون تلف ہونے دوں ــــــ آپ پہلے میرا بلڈ ملا یئے ۔

ذاکر اور اس کے ساتھی رضا کارانہ اسپرٹ پیدا کرتے ہوئے ڈاکٹر کے

روبرو آ کھڑے ہوئے لیکن اتفاقاً گمی کا پلازما سعید کے خون سے مل سکا یہاں تک کہ ناجو اور اُس کے بعد رلدو تک کو خون ٹیسٹ کرنے کے لئے پیش کیا گیا۔

مگر ڈاکٹر نے کہا، کہ یہ چھوکرا تو خود "انیمیا" کا مریض دکھائی دیتا ہے۔ آخر کار اُسے جوہر کی پیش کش قبول کرنا پڑی عجیب اتفاق تھا کہ اس کا خون موزوں ثابت ہوا۔ اور ذاکر اور ماں جی کی مزاحمت اور مخالفت کے باوجود، ڈاکٹر اور خود جوہر نے متفقہ طور پر خون دینے کا فیصلہ کر لیا۔

" جب وہ نیک طینت لڑکی خود یہ قربانی کرنا چاہتی ہے تو آپ لوگ کیوں مزاحمت کرتے ہیں -؟ آپ تسلی رکھیئے انہیں کوئی بھی تکلیف نہ پہنچے گی۔

ڈاکٹر نے دونوں کو تسلی دی، نرمی سے سب کو کمرے سے باہر چلے جانے کے لئے کہا اور پورے انہماک سے اپنا کام شروع کیا۔

پورا ایک پونڈ خون فرشتہ سیرت جوہر کے نازک مگر صحت مند جسم سے سعید کے نحیف اور کمزور جسم میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کا ہاتھ مریض کی نبض پر تھا۔ ساری کارروائی امید افزا تھی۔

کامل دو گھنٹہ بعد ڈاکٹر نے لواحقین کو مبارکباد دی کہ مریض خطرہ سے باہر ہے۔ جوہر کو قوت بحال کرنے کا انجکشن دیا۔ اگرچہ وہ بدستور چاک و چوبند تھی جیسے اس کے جسم سے رتی بھر خون بھی زائل نہ ہوا ہو اس کے لئے یہ روحانی مسرت ہی کچھ کم تقویت بخش نہ تھی، کہ اس نے ایک انسان کی قیمتی جان بچانے میں مدد دی۔ گھر کے لوگ شاید سونے کے لئے چلے گئے تھے۔ کہ جب ڈاکٹر رخصت ہونے لگا تو اُسے گھر کے اندر باہر جوہر اور ملازمہ لڑکی بیشو کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔

" مریض صبح تک خود بخود ہوش میں آجائے گا۔ آپ اس کے متعلق کچھ بھی فکر نہ کریں اور بے فکر ہو کر سو جائیں "!

ڈاکٹر نے جاتے جاتے تاکید کی ۔ مگر اب سونے کا کون سا وقت تھا نمودِ صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے ۔ پو پھٹ رہی تھی ۔ جوہر ڈاکٹر کو رخصت کر کے اندر آئی تو اس نے بیشو کو مریض کے پاس بیٹھنے کی تاکید کی اور خود نماز صبح ادا کرنے کے لئے کمرے میں چلی گئی ۔

(۷)

اگلی صبح سعید ہوش میں آیا تو اُسے یوں محسوس ہوا - کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے - اُس نے غنودگی کی حالت میں ایک غلط انداز نگاہ اپنے گردپیش ڈالی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں پڑا ہے - ہر شے اُسے دھندلی دھندلی دکھائی دی - سامنے بیٹھے ہوئے دو سائے جیسے نظر آئے ان کے چہروں پر بھی دھند کا نقاب تھا - گہرے سبز پردوں کے عقب سے جھلملاتی ہوئی پیلی پیلی دھوپ سے اُس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں اور پھر کمزوری اور نقاہت کے مارے خود بخود مندھ گئیں -

اس کے آنکھیں کھول کر دیکھتے ہی معاً جوہرا سے پہچان گئی یہ تو وہی - نوجوان کیپٹن تھا جسے ایک مرتبہ اس نے کراچی سے لاہور جاتے ہوئے طیارہ میں دیکھا تھا - بلکہ ایک آدھ مرتبہ اس سے ہم کلام بھی ہوئی تھی - سعید نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں تو جوہرا اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے قریب آئی اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا -

"آپ کی طبیعت کیسی ہے کیپٹن ؟"

یہ گوشش آشنا سی آواز اور کچھ جانا پہچانا سا فقرہ، غنودگی کے عالم میں اُسے سنائی دیا - نرم و نازک انگلیوں کا پُر حرارت جیسا لمس محسوس

ہوا تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ ایک جشم آشنا جیسا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ غور سے اسے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیسی ہے طبیعت اب؟"

جوہر نے نبض محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ سعید نے بولنے میں تامل کیا وہ ڈرتا تھا۔ کہیں یہ حسین خواب ٹوٹ نہ جائے۔ غور سے دیکھتے دیکھتے اس کے سفید اور بے رنگ ہونٹوں پر ایک دارفتہ سا تبسم نمودار ہوا۔ نیم وا آنکھوں میں عجب قسم کی چمک پیدا ہو گئی۔ کہ ان کی تاب نہ لا کر جوہر کی شرمگیں آنکھیں خود بخود جھپک گئیں۔ اس نے آہستہ سے اس کی کلائی پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

شکر ہے کہ اب آپ اچھے ہیں لیٹے رہیئے اُٹھنے کی کوشش نہ کیجئے گا ڈاکٹر نے منع کیا ہے — میں آپ کے لئے ناشتہ لے آؤں۔"

اور جلدی سے باہر چلی گئی۔ سعید نے اس کے الفاظ سنے اور سمجھے۔ مگر اُسے کیا ہوا ہے؟ جو لیٹے رہنے کی فہمائش کی جا رہی ہے — اور سامنے ہی اُسے بیشو نظر آئی جو دور سٹول پر بیٹھی ہوئی غور سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سعید نے ہاتھ کے اشارہ سے اُسے اپنی طرف بلانا چاہا لیکن بازو کو جنبش دیتے ہی بے اختیار کراہٹ کی دردناک آواز اُس کے حلق سے نکلی اور شانے میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اُس درد نے گویا اس کے خوابیدہ ذہن کو جھنجھوڑا معاً اس کا حافظہ جاگ اُٹھا اور واقعات تیزی کے ساتھ اس کی یاد میں ابھر آئے اور اس خیال سے کہ وہ ہوش میں رہنے کی جدوجہد میں بے ہوش ہو گیا تھا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس کے بے ہوش ہونے کے بعد کیا کچھ پیش آیا؟ اور یہ حسین اور خلیق ایئر ہوسٹس کہاں سے آ گئی؟ یہ بیشو اُس کے ساتھ کسی اور جگہ آ گئی یا وہ خود ابھی تک اسی خوفناک اور پُراسرار طلسم کدہ میں مقید ہے جہاں انسانی زندگی پر نت نئے حربوں سے وار کیا جاتا تھا۔ جہاں دوستی اور اپنائیت کی آڑ لے کر کمینہ اور ذلیل خیالات کو بروئے کار لایا جاتا تھا — ؟ بیشو اس کے قریب کھڑی تھی اور وہ سوچ میں کھو کر اس کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا تھا۔

"شکر ہے خدا نے آپ کی جان بچالی صاحب — !"

وہ بشو کی آواز سے چونکا اور محسوس کیا۔ کہ وہ کچھ اور بھی کہتی لیکن مصلحتاً چُپ ہوگئی۔ وہ مہربانی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو بشنا !"

اس کے اعتراض کرنے پر لڑکی نے ایک دن بتایا تھا کہ اس کا ہندو نام بشنا تھا مسلمان ہوگئی تو لوگوں نے اُسے بشو کہنا شروع کر دیا اور اس نے اسی نام کو قبول کر لیا، تب سے سعید اُسے بشنا ہی کہتا تھا۔

لڑکی خاموش کھڑی ہوئی اپنی انگلیوں کو مسلتی رہی۔ اُس کے چہرے سے تذبذب کی کیفیت ظاہر تھی۔ لفظی شکرانہ کے باوصف کسی قسم کی مسرت کے آثار موجود نہ تھے۔

"میری جان بچ جانے پر تمہیں خوشی ہوئی ؟" سعید نے پوچھا۔

"ہوئی تو — لیکن آپ جلد اس جگہ سے چلے جایئے صاحب! پھر شاید مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع ملے نہ ملے "

وہ دروازہ کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جلدی جلدی کہہ گئی۔

"مگر کیوں ؟ مجھے کیا خطرہ ہے اس جگہ ؟ یہ بھی ضرور جانتی ہوگی ؟" سعید نے بھی زیر لب پوچھا۔

"یہ میں — کچھ نہیں کہہ سکتی " وہ جلدی سے مڑی اور باہر جانے لگی —

ٹھہرو بشنا — مجھ سے بولا نہیں جاتا —"

وہ عاجزانہ لہجہ میں کہنے لگا تو لڑکی وہیں رک گئی اور پیچھے پھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے سر کے اشارہ سے اُسے قریب بلایا وہ پھر واپس آکر وہیں کھڑی ہو گئی۔

"بتاؤ نا — ؟" سعید نے اصرار کر کے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتی صاحب !" وہ ایسے استقلال سے بولی کہ سعید کو

محسوس ہوا کہ بار ہا پوچھنے پر بھی وہ اس کے سوا کچھ نہ کہے گی۔
اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ خاتون جو ابھی باہر گئی ہیں کون ہیں؟" سعید نے پوچھا۔
"یہ ــــ ماں جی کی بھانجی ہیں اور سیٹھ کی دودھ شریک بہن بھی ہوائی جہاز ہیں نوکری کرتی ہیں۔ کل ہی چھٹی پر آئی ہیں۔"
یہ بلیشو نے بلا عذر بتا دیا۔ اس کے بعد مختصر لفظوں میں سارے واقعات بیان کئے جو اس کے بے ہوش ہونے کے بعد عمل میں آئے تھے اور یہ سن کر کہ نہ صرف جوہر کی کوشش سے اس کی جان بچی بلکہ اس نے وافر مقدار میں اپنا خون بھی اس کے ضائع شدہ خون کے نعم البدل میں خود اپنے جسم سے دیا۔ تو سعید کے دل میں اس صاحب ایثار اور مجسم انسانیت لڑکی کے لئے والہانہ تعظیم اور عقیدت کا جذبہ پیدا ہو گیا، دروازہ پر آہٹ پا کر بلیشو دوسرے دروازہ کی راہ باہر نکل گئی۔ جوہر ہاتھ میں ناشتہ کا ٹرے تھامے ہوئے اندر آئی تو سعید کو خاصہ ہوش مند پایا۔
"آپ اٹھنے کی کوشش نہ کیجئے، لیٹے ہی لیٹے ناشتہ کرنے میں آپ کی مدد کروں گی۔"
اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹرے قریب کی میز پر رکھ کر اسے اور بھی سعید کے قریب سرکا دیا۔ جذبۂ تشکر نے چند ثانیوں کے لئے تو سعید سے قوتِ گویائی چھین لی۔ وہ چپ چاپ لیٹا ہوا اپنی محسنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ جوہر آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ گئی اور نیم برشت انڈے کی پلیٹ اور چمچہ ٹرے میں سے اٹھایا۔
"بازو کو جنبش دینے سے زخم دکھے گا۔ آپ کی نرس کی حیثیت سے یہ فرض ادا کرنے میں مجھے خوشی ہو گی۔ مریض کی ہر ممکن مدد کرنا نرس کا فرض ہے نا؟"
وہ سعید کی تسکین کی خاطر کہہ رہی تھی۔
اس سے ہزار گنا بڑھ کر مدد آپ نے میری جان بچانے کے سلسلہ

ہیں کی ہے۔ میں ابھی تک الفاظ ہی سوچ نہیں سکا جنہیں شکریہ ادا کرنے کے لئے استعمال کروں۔ بخدا ۔۔۔"

اور جوہر نے ایک سریلا سا قہقہہ لگا کر انڈے کا بھرپور چمچہ اس کے منہ میں ڈال دیا۔

ابھی کہہ رہے تھے کہ الفاظ سوچ ہی نہیں سکا اور ابھی لگے ہیں رسمی شکریہ کے لفظوں کی بھرمار کرنے ۔ ! معلوم ہوتا ہے اتنی سی دیر میں آپ نے کافی ساری معلومات فراہم کر لیں ؟"

سعید کو حسین جوہر کی اس بے ساختہ حرکت پر ہنسی آ گئی۔

" ماشاء اللہ بڑی خوش مذاق ہیں آپ !" اس نے ہنس کر کہا۔

" بے پر کے اڑنے والے ہم لوگوں کا مسلک ہے"

" خوش باش دمے کہ زندگی ایں است "

کوئی خبر نہیں کونسا لمحہ دم واپسیں کا حامل بن کر آ رہا ہو۔ کیوں نہ ہر دم غنیمت جان کر ہر وقت خوش رہے ۔ ! کیوں کیا خیال ہے آپ کا ؟

اور باتوں ہی میں اس وقت وہ اسے پورا انڈا کھلا چکی تھی۔

بڑے دلچسپ خیالات ہیں آپ کے ! کاش سب ہی لوگ زندگی کو اسی روشنی میں دیکھیں !" سعید نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

" حیرت ہے کیوں نہیں دیکھتے ؟ حالانکہ ان کی آہ و بکا سے کچھ سنورتا نہیں ہوگا بلکہ اپنے حواس پر ہراس طاری کر کے وہ حالات کو بگاڑ ہی لیتے ہوں گے ۔"

وہ دلیہ میں جگ سے گرم دودھ ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

" شکر کم کھاتے ہیں یا زیادہ ؟" اس نے شکر ملانے سے پیشتر احتیاطاً پوچھا۔

" اگر آپ اس آؤٹ آف فیشن " حرکت کو ناگوار نہ سمجھیں تو شکر زیادہ ہی کھانے کی عادت ہے مجھے ۔" سعید ہنس کر کہنے لگا

"اچھی علامت ہے! زیادہ شکر کھانے والے ہمیشہ خوش طبع اور خوش ذوق ہوتے ہیں!"

اس نے دلیہ کا چمچہ سعید کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اور سعید اس وقت اپنے سارے خطروں کو نظرانداز کئے بیشو کی تنبیہہ کو پس پشت ڈالے اس قدر مسرور اس قدر مطمئن تھا، جیسے اُس نے اپنے منتہائے حیات کو پالیا ہو۔ خطرہ کجا اُسے تو اپنے مہلک گھاؤ کے شدید درد تک کا احساس نہ رہا تھا جو ہر کی دلچسپ گفتگو نے اس پر مرہم رکھ دیا تھا۔ اس کی ہمدردی نے ایسی مسیحائی کی کہ وہ اپنے نیم مردہ جسم میں نئی زندگی کی روح افزا لہریں محسوس کرنے لگا۔

جوہر چائے بنا کر پیالی اس کے قریب لائی تو اس نے پیالی تھامنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوئے احسان مندانہ انداز میں کہا۔

"پیالی تو میں بائیں ہاتھ سے بخوبی تھام سکتا ہوں"

اور جوہر نے مسکراتے ہوئے پیالی اُسے دے دی۔

"بھلا آپ نے مجھے پہچانا بھی —؟ ہم ایک دفعہ پہلے بھی مل چکے ہیں!" وہ پوچھنے لگی۔

آنکھ کھولتے ہی یک دم پہچان لیا میں نے تو۔ البتہ حقیقت میں ضرور شبہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ خواب کے عالم میں میرا ذہن طیارہ والے اُس حسین منظر کو دوہرا رہا ہے —!"

سعید نے جواب دیا اور مسکراتے ہوئے خوش ذائقہ اور گرم گرم چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

"اچھا —؟" جوہر نے اس کے دلچسپ خیال پر بے ساختگی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ پیالی کے اوپر سے اس کی طرف دیکھتا جا رہا تھا کرسی کو پیچھے سرکا کر وہ نیم دراز حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ زنگاری رنگ کی ریشمین ساڑھی کا پلو ڈھلک کر بائیں بازو پر گرا ہوا تھا۔ جس سے وہ کرسی کے بازو پر سہارے لئے ہوئے تھی۔ دائیں ہاتھ کو میز پر رکھے وہ سادگی سے مسکرا

رہی تھی سفید بروکیڈ کے نیم آستین جیکٹ سے اس کے گداز اور سڈول بازو دکھائی دے رہے تھے۔ گریبان کی خوبصورت مدور تراش کچھ ایسی ہنرمندی سے کی گئی تھی کہ برہنگی سے احتراز کے باوصف اس کے مرمریں سینے کا بالائی حصہ نمایاں تھا کہ اور خوشنما گردن کی دلکش ساخت جاذب نظر محسوس ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر زیور کی قسم سے کوئی آرائشی چیز موجود اس کے باوجود حسن سادہ کا وہ نادر نمونہ دلربائی میں کسی طرح کم نہ تھا۔

سعید نے ابھی چائے نہ ختم کی تھی کہ دروازہ پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کسی نے چند ثانیئے پس پردہ کچھ توقف کیا کچھ کھسر پھسر کی آواز آئی اور پھر آگے آگے ماں جی اور پیچھے پیچھے ذاکر اور جلیل منیجر داخل ہوئے۔

"کیسی طبیعت ہے سعید بھیا؟" ذاکر نے اُس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے اب تو!" سعید نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

خدا کا شکر ہے بھائی تمہیں پھر منہ سے بولتے سنا، میری تو جان ہی ہوا ہو گئی تھی۔ دشمنوں کو کچھ ہو جاتا تو تمہارے باپ کو کیا منہ دکھاتے ہم لوگ!"

ماں جی کہہ رہی تھیں۔

"مبارک ہو صاحب! خدا نے جان کی سلامتی بخشی!"

جلیل صاحب بولے۔ سعید خاموشی سے کی سب کی باتیں سنتا رہا مگر رسمی طور پر بھی کچھ نہ بولا۔ اُسے معلوم تھا کہ ابھی چند دن اور یہاں گزارنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

وہ اپنی زندگی کے لیے جوہری احسان مند تھا۔ مگر اپنے خیال کو ان لوگوں کے روبرو ظاہر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ اس کی اس خاموشی پر حیران سے ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جوہر بھی چپ چاپ بیٹھی ہوئی اُن کے چہروں پر تاثرات کا مطالعہ کرتی رہی۔

جلیل نے طنزیہ استفسار سے ذاکر اور ماں جی کی طرف دیکھا۔ ماں جی نے ناک بھوں چڑھا کر اور اپنی ارزق آنکھوں کو تنگ کر کے عجب کرودھ کے ساتھ سعید کی طرف دیکھا۔ ذاکر نے جو سعید کے پس پشت کھڑا تھا۔ کسی غضب ناک جاموش صحرائی کی طرح نتھنے پھیلا کر ترچھی نظروں سے اس کی طرف نگاہ کی اور پُرمعنی انداز سے سر ہلایا۔ جلیل نے کندھوں کو کسماتے ہوئے کھنگورا۔

"کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ اسی لئے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا ہو گا۔"

"بہر حال میں — آپ سب کا شکر گزار ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ صاحبوں کو اس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصاً جوہر کا تو میں احسان مند ہوں اور اپنی زندگی کے لئے ان کا مرہون منت ہوں۔"

سعید نے دل پر جبر کر کے مصلحتاً ظاہری داری رکھنا چاہی اس پر جوہر ہنسنے لگی۔ اور غور سے سعید کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تو میں نے آپ کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ کہ آپ کو رسمی باتیں نہیں آتیں؟" وہ ہنس کر کہنے لگی۔

"یہ اظہار حقیقت ہے آپ اُسے محض رسمی کیوں سمجھیں؟" سعید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، ہر انسان کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والے لطیف جذبات کے لئے زبان کی بجائے دل بہتر امین ہے —"

وہ ہنستے ہنستے کہتی گئی اور ساتھ ہی ذاکر کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"میں نے سعید صاحب کو پہلے بھی دیکھا ہے ذاکر بھیا! دو ہی ہفتے ہوئے ہوں گے کہ یہ میرے جہاز پر کراچی سے لاہور گئے تھے!"

"اچھا —؟" ذاکر نے بددلی سے کہا۔ وہ جوہر کی بات سنتے

سے زیادہ باہر سے سنائی دینے والی بیشو کی آواز پر متوجہ تھا۔

" چندن! چندن!"

فاصلہ پر اس کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔ جس پر ماں جی نے بھی کان کھڑے کئے۔ چند ہی لمحے بعد وہ برآمدے کے عین سامنے پکار رہی تھی۔

"چندن! چندن"

ماں جی نے خفگی سے کہا اور اٹھ کر دروازہ سے باہر دیکھا۔ بیشو دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے ان کی پالتو بلّی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی مگر وہ گھر بھر میں کہیں نہ ملی۔

" ماں جی! چندن کہیں ملتی نہیں سارے گھر میں اُسے ڈھونڈھ پھری"
اس نے دیکھتے ہی کہا۔

" تو کیوں دیوانوں کی طرح چیختی پھر رہی ہے چھوکری! کہیں رکھ دے خود ہی پی لے گی آ کر۔!"

ماں جی کہہ رہی تھیں کہ مالی چندن کو ہاتھ میں لٹکائے آتا دکھائی دیا۔

" یہ چندن ـــ کھاد کے گڑھے میں مری پڑی تھی ماں جی!"

اس نے صندلی رنگ کی، گچھے دار دم والی پالتو بلی کا مردہ جسم زمین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ مارے دہشت کے بیشو کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور ہاتھ سے دودھ کا پیالہ چھوٹ پڑا۔

" شاید کوئی زہریلا کیڑا کھا گئی یہ بدبخت رسیا! لے جاؤ اسے کہیں گڑھا کھود کر گاڑ دو۔"

ماں جی نے آزردہ جیسی آواز میں کہا۔ اس بلّی ہی سے تو ان بیچاری کی گودی ہری تھی! ہر وقت اُسے گود میں بھرے بیٹھی رہتی تھی اور اب وہ یوں اچانک مر گئی۔! لیکن اس کے مرنے کا دکھ اُن سے زیادہ تو بیشو کو ہوا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے پھولے ہوئے مردہ جسم کو گھورتی چلی جا رہی تھی تا آنکہ رسیا مالی اُسے اٹھا کر واپس چلا گیا۔

بلی کے مرنے کی خبر پاکر تو جوہر بھی رنجیدہ سے زیادہ سنجیدہ اور فکرمند ہو گئی۔

حالانکہ چندن سے وہ بے حد چڑتی تھی، ماں جی کے اُسے گود میں لئے رہنے پر جھنجھلاتی اور اُسے مار کر باہر نکال آیا کرتی تھی اب جو وہ اچانک مر گئی تو جوہر تک کے دل پر گہرا اثر ہوا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

(۸)

ایک ہفتہ بھر میں سعید تندرست ہو گیا اور چلنے پھرنے لگا۔ زخم اگرچہ پوری طرح مندمل نہ ہوا تھا لیکن قوت بحال ہو گئی تھی۔ اپنی صحت یابی کے لئے سعید تہ دل سے جوہر کا شکر گزار تھا اور بارہا اس کا اظہار نئے پیرایوں میں کر چکا تھا۔

اسے یقین تھا کہ یہ جوہر ہی کی نگرانی کا نتیجہ تھا کہ اس کی جان سلامت بچی وہ بے حد احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ اس کی غذا اور دوا کا خیال رکھتی تھی۔ ڈاکٹر اس کے طرز عمل سے جھلاتا۔ ماں جی ناک بھوں چڑھاتیں مگر جوہر انجان بنی ہوئی مطلق پروا نہ کرتی اور یہی کہتی کہ مہمان ہے اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔

"نکم" میں سعید کا وہ آخری دن تھا۔ اس کی وہاں رہائش کا عرصہ پہلے ہی اس کے اندازے سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ اگرچہ جعفر رضا کو اس نے اپنی خیریت کی اطلاع لکھ بھیجی تھی اور ان تمام واردات کا ذکر نہیں کیا تھا جو اُسے پیش آئیں۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ اسے کس قدر چاہتے ہیں اگر انہیں اشارۃً بھی کسی خطرہ کا احساس دلایا تھا تو وہ شاید اپنی ضعیفی اور نقاہت

کو نظر انداز کر کے بذات خود اس کے پاس چلے آتے ۔

اُس دن دوپہر کے کھانے پر ذاکر نے اپنے چند دوستوں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ سعید کے اعزاز میں الوداعی دعوت دینا ضروری تھا۔ ماں جی نے اپنی خاص نگرانی میں نہایت پُر تکلف اور لذیذ کھانے تیار کروائے تھے، مہمانوں میں اس دن ذاکر کا ایک نہایت عزیز دوست بھی شامل تھا۔ جس کا سعید سے تعارف کراتے وقت ذاکر نے کہا تھا۔

" ان سے ملو سعید! یہ میرے محسن اور دلی دوست مسٹر فخر ہیں۔ اور عنقریب اس گھر کے افراد میں سے ہوں گے۔ بلکہ میں تو ان کو ابھی سے گھر ہی کا ایک رکن سمجھتا ہوں۔"

ذاکر کے ان الفاظ کو سنتے ہوئے جوہر کی عجب کیفیت ہوئی وہ دل ہی دل میں کٹ کر رہ گئی۔ پہلے تو اُسے خیال آیا کہ اُٹھ کر چلی جائے اور ان لوگوں کی موجودگی میں اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے مگر پھر اُسے سعید کے خیال نے اس اقدام سے باز رکھا وہ اسے ان لوگوں میں اکیلا چھوڑنے پر تیار نہ تھی اسلئے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ ذاکر کی بات کے جواب میں۔ فخر نے گویا اس کے الفاظ کی توضیح کے واسطے جوہر پہ دلچسپی کی بھرپور نگاہ ڈالی اور ہنسنے لگا۔

" میں اس اعزاز کے لئے مدت العمر تمہارا احسان مند رہوں گا — اور یہ محسن کا خطاب پھر تمہارا حق ہو گا — !"

اور اس نے کنکھیوں سے جوہر کی طرف دیکھتے ہوئے قہقہہ لگایا ذاکر نے بھی خوشامدانہ انداز سے اس کا ساتھ دیا۔ اتنے میں دروازے پر ملازم کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ رلدو دہلیز میں کھڑا ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔

" دلیل صاحب اور زمبیل صاحب آئے ہیں زی!" وہ کہہ رہا تھا۔

" کون آئے ہیں —"

فخر نے حیرت سے پوچھا۔ ذاکر ہنسنے لگا۔

اس بدبخت رلدو کو اب تک ٹھیک سے بولنا نہ آیا! کہہ رہا ہے جلیل صاحب اور جمیل صاحب آئے ہیں -! ارے بھئی بھیج دو انہیں یہیں!"

ذاکر نے کہا اور فخر کو قہقہہ لگانے کا ایک اور موقعہ ہاتھ آیا۔ اس کی نگاہ رہ رہ کر جوہر کے رخ انور کا طواف کرنے کے لئے اٹھتی تھی جو لیونڈر رنگ کا قمیص، غرارہ اور اسی رنگ کا منقشی دوپٹہ اوڑھے ہوئے حسن و سادگی ایک لطیف مرقع نظر آرہی تھی اور دریچے کے قریب سعید کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اُسے اپنا البم دکھا رہی تھی۔ اتنے میں ہی میں ماں جی کمرے میں داخل ہوئیں اور ان کے ساتھ ہی منیجر جلیل اور ایک تنومند دراز قامت شخص اندر آیا ذاکر اور فخر نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور بے تکلفانہ باتیں کرنے لگے۔

"اب کھانا کھا کر ہی آرام سے باتیں کرنا"!

ماں جی نے کہا اور سب اُٹھ کر کھانے کے کمرے میں آئے۔ میز خاص اہتمام سے آراستہ تھا۔ چینی کے نفیس برتن جگمگا رہے تھے۔ حسین پھولوں سے سجے ہوئے گلدان جابجا رکھے تھے۔ زعفران اور کیوڑے کی خوشبوؤں سے فضا مہک رہی تھی۔ میووں اور پکوانوں کی اشتہا انگیز باس ترغیب دہ تھی۔

کام و دہن سے پہلے مشام کے ذریعے مہمانوں کی روح ترو تازہ ہو گئی سب خوش اور چونچال تھے۔ میز کے ایک سرے پر ماں جی، معزز خاتون خانہ کی حیثیت سے بیٹھ کر اپنے فن خانہ داری کی داد وصول کر رہی تھیں دوسرے سرے پر ذاکر تھا۔ ایک طرف اُس کے تینوں دوست اور دوسری طرف جوہر اور سعید بیٹھے تھے۔ جوہر، فخر کے مقابل تھی۔ مگر اونچے گلدان میں لگے ہوئے لمبی ٹہنیوں والے گلاب کے شگفتہ پھول اس کے لئے آرام دہ اوٹ کا کام دے رہے تھے۔ اس طرح کہ جب تک فخر خصوصاً جھانک کر نہ دیکھے اپنی ہونے والی منسوبہ کا رُخ زیبا اُس کے لئے تسکین نگاہ نہ بن سکتا تھا جس

کا ردِّ عمل یہ تھا کہ سعید اُس کی تیز اور کرودھ بھری نظروں کا ہدف بنا ہوا تھا۔

کھانا شروع ہوا ذاکر کے دوست پُرخوری میں کسی طرح خود اُس سے پیچھے نہ رہے۔ ماں جی کی ستائش میں بڑھ چڑھ کر قصیدہ گوئی ہوتی رہی اور میز صاف ہوتا چلا گیا۔

"سعید تو کچھ بھی نہیں کھا رہا!"

ماں جی نے حسبِ عادت آنکھیں سکیڑ کر بڑے غور سے سعید اور جوہر کی طرف دیکھا۔

"ارے بھائی! کھاؤ نا۔ تکلف تم نے ابھی تک نہیں چھوڑا" ذاکر نے بھرپور منہ سے بمشکل کہا۔

حالانکہ خوب کھانا چاہیے انہیں تاکہ کمزوری رفع ہو!" جلیل کہنے لگا۔

"ہماری طرح دستِ خود، دہانِ خود کے قائل نہیں ہیں بیچارے میزبان کے دستِ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔!"

فخر نے نیم خندہ نیم سوختہ لہجہ میں کہا۔ جوہر کی صریح بے توجہی نے اس کے ولولوں پر اوس ڈال دی تھی اور ذاکر کے منصوبے اُسے انہونے سے نظر آنے لگے تھے۔ سعید کے لیے اُس کے دل میں رقابت کا بے کراں سمندر متلاطم ہو گیا۔ اور اس نے تہیہ کر لیا کہ یہ شخص اس نواح سے زندہ نہ جانے پائے گا۔

ان باتوں کے جواب میں سعید نے مسکرا کر جوہر کی طرف دیکھا جو بدستور سنجیدہ تھی اور اب ان لوگوں کی باتوں پر اس کے چہرے سے خشم کے آثار جھلک آئے تھے۔

"یہ مزعفر و روغن جوش تو تم نے چکھا ہی نہیں۔ ایسی چیزیں خون بڑھاتی اور توانائی پیدا کرتی ہیں۔"

ماں جی نے انتہائی شفقت سے کہا اور ایک پلیٹ میں اپنے ہاتھ سے

روغن جوش نکال کر سعید کی طرف بڑھایا۔

"ان کے لئے فی الحال یہ زیادہ چکنی اور ثقیل چیزیں مفید نہیں۔ صبح ہی یہ معدہ میں گرانی کی شکایت کر رہے تھے۔"

جوہر نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ اور پلیٹ کی طرف خود ہاتھ بڑھایا۔

"اچھا۔"

ماں جی بے دلی سے کہنے لگیں اور اس سے پیشتر کہ جوہر پلیٹ اٹھاتی جھٹ سے خود اٹھا کر اپنے آگے رکھ لی۔ حالانکہ روغن جوش تو ان کی اپنی پلیٹ میں بھی وافر مقدار میں پڑا ہوا تھا۔

"اچھا تو کیا سعید صاحب مس جوہر ہی کے زیر علاج ہیں؟"

فخر نے طنز کے لہجہ میں کہا۔ اس کا روئے سخن ذاکر کی طرف تھا

"نہیں علاج تو ایک سرجن کر تے رہے ہیں۔ ہمارے عزیز مہمان ہیں سعید صاحب ہمارا فرض ہے کہ ان کی اچھی طرح نگہداشت کریں اور اور جوہر ہمیشہ فرض شناس ثابت ہوئی ہے۔"

ذاکر نے جیسے بات کو کچھ خاص اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔ جوہر نے ذرا تیز نگاہوں سے فخر کی طرف دیکھا مگر کوئی تیز فقرہ سنانے سے اپنے آپ کو بمشکل روکا۔ ذاکر نے درمیان میں کچھ اور ذکر چھیڑ دیا۔ اور موضوع بدل گیا سعید بھی موقعہ بموقعہ گفتگو میں مختصر حصہ لیتا رہا۔

اب فخر آئے تو سعید جا رہے ہیں، جتنے روز قیام کیا وہ بھی علالت کی مجبوری سے۔ اگر یہ چند دن اور رہ جاتے تو بڑا لطف رہتا۔" جلیل کہنے لگا۔

واقعی کتنا اچھا ہوتا — رہ جاؤ سعید!

ذاکر نے جیسے بڑے ہی اشتیاق سے کہا تو جوہر بے ساختہ ہنس دی۔

"پہلے کیا کم لطف اٹھایا ان بیچاروں نے یہاں آنے کا؟"

وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ ماں جی نے چونک کر اپنی پلیٹ پر سے نگاہ اٹھائی اور وہ پراسرار جیسی ارزقی آنکھیں سیکڑ کر غور سے جوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔

گو اندازہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ غصہ سے دیکھ رہی ہیں یا حیرت سے ؛ کیونکہ وہ آنکھوں کو اپنے خاص انداز سے اتنا گہرا اسے جاتی تھیں کہ دیکھنے والا کوئی رائے قائم نہ کر سکتا تھا۔ بہر کیف سعید بلا توقف بولا۔

میں نے اس ساری تکلیف کے باوصف کافی حظ اٹھایا اس سفر سے اور میں آپ سب کی نوازشوں کا بے حد شکر گزار ہوں ——— !'

وہ کہنے لگا۔

تو رہ جاؤ نا ——؟" ذاکر نے اصرار کیا۔

اگر ٹھہر سکتا تو پھر گر جانے کا نہ نام لیتا۔ مگر مجبور ہوں بھیا ! چھٹی ختم ہو گئی ہے۔" سعید نے منت سے کہا۔

اچھا بھائی ! ہماری صحبت کو منغض کر کے تم سدھارو اپنی ملازمت پر مگر سچ مانو ہر دم یاد آئے گی !

ذاکر کہنے لگا تو جوہر نے خبر نہیں کیوں نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اب ملے ہو تو آتے جاتے رہا کرنا۔ تم وعدہ کر چکے ہو کہ اب کے جعفر کو ضرور ساتھ لاؤ گے۔" ماں جی نے کہا۔

" ضرور !" سعید نے پر زور لہجہ میں کہا

کھانا ختم ہوا۔ ملازموں نے پلیٹیں میز پر سے اٹھا دیں۔ میٹھا اور میوے پیش کرنے کو ماں جی خود اُٹھیں۔

" لو بھئی لڑکو ! بھلا پہچانو تو سہی یہ کس چیز کی پڈنگ ہے ؟"

وہ میز کی طرف جاتے ہوئے ہنس کر کہنے لگیں۔ سب دلچسپی سے متوجہ ہوئے۔ سائڈ بورڈ پر پڈنگ کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں جن میں پڈنگ ڈال کر ٹھنڈی ہونے کو رکھ دی گئی تھی۔ ماں جی دو دو پلیٹیں اٹھا کر لے جاتیں اور مہمانوں کے سامنے رکھتی جاتیں۔ دوسرے پھیرے میں وہ دو پلیٹ اٹھا کر لے گئیں اور جلیل اور جمیل کے سامنے رکھنے لگیں سائڈ بورڈ پر اب صرف دو پلیٹیں باقی تھیں جو یقیناً سعید اور جوہر کے لئے تھیں۔ بیٹو اپنی حیرت زدہ سی آنکھوں کو پوری پوری کھولے اور دم سادھے ہوئے قریب

ہی کھڑی تھی۔ اُس کے دل میں جنے نہیں کیا آئی کہ عجلت سے دونوں پلیٹیں اٹھائیں اور میز کی طرف بڑھی۔ ادھر ماں جی واپس مڑیں تو بے ساختہ چیخیں
"ہائیں — ؟ یہ پلیٹ کون لے گیا؟"
"یہ رہیں ماں جی — !"
بشو نے سعید اور جوہر کی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے کہا گویا اُن کے سامنے رکھنے جا رہی ہو لیکن معاً کسی شے سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری پلیٹیں ٹوٹ گئیں پڈنگ فرش پر پھیل گئی —
"بدبخت چھوکری! ہمیشہ کام خراب ہی کرے گی اس کا ستیاناس جائے!"
ماں جی دانت پیس رہی تھیں اور بشو فرش پر سے اٹھی تو پلیٹ کا کوئی ٹوٹا ہوا ٹکڑا لگنے سے اُس کی ٹھوڑی زخمی ہو گئی تھی —
"کرسی سے پیر اُلجھ گیا ماں جی!"
ساڑھی کے پلو سے خون پونچھتے ہوئے وہ عاجزی سے معذرت کر رہی تھی۔ ماں جی نے مارے غضب کے آنکھیں سکیڑتے اور دانت پیستے ہوئے اُسے گھورا۔
"اندھی جو ہے نا؟ سوجھتا کچھ نہیں سامنے سے! کل موہی نہ ہو تو!"
وہ پچکچکی لے کر کہنے لگیں۔
اوہ اسے تو چوٹ لگ گئی — !" جوہر نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے ہوئے کہا۔
جہنم میں جھونکو حرامخور کو! تم کہاں چلیں کھانا چھوڑ کر — ؟" ماں جی۔ کہنے لگیں۔
"کھانا تو میں اچھی طرح کھا چکی" — اس نے تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ پھر سعید کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔
"آپ کے پاس کچھ بچا ہوا سامان ہے تو میں اُسے پٹی کر دوں۔ بہت خون نکل رہا ہے"

"جی ہاں ۔" سعید نے بھی فوراً کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تم تو ٹھہرتے سعید! میں اور پڈنگ لئے آتی ہوں باورچی خانہ سے!" ماں جی کچھ مضطرب سی ہوکر پکاریں۔

"جی نہیں شکریہ! اب تو گنجائش ہی نہیں۔ آپ نے اس اہتمام کا پہلے ذکر کیا ہوتا تو ہاتھ کھینچ کر کھاتا۔ دراصل ہر چیز اتنی مزے کی تھی کہ اندازہ سے زائد ہی کھا گیا ۔۔۔!"

سعید نے سادگی اور خندہ روئی سے جواب دیا اور معذرت کرتا ہوا وہ بھی جوہر کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا اور ذاکر پیچ وتاب کھا کر رہ گیا اس کی برداشت تو اب مصلحت کی حدود سے باہر نکلی جارہی تھی۔ اس نے اپنی چپٹی ناک کے تنگ نتھنوں کو پھیلاتے ہوئے۔ اینٹھی ہوئی گردن پھرا کر پہلے تو غضب ناک نظروں سے ان لوگوں کو جاتے دیکھا پھر پرمعنی نگاہوں سے ماں جی کی طرف گھورنے لگا۔ جو بازو ڈھیلے چھوڑے ہوئے شکست خوردگی کی تصویر بنی ہوئی تھیں مگر فخر کی موجودگی میں دونوں میں سے کوئی بھی کچھ کہہ نہ سکا مگر اب تو جوہر کے خلاف اُن کے غم وغصہ کی انتہا نہ تھی علاوہ ازیں ہنڈیا پر تو قہر ٹوٹنے میں کچھ کسر باقی نہ تھی۔ ذاکر اندر ہی اندر کھول رہا تھا بہت ضبط کیا لیکن اتنا کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس چھوکری کو کیا ہوگیا ہے۔ اتفاقیہ اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئی ہیں یا دانستہ خرمستیاں کرکے دکھاتی ہے یہ!" وہ ہونٹ چبا کر کہہ رہا تھا۔

"میں تو اسے رسیا کے پلے باندھ دوں گی! وہ ہر روز اس کی پٹائی کرے گا تو ساری خرمستیاں ہوا ہو جائیں گی۔ یہ لوگ لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں!" ماں جی مارے غصہ کے چیخ کر بولیں۔ سب ہنسنے لگے۔

"چلئے غصہ تھوک دیجئے ماں جی! اتفاقیہ اُس کا پاؤں الجھ گیا۔ اور گر پڑی۔ خود اُس بدبخت کے بھی تو چوٹ آگئی۔" فخر نے ہنس کر کہا۔

"میں خود خوب سب کے سامنے اپنے ہاتھ سے پلیٹیں رکھ رہی تھی۔ اسے

کیا سوجھی جو بیچ میں ٹپک پڑی ؟" ماں جی بولیں۔
" اس نے تو اپنی جانچ سے آپ کا ہاتھ بٹایا ۔" جلیل کہنے لگا۔
اتنے میں جوہر واپس آئی۔
کافی گہرا زخم ہو گیا بٹشو کے ۔" وہ کہنے لگی۔
" اچھا ہوا! یہی سزا ہونی چاہیئے ایسی خام پارہ چھوکری کی!"
" خیر وہ آپ کی پڈنگ کا کیا ہوا ۔۔ ؟ کس نے پوچھا کہ کس چیز کی بنی تھی وہ ؟ جوہر نے پوچھا۔
" سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا۔ اُس چڑیل نے ۔۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آیا ادھر تم اور سعید بھی اُٹھ گیا اور ۔۔"
ذاکر فقرہ ادھورا ہی چھوڑ کر چپ ہو گیا۔
اور آپ پڈنگ کے ساتھ ساتھ غم و غصہ بھی کھاتے رہے اسی لئے ذائقہ کی پہچان نہ ہوئی ؟"
جوہر نے ہنس کر کہا اور سماوار کے قریب جا کر صابن سے ہاتھ دھونے لگی۔
" سعید صاحب کہاں رہ گئے ؟" جلیل پوچھنے لگا۔
وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کہتے تھے کھانا بہت کھا لیا گرانی محسوس ہونے لگی۔ کچھ دیر آرام کریں گے ۔"
جوہر نے ہاتھ پونچھتے ہوئے جواب دیا ۔۔ اور کمرے سے نکل گئی باقی سب مہمان بھی اُٹھ کر واپس ڈرائنگ روم میں چلے آئے اور ذاکر نے سگریٹ پیش کیے اتنے ہی میں ملازم کافی لے آیا۔ پیچھے پیچھے ماں جی داخل ہوئیں اور سب پر غائر نگاہ ڈالتے ہوئے بولیں۔
" جوہی کہاں ہے ؟"
" خدا جانے ۔" ذاکر نے پُر معنی نگاہ سے انہیں گھورتے ہوئے جواب دیا۔
خیر میں خود کافی بنائے دیتی ہوں ۔" اور وہ خود بنانے لگی۔

جلیل نے پیالیاں اٹھا اٹھا کر سب کو دینی شروع کر دیں ۔ ماں جی ایک پیالی اٹھا کر چلنے کو تھیں کہ جوہر داخل ہوئی ۔ اور انہیں کافی کی پیالی لے کر جاتے ہوئے دیکھا تو پر استعجاب لہجہ میں پوچھا ۔

” یہ آپ کہاں چلیں ؟“

میں سعید کو اس کے کمرے ہی میں کافی دے آؤں “ وہ دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگیں ۔

مگر وہ تو سو گئے ہوں گے ۔ کہہ رہے تھے برہیم کھا کر سونے لگے ہیں “ جوہر نے کہا ۔

” لو اتنی جلدی کیسے سو گیا ہو گا ۔ گرانی بتاتا تھا ۔ کافی پینے سے سکون ہو گا “ اور وہ قدم برداشتہ باہر نکل گئیں ۔ جوہر کچھ دیر گومگو کے عالم میں کھڑی رہی مگر اُسے تسلی تھی کہ سعید خبردار ہو چکا ہے ۔ چنانچہ وہ سکون سے بیٹھ کر اپنے لئے کافی بنانے لگی ۔

ماں جی سعید کے کمرے میں داخل ہوئیں ۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھا اور آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا ۔ قدموں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا ۔

اوہ یہ آپ نے کیوں تکلیف کی ۔ مجھے کافی پینا ہوتی تو میں ہی ٹھہر جاتا خیر لائیے مجھے دے دیجئے “

اُس نے عجلت سے اُٹھتے ہوئے کہا ۔ اور ماں جی نے پیالی اُس کے ہاتھ میں تھما دی ۔

میں نے کہا تم آرام کرنے چلے گئے تو تمہارے کمرے ہی میں پہنچا دوں “ وہ کہنے لگیں ۔

” آپ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں ۔! بہت یاد آیا کرے گی آپ کی یہ شفقت !“

سعید نے کہا ۔ ماں جی کھڑی مسکرا رہی تھیں ۔

” آج ہی کے تو مہمان ہو ، اتنے دن بیماری میں گزر گئے تمہاری مہمانداری

کی تو حسرت ہی رہ گئی مجھے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"بیٹھئے نا ۔۔۔" سعید نے کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں سوچتا ہوں اس کے ساتھ ہی لبر ٹیم کی گولی کھا لوں۔" سعید نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"کھا لو پھر ۔۔۔" ماں جی بھی سکون سے بولیں۔ سعید اُٹھ کر الماری سے گولی نکال لایا۔ اور ماں جی سے باتیں کرتے کرتے پیالی اٹھائی۔ دفورِ اشتیاق سے ماں جی کی ارزاتی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں خبر نہیں انہیں سعید کی کون سی بات اس وقت اس قدر بھلی معلوم ہو رہی تھی کہ پوری دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ تھیں اور بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا رہی تھیں کہ یک دم چونکا۔

"افوہ! اس میں تو مکھی گر گئی!"

اور اس سے پیشتر کہ ماں جی کچھ کہیں اُس نے آگے بڑھ کر پیالی کو دریچے سے باہر انڈیل دیا۔

"خیر میں اور لئے آتی ہوں۔" وہ جلدی سے اُٹھیں "آپ تکلیف نہ کیجیے میں پانی ہی سے گولی کھا لیتا ہوں۔" سعید نے جواب دیا اور اتنے ہی میں بشو داخل ہوئی۔

"ماں جی آپ کو ممتی بلا رہی ہیں۔" وہ کہنے لگی ماں جی نے اُسے کڑی نگاہ سے سر تا پا گھورا اور اُٹھ کر چلی گئیں۔

سعید نے ان کے پیچھے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بستر پر لیٹ کر بظاہر سو جانے کی کوشش کرنے لگا۔

(۹)

نیم غنودگی کی کیفیت میں سعید کو دروازے پر ہلکی ہلکی دستک سنائی دی وہ چونک اُٹھا اور اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بیشو کھڑی تھی۔

" نیچے آپ کو مستی بلا رہی ہیں مگر اس طرف جایئے گا۔"

اس نے باغیچہ کی سمت اترنے والے زینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی دبی آواز اور محتاط لہجہ سے اسرار کی بو آتی تھی۔ سعید نے اُسے غور سے دیکھا مگر کوئی سوال کئے بغیر خاموشی سے زینہ کی طرف بڑھ گیا۔

جوہر ڈرائیو۔ پر کھڑی تھی اُسے دیکھ کر چپ چاپ گیٹ کی طرف چلی گئی سعید بھی اس کے پیچھے چلا کچھ فاصلہ پر جوہر کی چھوٹی سی" مورس " جھاڑیوں کے درمیان الجھی ہوئی تنگ سڑک پر کھڑی تھی۔ وہ قدم برداشتہ چلتا ہوا جوہر کے قریب پہنچا۔ اب تک وہ دونوں خاصے بے تکلف دوست بن گئے تھے سعید اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے چلتے ٹھہرا لیا۔

" کیا بات ہے جوہر؟" وہ استعجاب آمیز لہجہ میں پوچھنے لگا۔

" آؤ ذرا ساحل تک چلیں۔!" جوہر نے کہا اور کار میں جا بیٹھی سعید بھی اس کے پہلو کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کچھ خاص بات ہے کیا؟ کچھ بتاؤ بھی تو سہی، اس قدر متفکر کیوں

ہو تم ؟"

سعید نے پوچھا ۔ جوہر نے ایک نگاہ اُس کی طرف بغور دیکھا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے کچھ دیر خاموشی سے کار چلاتی رہی ۔ سعید صورت سوال بنا بدستور اس کے انتہائی سنجیدہ اور متفکر چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔

" سعید ؟" اس نے زیرلب کہا ۔

" ہوں ؟" سعید نے اشتیاق سے اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی ۔

اللہ پاک تمہیں ان لوگوں کے وحشیانہ حملوں سے بال بال بچا رہا ہے اب وہ اس مرحلہ میں بھی تمہارا شامل حال ہو اور تم بخیر و عافیت اپنی منزل پر واپس پہنچ جاؤ ۔" اس نے دلی ہمدردی سے اس بے گناہ شخص کی طرف دیکھا جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ دولت مند باپ کا واحد وارث تھا ۔ اور غلط آدمی اُس کے حق پر متصرف تھے ۔

" کیا کوئی اور حملہ ہونے والا ہے ؟" وہ ہنس کر پوچھنے لگا ۔

میں نے ان کی باتیں سنیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ ذاکر اپنے تینوں دوستوں کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھا ایک نیا منصوبہ بنا رہا تھا کہ تمہیں آج رات مار ڈالا جائے اور لے جا کر سمندر میں ڈالا جائے ۔ چچا کو تمہاری طرف سے ٹیلی گرام دے دیا کہ تم سیدھے اپنی یونٹ میں جا رہے ہو ۔" وہ بتا رہی تھی ۔

" تم نے کیونکر سنا ؟" سعید نے پوچھا ۔

مجھے ان کے عندیہ کا علم تو پہلے ہی تھا کہ پے بہ پے سارے حربوں کے ناکام ہونے پہ ان کا آخری حربہ زیادہ خطرناک اور فیصلہ کن ہو گا ۔ جب دفتر میں جمع ہوئے دروازہ بند کر لیا گیا تو بیشو نے مجھے خبر کی ۔ اگرچہ بعد خطرناک جرأت تھی پھر بھی ہر قیمت پر مجھے ان کے منصوبہ سے خبردار ہونا ضروری تھا ۔ دفتر کے ملحقہ لائبریری کا کمرہ چاروں طرف سے بند تھا میں اوپر کی بالکنی سے سرک کر روشندان کے ذریعہ کمرے میں داخل ہوئی خوش قسمتی سے

روشندان کے نیچے الماری رکھی ہے اس کے اوپر چڑھ کر میں آسانی سے کمرے میں اتر گئی، درمیانی دروازہ کھلا تھا میں پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئی اب وہ لوگ مجھ سے صرف چند فٹ کے فاصلہ پر بیٹھے تھے اور میں اُن کی سرگوشیوں تک کو آسانی سے سن سکتی تھی۔"

جوہر نے بیان کیا، اپنے خطرہ سے قطع نظر، سعید کے جسم میں اس تصوّر سے ہی کپکپی دوڑ گئی، کہ اگر جوہر کو وہاں دیکھ لیا جاتا تو ان درندوں کے ہاتھوں خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔

"جوہر — ! میں تمہارا بے حد احسان مند ہوں۔ مگر ایسا اندھادھند قدم اٹھانا سراسر ناعاقبت اندیشانہ فعل تھا۔ اگر تمہاری موجودگی کا ان لوگوں کو علم ہو جاتا تو یقیناً وہ کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھتے!"

سعید نے ایک رفت و گزشت خطرے کے تاثر سے سہم کر کہا تو جوہر کو ہنسی آ گئی —

چلو وہ تو جو ہوا ٹھیک ہو گیا آنے والے خطرہ کی بات کرو" وہ کہنے لگی۔

جب آمنا سامنا ہو ہی گیا تو پھر مجبوراً مجھے بھی مقابلہ کرنا ہی پڑے گا ان غاصبوں کا کہاں تک لحاظ کرتا جاؤں گا۔" سعید نے قدرے جوش میں آ کر کہا۔

" یہ غلط ہے ! سراسر خلافِ مصلحت ہے !" جوہر یک دم چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

تو پھر کیا بزدلوں کی طرح بھاگ جاؤں ؟ وہ پوچھنے لگا۔

اس وقت مصلحت یہی ہے۔ اسے بزدلی نہیں ذاتی تحفظ اور وقت کا تقاضا کہا جاتا ہے۔ یہاں کوئی شخص تمہاری صحیح شخصیت سے واقف نہیں تمہارے پاس کوئی قانونی سند اپنے دعوے کے ثبوت کے واسطے موجود نہیں ان لوگوں سے مقابلہ کے دوران اول تو ممکن نہیں کہ تم اپنی مدافعت کر کے بچ جاؤ اور اگر بالفرضِ محال بچ بھی جاؤ یا ان میں سے کسی کے جانی نقصان

کے سلسلہ میں پھنس جاؤ تو کوئی بھی تمہارے کسی جواز کو سننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔"

جوہر نے کسی قانونی مشیر کی طرح تقریر کی۔

اگر میں جانا چاہوں تو یہ لوگ مجھے جانے بھی نہیں دیتے۔ اگر ان کا یہی منصوبہ ہے تو یہ مجھے کل بھی روک لیں گے یا پھر آج ہی رات فیصلہ کن مرحلہ طے کر لینا چاہیں گے اس صورت میں، میں سوائے پیش آمدہ حالات کا مقابلہ کرنے اور ان سے دو دو ہاتھ نپٹنے کے اور کر ہی کیا سکتا ہوں — ؟"

سعید نے کہا۔

مجھے بھی تو کچھ کہنے دو کہ اس وقت سے میں نے کیا سوچا ہے؟"

جوہر کہنے لگی۔

"ہوں — ؟" سعید پوری توجہ سے اُس کی طرف دیکھنے لگا — ان نشیلی آنکھوں میں اس کی خاطر یہ گہرے تفکر کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں؟ یہ احساس ہی اس کے لئے وجہ تسکین بن گیا اُسے اپنے اوپر منڈلاتے ہوئے اس مہلک خطرہ تک کی پروا نہ رہی اور وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرانے لگا۔

"حد ہے! انسان اپنے تحفظ سے اس انتہا تک بھی غافل ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا!" جوہر نے خفگی سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ سعید ہنسنے لگا وہ جوہر کی اس خفگی سے بھی حظ اٹھا رہا تھا۔

"کیونکہ مجھے تسلی ہے کہ میری حفاظت کے لئے قدرت نے ایک فرشتے کو متعین کر دیا ہے —!" وہ آہستہ سے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"میرا ہاتھ نہ روکو۔ راستہ خطرناک ہے؟" اس نے کسماتے ہوئے کہا راستہ واقعی خطرناک تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی تنگ سڑک کہیں بلندی کی طرف اٹھ جاتی کہیں یکایک نشیب میں اتر جاتی کناروں پر بکثرت اُگے ہوئے جھاڑ جھنکار سے راستہ پٹا پڑا تھا اور ان میں

الجھتی ہوئی چھوٹی سی کار رینگتی چلی جا رہی تھی۔

چند لمحے وہ چپ چپ سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرتی رہی سعید متواتر اس کے سنجیدہ اور متفکر چہرے کو تکتا رہا۔ اس کی پیہم نگاہوں کی کشش سے متوجہ ہو کر جوہر نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

"میں اس وقت سے منتظر ہوں۔ کہ جو سوچا ہے کہو۔ مگر تم خفا ہو گئیں" سعید نے آہستہ سے اس کی طرف جھک کر کہا۔

"پہلے وعدہ کرو۔ جو کچھ میں کہوں اس پر بلا اعتراض عمل کرو گے ایسا کرنا تمہاری بہادری پر طعنہ نہیں بن سکتا۔ اپنی زندگی کو صریحاً خطرہ میں جھونکنے کا نام شجاعت اور دلاوری نہیں۔ تمہارا مقابلہ سامنے آکر للکارنے والے دشمنوں سے نہیں، بلکہ پشت پر وار کرنے والے کمینہ دشمنوں سے تمہارا سابقہ ہے اسے مصلحت سے نپٹاؤ۔"

جوہر نے پھر سمجھایا۔ اُسے خدشہ تھا کہ مبادا وہ اس کی پیش کی ہوئی تجویز کو مسترد کر دے۔

"بس مجھ سے کوئی حرکت نہ ہو کہ میں تمہاری نظروں سے گر جاؤں اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں کہ کوئی میرے کس فعل پر کیا اعتراض کرتا ہے۔"

"تمہیں مجھ پر پورا اعتماد ہے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"خود اپنی ذات سے بھی زیادہ!" سعید نے آہستہ آواز مگر پرجوش لہجہ میں جواب دیا، وہ مسکرا دی۔

"جو تجویز میں پیش کروں اس پر بلا عذر عمل کرو گے؟"

"یک دم — !" سعید نے وعدہ کر لیا۔

"شکریہ!" جوہر نے اپنے خوشنما سر کو ذرا سا خم کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت سمجھوں کہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی قدم اٹھاتے ہوئے میں تمہارے شکریہ کا مستحق ہوں؟" وہ جذبات کی زد میں آ گیا۔

"ہم ایک دوسرے کے خیالات سے ناواقف نہیں ہیں سعید! اور اس

وقت ہمیں جذبات میں بہہ جانے کی بجائے ٹھوس حقائق کو اپنی گفتگو کا موضوع بنانا ہے" جوہر نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا ہمارے یہ خیالات بھی بجائے خود ٹھوس حقیقت نہیں ہیں؟ کیا انہیں محض وقتی جذبات کہنا چاہیئے!" سعید نے شاکیانہ لہجہ اختیار کر لیا۔

"یہ کس نے کہا۔ کہ محض وقتی جذبات ہیں؟" وہ مسکرا کر متوجہ ہوئی۔

"تم جو انہیں ٹھوس حقیقت ماننے کو تیار نہیں ہو!" سعید نے اسی انداز سے کہا۔

"میں نے تو کوئی بھی ایسی بات نہیں کہی جو اس حقیقت کی تردید کرتی ہو — !" جوہر نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر تمہیں میری تسلی کے لئے صرف چند کلمے کہہ دینے میں کیوں تامل ہے؟" سعید کہہ رہا تھا۔

"کیا کہلوانا چاہتے ہو مجھ سے؟ کیا وہ اس سے بھی اہم بات ہے جو میں کہنے کو تھی؟" جوہر نے کہا۔

"ہاں — ! خود میری زندگی سے زیادہ اہم! صرف ایک لفظ میں اس کا اقرار کر لو کہ تم مجھے چاہتی ہو۔ اس کے بعد میں آنکھیں بند کر کے تمہارے حکم پہ سر جھکا دوں گا۔" سعید نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا وہ ہنسنے لگی۔

"یوں کہو کہ لفظی اقرار چاہتے ہو۔ ورنہ سچ کہو کہ کیا اپنے دل میں تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو کہ میں تمہیں چاہتی ہوں — ؟" جوہر نے بغیر کسی بناوٹ جھجک کے ہنستے ہوئے کہہ دیا۔

"جوہر — ،" وہ التجائی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جوہر نے قطع کلام کر کے جلدی سے کہا۔

"اب اپنے وعدہ کے موجب میری بات سنو!"

"کہو — !" سعید نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ جوہر سنجیدہ تھی مگر وہ ابھی

تک اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا تھا۔ اب وہ ساحل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جو "نگمم" سے کوئی آٹھ میل کے فاصلہ پر تھا۔

"واپسی پر میں اس کار کو اسی جگہ کھڑی کر دوں گی جہاں یہ تم نے چلتے وقت دیکھی تھی۔ گھر چل کر ایک بار ماں جی کو جھلک دکھا دینا کہ انہیں تسلی ہو جائے کہ تم گھر میں موجود ہو۔ جب وہ کھانے وغیرہ کے اہتمام کے لیے باورچی خانہ میں چلی جائیں تو تم احتیاط کے ساتھ نکل کر اسی طرف آ جانا اس وقت میں تمہیں راستہ دکھانے اور کشتی کا انتظام کرنے آئی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے تم یہاں پہنچ جانا ایک شکاری کشتی مقررہ مقام پر تیار ملے گی اس میں بیٹھ کر شہر پہنچ جانا، شام کو آٹھ بجے طیارہ پرواز کرتا ہے۔ میں ٹیلیفون پر تمہاری سیٹ بک کرا چکی ہوں۔" جوہر نے اپنی تقریر ختم کر کے سعید کی طرف دیکھا، جو روانگی کے لمحوں کو توقع سے زیادہ قریب پا کر نمایاں طور پر اداس ہو گیا تھا۔

"ہوں!" اس نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کچھ ایسے لاتعلق جیسے انداز میں کہا جیسے یہ سب باتیں اُس کے نہیں کسی اور "متعلق" ہو رہی تھیں۔

"کیا سوچنے لگے ___ ؟" جوہر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ___ لیکن ہماری اس وقت غیر حاضری کا گھر والوں کو علم نہ ہو گیا ہوگا کیا ___ ؟" سعید پوچھنے لگا۔

"ماں جی بھی اُن لوگوں کے ساتھ شہر گئی ہیں۔ ان کی کوئی ملنے والی آج ہم لوگوں پر احسان کر کے بیمار ہو گئی ہے اس کی عیادت کو گئی ہیں۔ ذاکر اور اس کے ساتھی رات نو دس بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ ماں جی کو نیل کنیٹھ جیپ میں پہلے چھوڑ جائے گا۔" جوہر نے بتایا۔

اگر ماں جی کو میری غیر حاضری کا پتہ چل گیا تو گھر میں کوئی نہ ہوگا۔ کہ وہ تعاقب میں بھیج سکیں۔" سعید نے تسلی سے کہا۔

انہیں پتہ چلنا ہی نہیں چاہیئے ___ کھانے کے وقت میں عذر کر دوں گی کہ تمہاری طبیعت خراب ہے اور تم کہتے ہو کہ ذاکر وغیرہ کے ساتھ ہی کھانا کھاؤ گے۔ اس طرح تمہاری غیر موجودگی کم از کم نو بجے تک درپردہ

رہ سکے گی۔ اور اُس وقت سے پہلے ہی تم پرواز کر چکے ہو گے۔" جوہر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اور جو اتفاق سے کہیں شہر میں ذاکر وغیرہ سے سامنا ہو گیا۔؟ سعید نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اس کا امکان بہت کم ہے، ڈاکٹر راشد کی کار ساحل پر تمہاری منتظر ہو گی تم بحفاظت ایئرپورٹ پہنچ جاؤ گے اور ایئرپورٹ پر اُن لوگوں کا موجود ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگر بالفرض محال ایسا ہو تو تم بلا توقف پولیس کو رپورٹ کر دینا کہ ان لوگوں نے تمہیں اتنے دن حبس بیجا میں رکھا ہے اور تمہیں ان سے جان کا خطرہ ہے۔ پھر جو ہو سو ہو! ہاں سچ اتنا ضرور کرنا ایئرپورٹ پر پہنچ کر مجھے ٹیلیفون کے ذریعہ اپنی خیریت سے آگاہ کر دینا۔"

جوہر نے یک دم کچھ یاد آ جانے سے "تاکیداً" کہا۔ اتنے ہی میں وہ ساحل پر پہنچ گئے۔ جوہر نے کار ایک طرف کر کے روک دی اور وہ اتر کر سمندر کی طرف چلے۔

چند لمحے وہ پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ سعید کے دل میں جیسے طوفان مچل رہا تھا۔ غم اور مسرت کے متضاد جذبات بیک وقت اُس کے دل میں موجود تھے اور وہ ان کی کش مکش میں مبتلا تھا جوہر جیسی عدیم المثال دوشیزہ کی بے پایاں محبت پاکر وہ وفورِ مسرت سے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایک غیر معین مدت کے لئے اس سے جدائی اور فوری جدائی کے خیال سے اس کے دل پر غم واندوہ کی مایوس کن گھٹائیں چھا جاتیں۔

جوہر ۔۔۔! "اس نے محبت اور احسان مندی سے لبریز نگاہیں اس عالی ظرف اور عالی دماغ حسینہ کی طرف اُٹھائیں جو سفید کریپ کی ساڑھی اور سفید بروکیڈ کی نیم آستین جیکٹ میں ایسی حسین اور پرکشش معلوم ہو رہی تھی جیسے ہزاروں بناؤ اس پر نچھاور ہو رہے ہوں وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر بیساختہ مسکرا دی۔

شکریہ وغیرہ جیسا کوئی لفظ کہہ کر اس وقت میری طبیعت کو منغض نہ

"۔ یہ بیگانہ جیسے لفظ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ایک نہیں رہیں!"
نے بےساختگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ کتنی بے کراں کتنی بے تصنع تھی اس کی محبت! جسے وہ اتنی سادگی کے ساتھ ظاہر کر رہی تھی! جس طرح اس کی اپنی شخصیت ہر بناوٹ سے بالاتر تھی اسی طرح اس کے پاکیزہ اور الوہی جذبہ میں بھی کسی قسم کی لاگ لپیٹ نہ تھی اور سعید کا دل فخر سے لبریز ہو گیا —

"تمہارا شکریہ نہ سہی لیکن اس خالق اکبر کا شکرانہ ادا کرنے سے میں کبھی غافل نہ رہوں گا جس نے مجھے تم جیسا گوہر مراد بخشا۔"

سعید اس کا ہاتھ دبا کر انتہائی عقیدت مندی سے کہہ رہا تھا کہ وہ ہنسنے لگی۔

"نہ — ! کم از کم اس معاملہ میں تو شکرانہ بھی ادا نہ کرنا۔ ! کہتے ہیں کسی نعمت پر شکر کرو تو اللہ میاں ویسی ہی کئی نعمتیں بخش دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسا نہ ہو کہ ایسے ہی گوہر ہائے مراد کا تانتا ہی بندھ جائے — !" وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگی۔

"جوہر! میری روح! کتنی پیاری ہو تو — ! ایسی دلکش، اتنی خوش ذوق اس قدر بامذاق اور خوش طبع۔ تمہیں پا کر میں جتنا بھی اللہ کا شکر کروں کم ہے۔"

وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامے اس کے روبرو کھڑا تھا۔

"اچھا تو ضرور شکر کیا کرو — ! کیونکہ اللہ میاں کی یہ بھی تو عادت ہے نا کہ کسی نعمت پر ان کا شکر ادا نہ کیا جائے تو کفران نعمت کی فرد جرم لگا کر وہ اس نعمت کو اپنے بندے سے چھین بھی لیا کرتے ہیں۔"

وہ دانشمند لڑکی اس وقت وفور محبت میں کتنے دلکش بھولپن سے باتیں کر رہی تھی جیسے کوئی کم سمجھ سی بچی ہو!

"خدا نہ کرے — ! کیسی باتیں کرتی ہو جوہر! مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے کبھی نہیں چھینے گا۔ ہماری عارضی جدائی کے لمحے جلد ختم

ہو جائینگے اور ہم بہت جلد ہمیشہ کے لئے مل جائیں گے ۔ کہو انشاءاللہ سعید کہنے لگا ۔

" انشاء اللہ ! جوہر نے سعید کے کہنے پر دہرایا اور اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ۔ چٹان پر سے نیچے اترنے لگی ۔ ساحل پر کئی، بادبانی کشتیاں موجود تھیں ۔ اس نے اشارہ سے ایک ملاح کو بلایا اور اس سے ضروری معاملہ طے کر کے اُسے اُجرت میں سے آدھی رقم پیشگی ادا کردی ۔

" جب تک ، صاحب آئیں تم کشتی لئے یہیں ٹھہرے رہو گے رات بھر کے لئے یہ کشتی ہماری ہے ! سمجھے ؟ " جوہر نے تحکمانہ انداز میں کہا ۔

" جی آں ۔ جی آں ! " ملاح نے سر ہلاتے ہوئے پُر زور تائید کی اور وعدہ کیا کہ ضرورت ہوئی تو وہ رات بھر یہیں انتظار کرتا رہے گا ۔

اب وہ قدم برداشتہ واپس لوٹے اور کار میں بیٹھ گئے سعید اداس اور خاموش تھا ۔ جوہر نے دزدیدہ نظر سے بار بار اس کی طرف دیکھا وہ اسے اضمحلال کے اس ناخوش گوار موڈ سے باہر لانا چاہتی تھی، اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا ۔ کوئی لطیف سی رقص کی دھن بج رہی تھی ۔

میرے ساتھ کی ایک لڑکی ہے ثمری ، وہ اس دھن پر نہایت پیارا رقص کرتی ہے ۔ " جوہر نے کہا ۔

" ہوں ۔ اچھا ! " سعید نے چونک کر جوہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا وہ مسکرا دی ۔

میرے جانے کے بعد اُداس تو نہ ہو گی جوہر ؟ " سعید نے اچانک سوال کیا ۔

" اداس تو بیں ضرور ہوں گی اور اب شاید اکثر اداس رہا کروں گی ۔ مگر تمہارا خطرہ سے نکل جانا اور تمہاری سلامتی میرے لئے ہمیشہ وجہ تسلی رہے گی ۔ "

اس نے یک دم براہ راست انداز میں جواب دیا۔
"کہیں یہ لوگ میرے فرار کے لئے تمہیں الزام نہ دیں؟"
سعید نے خدشہ ظاہر کیا۔
"جیسا موقعہ ہو گا دیکھ لیا جائے گا تم ان باتوں کے لئے کیوں پریشان ہوتے ہو۔ پھر کل دوپہر ہی تو میں واپس جا رہی ہوں، ویسے بھی یہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" کہنے لگی۔
"بیچاری بیشو پر تو ماں جی کو میری مدافعت کا صریح شبہ ہے اس کی ضرور شامت آئے گی۔ بہت اچھی لڑکی ہے اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔" سعید کہنے لگا۔
"بیشو کو اس دفعہ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی" جوہر کہنے لگی۔
"اگر ایسا کرو تو غریب کو بہت بڑے عذاب سے نجات دلوانے کا عظیم ثواب ملے گا۔" سعید نے کہا۔
بہت بہتر حضرت مولانا! میں یہ ثواب تو ضرور ہی حاصل کروں گی!"
جوہر نے ہنس کر کہا۔ اس کے شفاف دانت موتیوں کی ہموار لڑی کی مانند چمک رہے تھے۔ سعید اس کی طرف جھکا
دیکھو مجھے احتیاط سے کار چلانے دو ایسا نہ ہو میرا ہاتھ بہک جائے۔"
وہ سمٹ کر پہلو بچاتے ہوئے بولی۔ اور سعید کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔
"تم ڈرائیو کرتے کرتے تھک گئی ہو گی۔ میں بھی کیسا احمق ہوں کہ خیال ہی نہیں کیا۔ لو مجھے جگہ بدل لو اب میں چلاتا ہوں۔" سعید نے کہا۔
نہیں! تمہارا زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں۔ تم کیسے کار چلا سکتے ہو۔"
وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

تم تھک گئی ہو گی ۔" سعید نے کہا ۔

" میں اتنی نازک ہوں نہ ایسی تن آسان ۔" اس نے مسکرا کر سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ ریڈیو پر لاہور سے پرانے گانے براڈکاسٹ ہو رہے تھے ۔ دونوں کا دھیان اس طرف ہو گیا ۔ پرانے فن کاروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی ۔

کملا جھریا کی پُرسوز آواز نے دونوں کو سحر زدہ سا کر دیا ۔ وہ گا رہی تھی ۔

اے دل تو اس گلی میں پامالِ ناز ہو جا
قدموں پہ سر رکھ کر تو سرفراز ہو جا
اے دل ! تو رفتہ رفتہ آگاہ راز ہو جا
آئینہ پہلے بن کر آئینہ ساز ہو جا
وہ تیرے دیکھنے کی آنکھیں یہاں کہاں ہیں
اے جلوۂ حقیقت رنگ مجاز ہو جا
سُن گوش جاں سے سرمد یہ داستان دل
دَرد جگر سے تو بھی آگاہ راز ہو جا

" واہ وا ! کیسا کمال گاتی ہے یہ عورت "

سعید نے خوش ہو کر داد دی اور جوہرا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی ۔

" تم بھی موسیقی کا خاصا ذوق رکھتے ہو ۔" وہ کہنے لگی ۔

" مجھے تو جنون ہے موسیقی کا ! وہ کہنے لگا ۔

" ہوں ؟" اور وہ خندہ روئی سے ہنس دی ، اتنے ہی میں فضا میں زہرہ بائی آگرہ والی کی آواز نے سحر بکھیر دیا ۔

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے مے خانے سے
جھک کے کچھ بات کہی شیشے نے پیمانے سے
ہم نے دیکھی ہے کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ

ملتی جلتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانے سے
آپ آجائیں تو دلِ مضطر کو قرار آجائے
دل بیتاب بہلتا نہیں سہلانے سے

اُف کتنا سوز کتنی موسیقیت ہے اس کی آواز میں، ایسی آوازیں اب تو سُننے کو نہیں ملتیں —" سعید کہنے لگا۔

" ہمارے ملک کا اصل فنِ موسیقی تو انہیں لوگوں کے دَور پر ختم ہو گیا دورِ حاضرہ کی موسیقی تو مغربی اور مشرقی فن کی مخلوط اور مسخ شدہ صورت ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر بعض فلمی گیتوں کی دوغلی دھنیں سن کر اس قدر الجھن ہوتی ہے کہ بس کیا کہیے ——— طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔"

جوہر کہہ رہی اور سعید دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

" تمہاری باتوں سے ظاہر ہوا کہ تمہیں بھی اس فن سے خاصا شغف ہے۔ مگر مجھے تم سے شکایت ہے کہ تم نے مجھے ایک بار بھی گا کر نہیں سنایا۔"

سعید روٹھنے کے انداز سے بولا تو جوہر بے اختیار ہنس دی۔

جس کسی کو موسیقی سے دلچسپی ہو ضروری تو نہیں کہ وہ خود بھی گا سکے۔" وہ ہنس کر کہنے لگی۔

" سچ کہو کیا تم نہیں گا سکتیں؟" سعید نے پوچھا۔

" کچھ یونہی سا — !" وہ ہنس کر بولی۔

" تو سناؤ پھر — ؟" وہ اصرار کر کے کہنے لگا۔

" کسی موزوں موقعہ پر تمہاری یہ فرمائش ضرور پوری کروں گی، اب تو منزل آگئی ——— اور وہ اس دوراہے پر آن پہنچے جہاں جوہر کی تجویز کے موجب انہیں کار کو گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا دینا تھا۔

جوہر نے گاڑی روک لی۔ اور اُسے ایک طرف ٹھہرا کر وہ اتر کر پیدل گھر کی طرف چلے آئے۔

شکر ہے ماں جی ابھی واپس نہیں آئیں۔" راستہ میں جوہر کہنے لگی۔
"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا — ؟" سعید نے پوچھا۔
اسطرف آئینوالی سڑک پر جیپ کے وآئیں آنیکا دوسرا نشان نظر نہیں آیا۔
اس نے جواب دیا۔
"خوب — !"
"یعنی — ! سراغرسانی میں بھی اچھی خاصی دستگاہ ہے تمہیں ؟"
سعید ہنس کر کہنے لگا۔
تمہیں ابھی میرے قیاس کی تصدیق ہو جائے گی، وہ سامنے ہی سی بیشو چلی آ رہی ہے" جوہر نے کہا اور بیشو نے بتایا کہ واقعی ابھی تک ماں جی واپس نہیں آئیں۔
اور چند منٹ بعد جب ماں جی آئیں تو سعید اور جوہر باغیچہ میں چائے پی رہے تھے۔ وہ ہنسی خوشی باتیں کرتی ہوئی ان کے ساتھ ہو گئیں۔

(۱۰)

اپنے وعدہ کے خلاف جوہر نے کوئی خط نہ لکھا تو سعید اپنی یونٹ میں واپس چلا گیا۔ اس کی طبیعت بے حد بدمزہ تھی، دل اچاٹ تھا اگر اس کے اختیار کی بات ہوتی تو وہ ملازمت پر جانے سے انکار کر دیتا مگر اب تو اسے مرگِ مفاجات سے مفر نہ تھا۔ جعفر رضا نے قانونی چارہ جوئی کے لئے قانونی مشیروں کی طرف رجوع کیا اور سعید ملازمت پر روانہ ہو گیا۔

منزلِ مقصود پر پہنچ کر سعید نے کراچی ائر پورٹ پر کئی خط فراموشکار جوہر کو لکھے مگر کسی کا بھی جواب نہ آیا۔ آخر اس نے محکمہ کے ایڈمنسٹریٹر کو لکھا کہ جوہر کے متعلق اُسے اطلاع دی جائے، تو اس کی درخواست کا جواب آیا کہ ائیر ہوسٹس جوہر نے شادی کے لئے طویل رخصت لی ہے یہ خبر پا کر سعید کی تو جیسے دنیا ہی زیروزبر ہو گئی۔ اُسے اپنی زندگی یوں بے معنی و بے مقصد سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے دنیا میں اس کی ساری جدوجہد ختم ہو چکی ہو۔ وہ گم سم ہو کر رہ گیا، اُسے اپنے حواس پر قابو نہ رہا۔ اتنی بڑی یونٹ کے ذمہ دار میڈیکل آفیسر کو خود اپنی اہلیت اور کارکردگی پر بھروسہ نہ رہا وہ خود اعتمادی کھو بیٹھا افسران بالا نے اس کے فرائض میں

بہت کچھ رعائتیں دے کر اُسے سیر و تفریح کا مشورہ دیا۔

ایک نوجوان لفٹیننٹ اصغر اس کا بے حد ہمدرد دوست تھا۔ فرصت کے اوقات ہمیشہ سعید کے پاس گزارتا اور اپنی خوش طبعی سے اس کا دل بہلاتا رہتا۔ سعید کو اعتراف تھا کہ اگر اصغر نہ ہوتا تو وہ اپنی موجودہ کیفیت سے متاثر ہو کر یقیناً کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھتا۔ ہمدرد اور مخلص دوست بھی اللہ پاک کی بخشی ہوئی نعمتوں میں سے ایک قابل قدر نعمت ہے۔

اس دنیائے دوں میں جس خوش بخت کو یہ نعمت میسر آجائے اُسے خدائے بخشندہ کا شکرانۂ نعمت ادا کرنا چاہیئے۔ اس آشوب زمانہ میں۔ قحط الرجال کے اس مادیت پرست دور میں آپ زندگی کے ہر موڑ پر ابن الوقت اور غرض کے بندوں سے دو چار ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر گندم نما جو فروش احباب سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ نام نہاد دوستوں سے زک اٹھاتے ہیں۔

آپ کا خلوص اور اعتماد بار بار ٹھیسیں کھا کر متزلزل ہو جاتا ہے آئینۂ دل میں اس مسلسل ٹھیس سے ایسا بال آجاتا ہے کہ پھر دل کے ان دو نیم ٹکڑوں میں ہر شخص کا کردار آپ کو دو رخ لیئے ہوئے نظر آنے لگتا ہے۔ آپ کسی پر بہت ہی کم اعتماد کر سکتے ہیں۔ ہر شخص کے خلوص کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

یہی حال سعید کا تھا۔ اصغر کو اس سے بحد انس اور ہمدردی تھی مگر وہ اس پر پورا اعتماد نہیں رکھتا تھا۔ ابتداء میں اس کے بارہا استفسار پر بھی سعید نے اسے اپنے راز دل میں شریک نہ کیا۔ حالانکہ اصغر بیچارا اسے اپنے سارے حالات سنا چکا تھا۔

مگر سعید کے دل میں ایک ہی بات نقش ہو کر رہ گئی۔ کہ دنیا میں کوئی شخص بھی قابل اعتبار نہیں۔ کون کیا ہے؟ کچھ خبر نہیں۔ کون کس وقت بدل جائے کوئی بھروسہ نہیں۔ جس شخص کو وہ مدتوں اپنا باپ سمجھتا رہا وہ اس کا باپ نہ تھا۔ جس شخص کو اس نے اپنا بھائی سمجھا اور وہ اس کا بھائی ثابت نہ ہوا۔

بلکہ وہ ایک مستقل بھروپیا ہے جو اس کا مثنیٰ بن کر، خود اس کی شخصیت کا روپ دھار کر دنیا کے سٹیج پر اس کا کردار ادا کر رہا ہے۔ جس نے محض دولت کے لئے اتنے بڑے دھوکے کا جال پھیلایا ہوا ہے۔ جس نے اس دولت پر قابض رہنے کے لئے اس کی زندگی پر کئی حملے کئے —— پھر جوہر؟ اپنے اس خلوص، اس ہمدردی اُس کی محبت کے باوصف کیا وہ بھی اُسے دھوکہ ہی دیتی رہی —؟

کیا اُس کی وہ ساری نوازشیں، تمام دلنوازیاں محض اس کے منظر سے غائب ہو جانے تک محدود تھیں؟ اس کے وہاں سے نکلتے ہی وہ یکدم اسے بھول گئی؟ ایک خط تک نہ لکھا اور اب فخر سے اس کی شادی ہو چکی ہو گی وہ طویل رخصت لے کر اپنے شوہر کے ساتھ ماہ عسل منانے چلی گئی ہو گی ——

ایسے ہی اضطراب انگیز خیالوں میں اُلجھے اُلجھے سعید نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گیا۔ اصغر نے ایک دن اُس کے سرہانے ایک حسین لڑکی کی تصویر پڑی ہوئی دیکھ لی تو اس کے شبہات کی تصدیق ہو گئی کہ سعید کی پریشانیوں کا منبع یہی لڑکی ہے۔ اس نے وہ تصویر اڑا لی اور اس وقت واپس دی کہ اس کے عوض سعید سے سارا راز اگلوا لیا۔ ایک سرمائی شام کو وہ اپنے کیمپ میں مضمحل اور نیم مردہ سا کرسی پر پڑا تھا کہ نرگس کے تازہ پھولوں کا گلدستہ لئے ہوئے اصغر داخل ہوا۔

”سعید! بس اُٹھ کر ایک منٹ میں تیار ہو جاؤ! وہ پھولوں کو ایک گلاس میں پانی ڈال کر رکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں —؟ کہاں جاؤں تیار ہو کر؟“

سعید بیزار ہو کر پوچھنے لگا۔

”قریب ہی قصبہ میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہے —“

”شش —“ سعید نے بیزاری سے گردن جھٹک کر اس کی بات کو رد کر دیا۔

ارے بھئی بات تو سن لو — تم تو آدھے ہی راستے انسان کی زبان کاٹ

لیتے ہو۔"

اصغر نے شکایت کی۔ سعید چپ رہا

ارے بھئی کہتے ہیں کہ کوئی غضب کی رقاصہ ہے اس کمپنی کی حسین اور پرفن جو لڑکے دیکھ کر آئے ہیں بس یہ سمجھ لو کہ مرے ہی جا رہے ہیں اس کے لئے۔

اصغر ترغیب دینے کے انداز میں کہتا رہا تھا

گویا رقاصہ کیا ہوئی کہ "برین گن" ہو گئی جس نے چھوٹتے ہی بس کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ اب تمہاری بھی اجل سر پر منڈلا رہی ہے کہ اس کی زد میں خود بخود چلے ——— نا بھائی میں تو ابھی کچھ دن اور جینا چاہتا ہوں۔"

سعید انکار کے اشارہ میں ہاتھ ہلا کر کہنے لگا۔ لہجہ بدستور سنجیدہ اور بیزار تھا مگر اصغر ہنسنے لگا۔

جینا چاہتے ہو؟ حالانکہ صبح ہی کہہ رہے تھے کہ زندگی سے جی بھر گیا عجب متضاد حالتیں وارد ہوتی ہیں تم پر بھی ——— !" اصغر حیرت سے کہنے لگا۔

آخر چاہتے کیا ہو ——— ؟" وہ تنک کر پوچھنے لگا۔

" یہی چاہتا تھا کہ اتنے جو عاجز ہو زندگی سے تو شاید اسی طرح مر سکو۔!"

وہ اس قدر سنجیدگی سے کہنے لگا کہ سعید کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

اور مصیبتیں ہی کیا کم تھیں کہ ایک تم جیسے مردود سے پالا پڑا۔!"

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ اصغر کے سنجیدہ چہرے پر اب تو گویا غم و اندوہ جھلکنے لگا۔

" اچھا؟ اتنے ہی تنگ ہو مجھ سے؟ بس ایک آج کا دن میری بات مان لو اور وہ وعدہ لے لو کہ پھر جو کبھی تمہیں صورت بھی دکھاؤں ——— !

چلو اٹھو!"

اصغر کہنے لگا۔ سعید خوب جانتا تھا کہ وہ اپنی ضد ہر طور منوا کر چھوڑے

گا۔

پھر تو سستے ہی چھوٹے! اتنی سی تکلیف اُٹھانے سے اگر اتنی بڑی زحمت سے چھٹکارا مل جائے تو از یں چہ بہتر۔

سعید ہنستے ہوئے اپنی نشست سے اُٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

فوجی کیمپ سے کوئی پانچ میل کے فاصلہ پر یہ چھوٹا سا پر فضا قصبہ فوجی نوجوانوں کے لیے "ممنوعہ علاقہ" نہ تھا اور اپنے کمپنی کمانڈر سے پاس حاصل کر کے وہاں جا سکتے تھے۔ اس شام کئی افسروں اور سپاہیوں نے تھیٹر دیکھنے کے لئے اجازت حاصل کی۔

اصغر اور سعید اپنی جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ یہ لوگ اتنی عجلت کے باوجود دیر سے پہنچے تمام سیٹیں رک گئی تھیں، سامنے کی قطاروں میں، معززین حاضرین کے لئے عارضی نشستیں لگائی جا چکی تھیں کہیں پانچویں چھٹی قطار میں اصغر اور سعید کے واسطے بھی دو چھوٹی کرسیاں رکھ دی گئیں، بے آرام ہونے کی وجہ سے سعید بڑبڑایا۔

لعنت ہے ایسی گھٹیا تفریح پر۔! یہ کرسیاں بھی نہ مل سکتیں تو میرا خیال ہے تم سٹول پر بیٹھنے کو تیار ہو جاتے۔"

تو اس میں کیا ہرج ہو جاتا۔؟" اصغر حیران ہو کر پوچھنے لگا:

تم بندر کی طرح ڈگڈگی پر ٹنگ کر لوگوں کے لئے الٹا خود تماشہ بن جاتے اور کیا ہو جاتا؟ سعید نے بیزاری سے کہا۔ اصغر نے قہقہہ لگایا۔

بھئی آفرین ہے! محرم کی پیدائش ہو تو ایسا ہو کہ بس پل بھر کو بھی چہرے پر ہنسی خوشی کے آثار نظر نہ آئیں!

وہ ہنس کر اتنی بلند آواز میں بولا جیسے وہاں ان دونوں کے سوا تیسرا سننے والا موجود ہی نہ ہو۔ ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے لوگ متوجہ ہوئے تو جھینپ کر زیر لب بڑبڑایا:

"عجب واہیات ہو! موقع محل تو دیکھ کر بات کیا کرو۔"

"کیوں؟ کیا بے محل بات کہی میں نے۔؟ اوہ! مگر دوسروں کو

ہماری گفتگو سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ؟

اس نے سعید کے تہدید آمیز اشارہ سے یک دم بات پلٹ دی سعید کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ قریب کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے پیش کئے جانے والے ڈرامہ پر تبصرہ شروع کر دیا۔

نی زمانہ ہمارے نوجوانوں کو ایسے دلولہ انگیز اور پُرجوش سٹیج ڈرامہ کی ضرورت ہے جو ان کی قومی حمیت ہی کو جھنجھوڑ دے، جس سے ان کے شعور میں سوئی ہوئی حب وطن جاگ اٹھے، وہ قومی مفادات پر شخصی اور ذاتی مفاد کو قربان کرنا سیکھ لیں۔"

" اچھا تو یہ کوئی اصلاحی ڈرامہ ہے ؟"

اس کے مخاطب نے یوں بے دلی سے پوچھا جیسے وہ اصلاحی ڈرامہ دیکھنے کو تیار نہیں۔

اجی نہیں ایک دم ایسا بھی براہ راست اصلاحی نہیں کہ آپ جیسے رنگین مزاجوں کے لئے قابل قبول ہی نہ ہو۔ ایک نوجوان مجاہد کی کہانی دکھائی گئی ہے جس نے محبت کو فرض پر قربان کر دیا۔ ذاتی اور شخصی مسرتوں کو قوم کے مفاد کی نذر کر ڈالا ——!" پہلے شخص نے اپنے اُسی جوش ستائش کے ساتھ کہا۔

" ہوں۔؟" تو پھر اس نام کا کیا مطلب ہوا کہ "نئی کرن پھوٹی ؟" اگر یہ ایسا المیہ ہے کہ جس میں مرکزی کردار نے اپنا سب کچھ قربان ہی کر دیا تو اس کی کہانی کا نام تو ہونا چاہیے تھا آخری کرن ڈوبی !"

دوسرا آدمی کہنے لگا۔ پہلے نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

آپ کو خوب سوجھی! مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص کے انفرادی آفتاب حیات کی آخری کرن ڈوبنے کے بعد اس کی تحریک یعنی اُس کے مقصد حیات کے طلوع تازہ کی نئی کرن پھوٹی !"

پہلے آدمی نے اپنے ساتھی کو اسی پُر زور انداز سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

" ہوں! اچھا تو یہ بات تھی —— ؟ میں نے سمجھا کہ یہ جس رقاصہ کی دھوم

ہے اس کی طرف منسوب ہوگا یہ نام — !

دوسرے آدمی نے بدستور بد دلی کے لہجہ میں کہا۔ اُس کے ساتھی کی باتیں اس کے ذہن پر ذرا بھی اثر انداز نہ ہوئی تھیں۔

براین عقل و دانش بباید گریست !

اصغر نے زیر لب کہا۔

"تم کبھی چپ نہیں رہ سکتے — مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اب تک کیونکر خاموشی سے سن رہے ہو اور بیچ میں بول نہیں پڑتے ؟" سعید نے دھیمی مگر ڈانٹنے کی آواز میں کہا۔

"کرن کیا ؟ وہ تو بجائے خود بجلی ہے بجلی !"

پہلے آدمی نے یک دم اپنے ذوقِ رنگین طبعیٔ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا —

"ارے اچھا — ؟"

دوسرے کے مرجھائے ہوئے شوق میں جان سی آگئی جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا — !

"بخدا ہے !" پہلے نے یقین دلایا۔

وقت تو ہو گیا اب یہ لوگ شروع کیوں نہیں کرتے — ؟"

وہ بے صبری سے بولا اور ساتھ ہی ہجوم نے بھی بے صبری کا مظاہرہ شروع کیا۔ اتنے ہی میں تھیٹر کے مینیجر نے سٹیج پر آکر سامعین کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی پردہ اُٹھا —

کنارِ آب اور شب ماہتاب کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ پر سکون نیلگوں سطحِ آب پر جا بجا شگفتہ کنول سر اٹھائے کھڑے تھے۔ پورے چاند کا عکس جھیل کے نیلگوں پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی موجیں اُٹھ رہی تھیں اور چاند ان کے دامن میں جھول رہا تھا۔

معاً فضا میں ایک پر کیف نغمہ اُبھرا جس کی سحر کار آواز حواس پر چھا گئی ہوا تیز ہو گئی۔ کہ لہریں بھی متلاطم ہوئیں اور کنول سطحِ آب پر مستانہ وار جھومنے لگے۔

متلاطم موجوں کے مدو جزر سے نیلگوں پانی پر کف ابھرنے لگے۔ سفید اور لطیف جھاگ کے ایک تودے کے سینہ کو چاک کر کے پہلے دو مرمریں بازو نمودار ہوئے پھر ایک ہیولے ظاہر ہوا۔ جو تیرتا ہوا تودہ کف سے باہر نکل آیا۔ یہ ایک عظیم مچھلی تھی۔ جس کے سفید مخملی جسم پر روپہلی سیب چمک رہے تھے وہ نغمہ کی دھن پر حرکت کرتی دونوں بازوؤں کو جنبش دے کر تیرتی ہوئی کنار آب پہنچی اور ایک چھپاکے سے جست کر کے خشکی پر نکل آئی پھر ایک دلآویز اور مترنم جھٹکے کے ساتھ وہ دم کے بل کھڑی ہوگئی اور اپنے جسم کے بالائی حصہ کو اس طرح جنبش دی کہ نقرئی سیب چھنا چھن جھڑ گئے۔ سفید جھلی کو چاک کر کے اس نے اپنا اوپر کا حصہ آزاد کر لیا۔ اب یہ ایک جل پری تھی جس کا جسم نصف انسانی اور نصف مچھلی کا تھا۔ کیف آگیں نغمے مچل رہے تھے۔ اور ان کی دھن پر وہ اپنے زیریں جسم کو اس طرح بے قراری اور اضطراب کے انداز میں حرکت دے رہی تھی جیسے اس کرب ناک بندش سے آزاد ہونے کی جد و جہد کر رہی ہو۔

"دیکھا کتنی حسین عورت ہے؟" اصغر نے سعید کے کندھے پر جھک کر سرگوشی کی مگر سعید کا انہماک نہ ٹوٹا وہ سانس روکے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا اس نے اصغر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اصغر نے اس کی محویت کا اندازہ کر کے کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"بس ۔۔۔؟ کیا کہنا چاہیے کہ "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد؟"

مگر وہ تو جیسے سکتہ کے عالم میں تھا۔ منہ کھولے حیرت سے ایک ہی ٹک رقاصہ کے چہرے کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کا اپنا چہرہ اصغر کو اس قدر سفید اور ہراساں دکھائی دیا کہ وہ مذاق بھول کر یک دم متفکر ہوگیا اور سعید کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"سعید! خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت تو اچھی ہے؟"

"اصغر! یہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت ہے؟"

اس نے سینہ میں گھٹی ہوئی آواز سے کہا اور اس کی گرفت اصغر کے

ہاتھ پر اس قدر سخت ہو گئی - کہ اس نے کلبلا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا -

" ہاں ہاں — حقیقت ہے ! ایک دم حقیقت !"

" آہ ! پھر یہ کیا قیامت ہے ؟ سعید نے زیر لب کہا -

قیامت ہے ! میں نے تو تم سے پہلے ہی نہ کہہ دیا تھا کہ سراسر فتنۂ محشر ہے - مگر میرے دوست مجھے اتنی تسلی تھی کہ تمہارا دل پہلے ہی محفوظ و مخصوص ہو چکا ہے - اب کیا خبر تھی کہ ایک جھلک دیکھتے ہی ماضی خواب و خیال ہو جائے گا اور یکا یک ادھر لوٹ پڑو گے ؟" اصغر نے سنجیدگی سے کہا -

" کیا بکتے ہو — ؟" سعید جھنجھلا کر بولا -

" بس محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جاتی ہے ؟" اصغر کہنے لگا -

" کبھی ڈھنگ کی بات نہ کرو گے — !"

سعید اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ سٹیج پر تیز روشنی کا دائرہ نمودار ہوا جو رقاصہ کو چند لمحوں کے لئے خوب نمایاں کئے رہا اس کے بعد رنگین شعاعوں کی پھوار جیسی برسنے لگی - تیز روشنی پڑتے ہی سعید کے حواس جاتے رہے -

" آہ — !" آہ ! میرا خیال غلط نہ نکلا — اف میرے اللہ ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں — یہ آسمان کی رفعتوں پر چمکنے والا ستارہ ، زمین کی پستیوں میں کیونکر آن گرا -"

اس کی آواز میں ایک دردناک فریاد تھی - اصغر کی تمسخرانہ کیفیت یکا یک ہوا ہو گئی - اور فکر مند ہو کر اپنے دوست کی طرف متوجہ ہوا -

" کیا بات ہے سعید ! خدارا جلد بتاؤ کیا ہے ؟"

اس نے سرگوشی میں کہا تاکہ باقی لوگ متوجہ نہ ہوں ، مگر سعید اس کا ہاتھ اضطراب کے انداز میں دباتے ہوئے سٹیج کی طرف متوجہ تھا اصغر بھی بے اختیار ادھر دیکھنے پر مجبور سا ہو گیا - بڑا دلکش منظر تھا جل پری نے اپنی پیہم جد و جہد سے اس بیگیہ آبی کے طلسم سے اپنے جسم کو رہا کر لیا تھا اور اب اس کے چہرے سے آزادی کی مسرت برس رہی تھی - خوشی کے

نغمے بلند ہو رہے تھے اور ان نغموں میں ایک ترنم ریز جھنکار کا اضافہ ہو گیا تھا وہ اپنے حریری لباس کو پھڑپھڑاتی سبک خرامی سے ہوا میں رقص کرتی ہوئی سٹیج کے سامنے حصہ پر آ گئی تھی۔

اس کی مخروطی انگلیاں کس کس انداز سے متحرک تھیں گلابی مرمریں بازوؤں میں غضب کی لوچ تھی۔ وہ اپنے لچکتے ہوئے سیمابی جسم کی متوازن حرکات کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس قدر جھک جاتی کہ سر کا پچھلا حصہ فرش کو چھونے لگتا ہے پھر اُٹھ کر وہ سارے جسم کا توازن پیر کے انگوٹھوں کے پوروں پر تھامے ہوئے ناچنے لگتی۔ اُس کی شوخ نگاہی اس کی عشوہ گر چتونوں کے ہوش ربا اشارے اور تماشائیوں کے لئے توجہ ہوں مگر سعید کے لئے سراسر پیغام موت تھے۔ اس کے جسم کی ہر جنبش اس کے ہر بن مُو سے جیسے زندگی کی رمق کو سلب کئے لیتی تھی اور اب وہ نیم جان سا ہو کر اصغر کے کندھے پر سر ٹکائے یہ ہوش ربا منظر دیکھ رہا تھا۔ اصغر بھی اب اس کی موجودہ کیفیت کا سبب سمجھ چکا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے بائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے اسی شخص سے مخاطب ہو کر پوچھا جو کھیل شروع ہونے سے پہلے اپنی معلومات کا اظہار کر چکا تھا۔

حضرت! ان صاحبہ کا نام کیا ہے؟"

" ان کا نام نگار " مشہور ہے — اصلی نام تو یقیناً کچھ اور ہی ہو گا۔

اس شخص نے اصغر کے استفسار پر کچھ معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا۔

" یقیناً — !" اصغر نے اس کے لفظ پر زور دیتے ہوئے تائید کی سعید نے نگاہ پھیر کر اندھیرے ہی میں اصغر کے چہرے کی کیفیت بھانپنے کی کوشش کی۔

" ہوں — ؟ تو اب تمہاری سمجھ میں بات آئی ؟ کیوں ؟ کیا خیال ہے تصویر تو تم نے دیکھی ہے نا وہی ؟"

اس نے پوچھا۔
بھئی مشابہت تو ضرور ہے اب محض تصویر سے میں کیونکر یقینی کہہ دوں تم خود فیصلہ کرو جو اُسے اس قدر قریب سے دیکھ چکے ہو؟" اصغر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
"صریحاً وہی ہے۔! مگر حیرت کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔؟ وہ ایسی تو نہ تھی!"
سعید نے دلدوز آہ کھینچتے ہوئے گلو گرفتہ آواز میں کہا۔
عجب بے جوڑ گفتگو ہے صریحاً وہی ہے پھر وہ ایسی تو نہ تھی۔
"مطلب کیا ہوا آخر؟" اصغر کہنے لگا۔
آہ اصغر! میرے دوست! میں سچ کہتا ہوں۔ میری روح رواں جوہر ایک نہایت صاحب شرم وحیا دوشیزہ تھی۔ اس پر خبر نہیں کیا افتاد پڑی "کہ اُس نے یہ زندگی اختیار کر لی۔" سعید نے زیر لب کہا۔
"خیر معلوم کئے لیتے ہیں۔" اصغر نے وثوق سے کہا اور سعید نہایت بیقراری سے کھیل ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔
آخر وقفہ ہوا۔ اور تماشائی تیزی سے باہر جانے لگے۔ مگر عجلت میں کوئی سعید سے بازی لے جائے یہ ممکن نہ ہوا۔ وہ اٹھ کر دیوانہ وار بھاگتا ہوا۔ تھیٹر کے عقب میں پہنچا اس کی فوجی وردی پہچان کر کسی نے اُسے روکنے کی جرأت نہ کی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ ایکٹر اور ایکٹریسیں نئے سین کے لئے لباس تبدیل کرنے میں مصروف تھے مگر نگار یا دوسرے لفظوں میں جوہر اسے کہیں نظر نہ آئی لیکن ایک سکرین کے پیچھے سے ایک آواز نے یکایک اسے متوجہ کیا اور وہ وہیں رک گیا۔
"دیکھئے شیرازی صاحب! میرے کیبن میں اس طرح گھس آنے کی ہرگز جرأت نہ کیا کیجئے۔! یہ ایک تند وتیز نسوانی آواز تھی اور سعید نے پہچانا کہ یہ آواز بلاشبہ جوہر کی تھی۔
بہت بہتر! بہت بہتر!" کہتا ہوا ایک مرد کیبن سے باہر نکل آیا یہ

مینجر تھا۔ جو خفت سے ہنستا ہوا باہر نکلا تو سامنے ہی سعید کھڑا تھا۔

اے ۔ آپ ۔ آپ ۔ ؟ وہ ہکلایا۔

" مجھے ۔ ان سے ملنا ہے !"

" اپنی زبان سے " نگار " کہنا اُسے اچھا نہ لگا اس نے کیبن کے باہر لگی ہوئی تختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" مجھے ۔۔ افسوس ہے کیپٹن ! مس نگار کسی سے نہیں ملتیں" مینجر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

" مجھ سے ضرور ملیں گی ۔ !"

وہ فرطِ غضب سے سکرین کو ایک طرف پٹختے ہوئے دانت پیس کر بولا اور کیبن کا پردہ ہٹا کر اندر گھس گیا۔ اس کے اندر آتے ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ سعید اس کے روبرو کھڑا تھا مگر وہ اسے یوں استعجاب آمیز استفسار سے دیکھ رہی تھی جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہی ہو۔

" جوہر ۔۔! یہ ۔ یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں !"

اس نے فوراً وفور غضب سے کڑکتی ہوئی مگر رقت سے لرزتی ہوئی آواز میں مواخذہ کیا۔ یہ لفظ سنتے ہی لڑکی تڑپ کر اپنی جگہ سے اُٹھی اور ایک لمحہ بڑے غور سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے فوجی افسر کو سرتاپا دیکھا اس کی نگاہیں اب بھی وہی اجنبیت کا انداز لئے ہوئے تھیں ۔ معاً اس کی سڈول خوشنما گردن غرور کے انداز سے اوپر اُٹھ گئی ۔

" آپ کون ہیں صاحب ؟ میں آپ کو نہیں جانتی ۔ آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ۔" اس نے آہستہ مگر پر نخوت انداز سے کہا۔

" ہوں ۔ ؟ تو وہ سب کچھ بھی محض اداکاری تھی ؟" اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا۔

لڑکی پینترا بدل کر ایک طرف ہٹ گئی ۔

یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ۔" وہ کچھ کہنے کو تھی کہ سعید بے صبری سے

چلا یا۔

"جوہر ۔۔!"

"میرا نام جوہر نہیں ہے ـــــ ! آپ جا کر اپنے دماغ کا علاج کروائیے !"

وہ بھی خفگی سے بولی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ سعید اس کے پیچھے جھپٹنے کو تھا کہ مینجر اور کئی دوسرے اداکاروں نے جو شور سن کر جمع ہو گئے تھے اسے راستہ ہی میں روک لیا۔ مینجر بے حد خلیق آدمی تھا۔ اس نے سعید کی مختصر روداد سنی اور اسے تسلی دی اور کہا وہ اس کی غلط فہمی کو رفع کرنے میں پوری پوری مدد کرے گا۔ علاوہ ازیں نگار سے وقتاً فوقتاً ملاقات کر کے اس امر کی عملی تصدیق کر لینے میں بھی مزاحم نہ ہوگا کہ وہ جوہر نہیں ہے۔

میری دستاویزیں ملاحظہ کر لیجیے کیپٹن! یہ لڑکی متواتر دو سال سے میرے تھیٹر میں کام کر رہی ہے میرے پاس آئی تو کوری اور اناڑی تھی میں نے چوٹی کے استاد رکھ کر اسے ناچنا گانا سکھایا۔ اب یہ حال ہے کہ مجھ سے بھی آنکھ نہیں ملاتی بے حد مغرور اور غصیلی ہے، میں اس کے ایک ایک رقص کی تیاری پر ہزاروں روپیہ صرف کرتا ہوں۔ ملک کے ماہر فن آرٹسٹ اس کے رقص کے مناظر کی سیٹنگ کرتے ہیں۔ یہ جو رقص آپ نے ابھی دیکھا اس میں دو ہزار روپیہ کی تو نائیلون ہی جھیل کی سیٹنگ پر صرف ہوئی ہے۔۔۔۔"

وہ باتونی مینجر خبر نہیں گفتگو کو اور کہاں تک طویل دیتا مگر سعید کے مضطرب ذہن میں تحمل کہاں باقی تھا وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

بہر کیف میں اپنی آنکھوں کو کیونکر دھوکہ دوں ـــ ؟ آپ سارے کوائف پر غور کیجیے۔ میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے سعید باہر نکل آیا۔ مینجر کے دفتر کے باہر اسے اصغر مل گیا وہ دانستہ باہر کھڑا رہا تھا۔

"عجیب بات ہے میں نے جس کسی سے بھی پوچھا یہی جواب ملا کہ نگار دو

سال سے اس تھیٹر میں کام کر رہی ہے ۔ حالانکہ تم کہتے ہو کہ چھ ماہ قبل نگم میں جوہر تم سے ملی اور اُس سے کچھ ہی دن پہلے تم نے بذاتِ خود اسے ایئر ہوسٹس کی ملازمت پر متعین دیکھا آج سے چھ ماہ پہلے یہ کمپنی پنجاب کے مشہور شہروں کا دورہ کرتی پھر رہی تھی ۔ اس پیچیدہ معمہ نے تو میرا ابھی دماغ چکر میں ڈال دیا " اصغر نے بیان کیا ۔

بس اب واپس چلے چلو ۔ چھوڑو اس قصے کو ! "

سعید نے بیزار ہو کر کہا اور وہ قدم بر داشتہ واپس چلے ، نگار کے کیبن کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے کرنل ذوالفقار کیفی آتا ہوا دکھائی دیا ۔ اس کے ہاتھ میں نرگس کے پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھا ۔ وہ فتحمندانہ تبسم اپنے سرخ و سفید چہرے پر نمایاں کئے ، گردن کے خفیف جیسے خم سے ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا نگار کے کیبن میں چلا گیا ۔ چند لمحے یہ ٹھٹک کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہیں رک گئے ۔ مگر مینیجر کا یہ بیان غلط ثابت ہوا کہ مس نگار کسی سے نہیں ملتیں ۔ سعید کی توقع کے خلاف کرنل واپس نہیں نکالا گیا تھا بلکہ اس کا پرتپاک خیر مقدم ہوا تھا کہ اندر سے ملے جلے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی ۔

(۱۱)

اس کے بعد کرنل ذوالفقار کو تفریح کے اوقات میں اکثر نگار کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ عموماً ایسا ہوتا کہ اصغر اور سعید اپنی جیپ پر یا کبھی پیدل گھومنے کے واسطے نکلتے تو کرنل کیفی اور نگار سیاہ واکس آل میں بیٹھے ہوئے قریب سے گزر جاتے۔

نگار ہر موقعہ پر سعید کو یوں نظر انداز کر جاتی جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو اور سعید کا خون کھول کر رہ جاتا۔ ایک دن طیش میں آکر وہ پھر مینجر کے پاس پہنچا اور نگار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مینجر نے نگار کے خیمہ میں اطلاع کرائی لیکن اس نے ملنے سے انکار کر دیا مگر سعید کے ذہن میں "نگم" کے واقعات کی یاد نقش ہو چکی تھی۔ اس کے پیش نظر وہ اس لڑکی پر اپنا حق سمجھتا تھا وہ اس کے روبرو اقرارِ محبت کر چکی تھی یہ اُسے اپنے دل میں ایک خاص مقام دے چکا تھا گو اب وہ اسے نظر انداز کر چکی تھی۔ مگر یہ اُسے بھلا نہیں سکا تھا۔

اس کی اداکاری کو تسلیم کرتے ہوئے بھی فراموشگاری پر خود قادر نہ تھا۔ کیا کرتا اُس کی محبت کو اپنی ہستی کی تار و پود سے کیونکر نکال پھینکتا

وہ تو اس کے خون میں حلول کر کے اس کی روح رواں بن چکی تھی۔ اس کے رگ و ریشہ پر رچ گئی تھی۔ نہیں! اب یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس بے وفا اور زنگ محبت لڑکی کے جذبۂ محبت کو اپنے دل سے نکال سکتا۔!

ایکدن سعید بذات خود اس کے خیمہ میں پہنچ گیا وہ بستر پر لیٹی ہوئی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر اُٹھ بیٹھی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ نے یوں اندر چلے آنے کی جرأت کیسے کی؟"

یہ جرأت مجھے تمہاری محبت نے سکھائی ہے" نگم" کے واقعات کو تم بھول گئیں لیکن میں نہیں بھول سکتا۔ خدارا مجھے پاگل نہ ہو جانے دو یہ کیونکر ممکن ہوا کہ تم اتنے قلیل عرصہ میں وہ سب وعدے بھول گئیں جوہر۔؟ دیکھو اس راستہ سے واپس پلٹ آؤ میرے حال پر رحم کرو۔!"

وہ تصویر التجا بنا ہوا اس کے قریب آگیا۔ ایک لمحہ کے واسطے لڑکی کے چہرے پر ایک غمناک سا تاثر جھلکا اُس نے اپنا زیریں ہونٹ دانتوں کے نیچے دبا لیا۔ اور اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کڑی آواز میں بولی۔

"اے مسٹر! آپ خبر نہیں کیا واہی تباہی بکنے یہاں چلے آتے ہیں میں آپ سے ہزار بار کہہ چکی کہ میرا نام جوہر نہیں ہے اور میں آپ کو ہرگز نہیں جانتی۔ یا تو آپ نے محض ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ یا پھر آپ کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ بہرحال آپ مجھے پریشان کرنے کے لئے یہاں آنے کی آئندہ جرأت نہ کیجئے ورنہ کرنل کیفی سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔"

وہ جوشِ غضب میں اب کھڑی ہو گئی تھی۔ گلابی قمیض، شلوار پر سیاہ سویٹر پہنا ہوا تھا۔ کندھوں پر سیاہ پشمینہ کی کامدار شال تھی۔ غصہ سے اس کا حسین چہرہ گلرنگ ہو کر سیاہ شال کے ہالہ میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

سعید نے اس مجسم حسن برہم کو غور سے دیکھا — اُس کے لاکھ انکار پر بھی وہ اپنی نگاہوں کو کیونکر دھوکہ دیتا۔ وہی زیتونی رنگت، بیضوی چہرہ، وہی بادام نما بھوری بھوری آنکھیں جن پر لمبی اور گھنی پلکوں کے لرزتے ہوئے سائے تھے۔ وہی چھوٹی سی کشیدہ ناک اور فراخ پیشانی جیسے درخشاں چاند کا نصف ٹکڑا، ویسے کندنی رنگت کے ریشمیں بال فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے ان کے کٹے ہوئے دلآویز لچھے اس کی صراحی دار گردن پر بکھا در ہوا کرتے تھے مگر اب وہ کچھ بڑھ آئے تھے اور دو حصوں میں تقسیم کر کے موباف سے بندھے ہوئے تھے۔ ہاں البتہ ایک فرق ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ جو چہرہ اس نے نگم " سے روانگی کے وقت اپنے روبرو دیکھا تھا اُس پر فرشتگانہ معصومیت کا نور تھا۔ شرم و حیا، عصمت و عفت کی مرعوب کن جلا تھی، جو غیر محرم نگاہوں کے لئے بجائے خود ایک نقاب کا کام دیتی تھی مگر اس چہرے سے جو اُس کے پیش نظر تھا وہ نقاب اتر چکا تھا، وہ معصوم نور، وہ رعب عفت تابی کی جلاہٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ کبر و نخوت کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا، حسن خود آگاہ کی نسوانی انا نے اتنی شدت اختیار کی تھی کہ وہ انانیت اور رعونت سے کچھ کرخت سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ مہربان اور ہمدرد جیسی نرم نرم نگاہیں اب تو جہاں دیدہ سی ہو کر چالاوٹ اور عیاری کی طرف مائل تھیں۔

" کیا دیکھ رہے ہیں آپ — ؟ سنا نہیں آپ نے ؟"

وہ تلخ آواز میں کہہ رہی تھی کہ مینجر داخل ہوا اس نے نرمی سے سعید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان کے قریب جھکتے ہوئے کہا۔

" کرنل کیفی آرہے ہیں —"

" الٰہی! کیا ایسا تغیر بھی ممکن ہے تیری اس دنیا میں ؟" وہ دروازہ کی طرف پلٹتے ہوئے بڑبڑایا۔

عین ممکن! دنیا نام ہی تغیر و انقلاب کا ہے میرے مہربان !"

مینجر نے نہایت ہمدردانہ لہجہ میں کہا اور اُسے لئے ہوئے باہر نکل گیا چند قدم سعید کے ساتھ اس کی جیپ تک چلتے ہوئے مینجر نے اُسے قائل کرنے

کی کوشش کی، کہ نگار وہ لڑکی نہیں جیسے وہ چاہتا ہے مگر سعید نے مسکرا کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ "یہ فریب کسی اور کو دو۔ میں ان ہتھکنڈوں میں آنے والا نہیں۔"

کرنل کیفی "واکس آل" سعید کی جیپ کے قریب ہی پارک ہو رہی تھی اور سامنے وہ خود چلا آ رہا تھا۔ مگر سعید نے کچھ پرواہ نہ کی۔ وہ سر جھکائے کسی خیال میں محو اس کے قریب سے گزر گیا۔ اور متوجہ ہی نہ ہوا۔ کہ اسے فرضِ منصبی سے مجبور ہو کر رسمی سلام کرنا پڑتا۔ کرنل آگے بڑھ گیا تو کار کے عقب سے اچانک اصغر نمودار ہوا۔

"ہیں ـــ ؟ تم کیسے پہنچ گئے ـــ ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کرنل ادھر آ رہے تھے میں نے التماس کی کہ مجھے بھی شہر تک لفٹ دے دیں۔ انہیں کے ساتھ چلا آیا۔ کیوں کچھ بات بنی ؟" اصغر نے تجسس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اونہہ ـــ کبھی دستانِ ازل کی بھی کبھی بات بنی ہے ـ ؟"

سعید نے انتہائے یاس سے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی دردناک کیفیت نے اب تو اصغر تک کو سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ اس کے پہلو کی نشست پر آ بیٹھا اور سعید نے جیپ سٹارٹ کی۔

میں نے جرأت کر کے کرنل کیفی سے سارا معاملہ کہہ دیا ہے!"

اصغر نے سعید کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ استعجاب سے اس کی دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"پھر کیا کہا اُس نے ـ ؟"

اصغر کا خیال تھا کہ سعید اس کے اتنے بڑے جسارت آمیز کارنامہ پر بہت حیران ہو گا لیکن اس نے تو جیسے کچھ اہمیت ہی نہ دی، درحقیقت اپنی ناکامیٔ محبت کے کوہِ گراں بار کے مقابلہ میں اب اس کے نزدیک دنیا کے کسی بھی مسئلہ کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی اور اس معاملہ میں تو وہ جانتا ہی تھا کہ افسری اور ماتحتی کے مدارج کو پاٹ کر اُسے عنقریب کرنل کیفی کے روبرو آنا ہی ہو گا۔ اچھا

ہوا کہ اس کے دوست نے جلد ہی تمہید شروع کر دی ۔
وہ کہنے لگا کہ گو اُسے نگار سے والہانہ محبت ہے لیکن تحقیقات کرنے پر اگر یہ واقعہ درست نکلا کہ وہ فی الحقیقت تمہاری محبوبہ جوہر ہے تو وہ اس سے قطع تعلق کرے گا ۔" اصغر نے بیان کیا ۔
" ہوں —" سعید نے بدستور کھوئے ہوئے انداز سے کہا اور ڈرائیو کرتے ہوئے سامنے خلا میں نگاہیں مرکوز رکھیں ۔
کچھ تو پُراُمید نظر آؤ میرے دوست! تم نے تو ایک دم حوصلہ ہار دیا اصغر نے اس کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا ۔
" کیفی اُس سے قطع تعلق کرے گا —! کیا یہی میرے لئے وجۂ تسلی ہے؟ وہ خود میرے سامنے اپنی صحیح شخصیت کو تسلیم نہیں کرتی، جس نے اُسے اس قدر قریب سے دیکھا ہے، وہ کیفی کے سامنے کیونکر اقرار کرلے گی؟"
سعید پوچھنے لگا ۔
کیفی اپنے طور پر تحقیقات کرے گا ۔ اس نے مجھے تاکید کی ہے کہ اس کے متعلق ضروری معلومات تم سے لے کر اُسے اطلاع دوں ۔" اصغر نے کہا ۔
چلو یہ بھی مان لیا ۔ کہ تحقیقات کر کے کیفی اس سے قطع تعلق کرے گا ۔ تو جس راستہ پر وہ چل نکلی ہے اس سے کون اُسے واپس لائے گا —؟"
سعید نے اپنے دوست کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا ۔
تم اُسے واپس آنے پر مجبور نہیں کر سکو گے تو چھوڑو اس جھنجھٹ کو ۔ جب اس نے تم سے دھوکہ کیا تو اب اس کی بازیافت ہی فضول ہے لیکن ایسی حرافہ عورت کو ایک بار سزا ضرور دینی چاہیئے —!" اصغر جوش میں آکر کہنے لگا ۔
" یہ آئینِ محبت کے خلاف ہے، وہ نہ کرسے ہیں تو اب تک اس

سے محبت کرتا ہوں — !" سعید نے زیر لب کہا۔

"تو بندۂ خدا آخر چاہتے کیا ہو؟" اصغر نے حیران ہو کر پوچھا۔

" بس یہی کہ اس کے راستہ سے ہٹ جاؤں، جہاں تک ممکن ہو اس سے دُور چلا جاؤں جہاں پھر اس سے سامنا ہونے کا امکان نہ رہے۔" سعید نے درد بھری آواز میں کہا تو اصغر کے دل پر چوٹ لگی وہ لمحہ بھر غور سے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔

"یہ آئینِ محبت کے عین مطابق ہے۔" اصغر نے اُسی جوش کے ماتحت کہا۔

" اوں ہوں — اپنا تو یہ مسلک نہیں!" وہ بولا۔

"خیر نہ سہی۔ لیکن کم از کم کرنل کیفی کو تو اس سے ضرور الگ کر کے رہوں گا! جسے موٹی مرغی سمجھ کر وہ پھانسے ہوئے ہے۔" اصغر نے کہا

" کیفی نہ سہی اور ہزاروں شکار کھینچے چلے آئیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے اور کیفی شاید اُسے یہ راستہ ترک کر کے پھر راہ راست پر آجانے کی ترغیب دے سکے۔" سعید نے اسی طرح دبی ہوئی، شکست خوردہ سی آواز میں کہا۔

"اگر تم اپنے اوپر یہ دائمی سوگواری طاری نہ کر لو تو کوئی پرواہ نہیں۔ میری طرف سے جہنم میں جائے وہ عورت۔ لیکن یاد رکھو تمہارے لئے کسی طرح یہ واقعہ ضرر رساں ثابت ہوا تو بخدا میں اس خوب صورت بلا کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

اصغر نے دفورِ جوش سے اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا سعید کے چہرے پر المناک کیفیت اس مخلص نوجوان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

وہ اپنے آپ پر نفرین بھیج رہا تھا کہ وہ کیوں اُسے لے کر تھیئٹر گیا اس منحوس دن کو کوس رہا تھا جب دن اس کے دل میں یہ خیال ہی پیدا ہوا کہ چل کر کھیل دیکھا جائے۔ اس دل شکن حقیقت سے تو وہ لاعلمی

بدرجہا بہتر تھی۔ کہ وہ قیاس آرائیوں میں وقت گزار رہا تھا ایک موہوم امید تو قائم تھی۔

اس حقیقت نے تو اس کی دنیا ہی زیر و زبر کر دی۔ سعید کے دکھ کے احساس نے اصغر کے اپنے اندمال پذیر زخموں کو از سر نو کھرچ ڈالا کچھ عرصہ پہلے وہ خود اس دور سے گزر چکا تھا، جس سے اب اس کے دوست کا سابقہ پڑا تھا۔ اُسے اس جانکاہ درد کا اس تپش اور اس جلن کا پورا پورا احساس تھا جو سعید کو تڑپا اور جلا رہی تھی، اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ جلد از جلد اس کیفیت پر غالب آ جائے حالانکہ وہ اس امر سے بھی ناواقف نہ تھا کہ اس قیامت خیز کیفیت پر غالب آنا آسان نہیں۔

کیمپ میں پہنچ کر سعید نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور اصغر سے التجا کی کہ اسے کچھ دیر تنہا چھوڑ دے۔ کوئی دوسرا چارہ کار نہ دیکھ کر اصغر نے اُس کی التجا مان لی اور خاموشی سے اپنے خیمہ کی طرف چلا گیا۔

(۱۲)

صفحۂ کائنات پر انسان کی ہستی ایک نقش عجیب ہے! یہ حیرت انگیز مخلوق، اجتماع ضدین ہے۔ جہاں یہ اس قدر ناپائیدار اور غیر یقینی ہے کہ اس کا وجود محض تار نفس کے نازک رشتہ سے معلق ہے۔ وہیں ایسا سخت جان کہ نامساعدات زمانہ کے گراں بار پہاڑ تک جھیل جاتا ہے اور نہیں مرتا ــــ مستقبل کے اندھیروں میں بجلی کی طرح لہراتے ہوئے وہ خدشات، جن کی نسبت اسے گمان ہوتا ہے کہ صاعقۂ زہر اشکن بن کر جس وقت اس کے سر پر ٹوٹیں گے تو پھر وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے گا مگر جب ٹھوس حقیقتیں اور ناقابل مفر واقعات بن کر وہ اسے آن ہی گھیرتے ہیں تو وہ جدوجہد کر کے آخر اس ہنگامی دور سے نکل ہی آتا ہے۔ پھر اس گزر جانے والے طوفان کے اس پار کھڑا ہو کر حیرت سے سوچتا ہے کہ بااین ہمہ وہ زندہ کیسے بچ گیا؟ کیا وہ ایسی ناقابل شکست قوت برداشت کا حامل تھا؟ کیا اس میں ایسی زبردست قوت مدافعت کی صلاحیتیں پوشیدہ تھیں کہ اتنے بڑے پہاڑ سے ٹکر لے کر بھی وہ پاش پاش نہ ہوگیا؟ ــ اور سعید پران دنوں یہی آخر الذکر کیفیت وارد تھی۔

گزشتہ دو سال کے عرصہ میں اس پر زندگی کے شدائد نے اس طرح یورش کی کہ وہ سپٹتا گیا۔ اگر اصغر جیسے مخلص دوست کی ہمدردیاں شامل حال نہ ہوتیں

تو دور نہ تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس سے گزر جاتا — " نگم " کے واقعات اُس کے ذہن پر اس لئے اثر انداز نہ ہوتے تھے کہ جوہر کی محبت نے اس کے دل کو سہارا دے لیا تھا اور باوجود کئی ناگوار سانحوں کے وہ رخصت ہوتے وقت پر امید اور حوصلہ مند تھا۔ ان تمام ظلمتوں میں اس کی اپنی جوہر . روشنی کے مینار کی مانند اس کی رہنمائی کر رہی تھی . مگر اب وہ روشنی کا مینار خود بھی مسمار ہو چکا تھا اور زندگی کے بحر ظلمات کی شدید موجوں سے نبرد آزمائی کے ناقابل پا کر اُس نے اپنے آپ کو قضا و قدر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

ان شکستہ حوصلوں کے ساتھ وہ ملٹری کے قوانین و ضوابط سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا تھا، اس نے ڈسچارج کے لئے درخواست کر دی جو کرنل کیفی کی خاص توجہ سے جلد ہی منظور ہو گئی۔

اصغر کے لئے سعید کی جدائی گو بے حد دل شکن تھی مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس منظر سے دور چلا جائے۔ چنانچہ دو سچے رفیق الگ ہو گئے سعید نے واپس آکر اپنی رہائش گاہ پر مطب کھول دیا اور پرائیویٹ پریکٹس کرنے لگا۔ اصغر کے خطوط مسلسل آتے مگر اس نے مصلحتاً کبھی نگار یا دوسرے لفظوں میں جوہر کے متعلق ایک لفظ بھی نہ لکھا۔ اُس کے شگفتہ اور پر مزاح خطوط سعید کے لئے وقتی طور پر باعث سکون ہوتے۔

جعفر رضا کے لئے سعید کی ناکام واپسی حوصلہ شکن ثابت ہوئی جس لڑکے کو انہوں نے اپنے زعم میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کی مکمل صلاحیتوں کے ساتھ شاہراہ ترقی پر روانہ کر دیا تھا وہ یوں شکست خوردہ اور ہزیمت زدہ سا واپس لوٹ آیا — ؟ اس کے بل بوتے پر بھروسہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کی آئندہ زندگی کے لئے کچھ بھی پس انداز نہ کیا تھا۔ اس کی قوت بازو اور خود اعتمادی پر وہ اس قدر نازاں تھے۔ مگر وہ تو اس قدر جلد زندگی کی بازی ہار کر کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ان کے سامنے آن گرا اُن کی زندگی کا یہ سہارا کیا ٹوٹا کہ بس کمر ہمت ٹوٹ گئی، سارے حوصلے سارے ارمان ٹوٹ گئے اور عالم ضعیفی میں اس شکست کی تاب نہ لا کر وہ بھی سعید کا ساتھ چھوڑ گئے۔

— اُن کے آخری سانس کی عقوبت کو اس خلش نے اور بھی بڑھا دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا حاصل ایک ناکام ڈاکٹر کے سوا کچھ نہ چھوڑ سکے —

سعید کو واپس آئے پورا سال گزر گیا تھا۔ جعفر رضا کے انتقال کو چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ سعید کی پریکٹس کچھ یونہی سی چل رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے کاروبار کو کافی فروغ دے لیتا۔ اور کثیر دولت پیدا کر لیتا۔ مگر وہ تو جیسے اس گراں خاطر زندگی کو مر نہ سکنے کی سزا سمجھ کر کاٹ رہا تھا۔

اگر اس کا کمپونڈر اور اسسٹنٹ عابد نہ ہوتا تو شاید اتنا سا کاروبار بھی نہ چلتا۔ عابد اُسے لاکھ سمجھاتا۔ کہ ہمارے ملک میں طب جیسا پیشہ تو ذرا سی کوشش سے چل نکلتا ہے۔ جہاں معاشرہ کے بہت سے پیشہ ور دولت کمانے کے واسطے قسم قسم کے خوف ناک امراض کی تخلیق کرتے ہیں۔ وہاں طب صرف ایسا پیشہ ہے کہ ان امراض کی مدافعت کرتا ہے —

غذائی ملاوٹ کی کامیاب تحریک چلانے والوں نے نئی پود کے جسموں میں حیاتیاتی عناصر کی ایسی کمی پیدا کر دی ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ بلکہ مستقل موروثی بیماریوں کی صورت میں نسلاً بعد نسلاً منتقل ہونے اور ترقی پانے کا امکان غالب ہے اس صورت میں اگر طب جیسا معزز پیشہ ان قوم فروشوں کے اس بلا واسطہ تعاون سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ نوعِ انسانی کے بچاؤ اور دردمندی کی تدبیر کر کے ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد بھی کرے اور خود بھی فیض یاب ہو تو کیا بُرا ہے ؟ —

مگر سعید پر تو جیسے ایک مستقل جمود طاری ہو گیا تھا وہ ایک نہ سنتا۔ جو دو چار بھولے بھٹکے یا عابد کے گھیر گھار کر لائے ہوئے مریض مطب میں آ جاتے انہیں بددلی سے دیکھتا۔ غیر ہمدردانہ جیسے بیزار لہجہ میں مشورہ دیتا اور لشتم پشتم نسخہ لکھ کر منہ پھیر لیتا۔

مریض اس آدم بیزار اور بد دماغ ڈاکٹر کے لئے اپنے دل میں نہ اعتماد پیدا کر سکتے نہ اعتقاد۔ تو پھر شفا کیسی ؟ جب کہ یہ نفسیاتی اثر ہی مرض کا نصف علاج

ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کو اپنے مریض سے پوری ہمدردی ہے اور وہ اس کی تکلیف رفع کرنے میں دستگاہ رکھتا ہے آخر کاروبار کی یہ سرد بازاری بھی رفتہ رفتہ سرد تر ہو گئی اور مریضوں کی آمد و رفت یکسر منقطع ہو گئی۔ حتیٰ کہ دکان کھول کر اسسٹنٹ دوائی خانہ میں پڑے اونگھتے رہتے اور ڈاکٹر ریٹائرنگ روم میں آرام کرسی پر نیم دراز حالت میں آنکھیں موندھے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے اور ان فرصت کے شب و روز کو غنیمت سمجھتے ہوئے تصورِ جاناں " کئے ہوئے پڑے رہتے۔

چنانچہ ایک دن حسبِ معمول یہی کیفیت تھی کہ کوٹھی کے ڈرائیو پر کار کی آواز سن کر عابد چونک پڑا اور ارے خوشی کے اکیلا ہی بڑبڑایا۔

" ضرور کوئی مریض آیا ہے۔!" لیکن اُسے بے حد مایوس ہونا پڑا، جب اُس نے دیکھا کہ نو وارد تو مریض کی بجائے اچھا خاصا تندرست، توانا، چاک و چوبند سرخ و سفید آدمی ہے۔! اور جب اُس نے یہ پوچھنے کی بجائے کہ " ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں ؟" یہ پوچھ لیا " کہ کیپٹن سعید کہاں ہیں؟ تو اس کی رہی سہی اُمید بھی ٹوٹ گئی۔ کیونکہ اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ ممکن ہے یہ خود مریض نہیں تو کسی مریض کا لواحق ہے جو ڈاکٹر کو بلانے آیا ہے۔ مگر اس سوال پر اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

" جی اندر ہیں — ؟ " آپ کی تعریف ؟ "

اُس شخص کی مایوس اور مردہ سی آواز پر نو وارد نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔

" ارے بھیا! تعریف تو اُس خدا کی جس نے جہان بنایا — مجھے تو سعید صاحب کے پاس لے چلو وہ یقیناً " مجھے پہچان لیں گے — ! وہ بے تکلفی سے بولا۔

اور " لے چلئے " کا انتظار کئے بغیر خود آگے بڑھ کر عابد کے آگے آگے اندر داخل ہوا۔ جیسے اپنا راستہ بخوبی پہچانتا ہو۔

اس طرف صاحب! اس طرف !"

عابد نے اُسے اندرونی کمروں کی طرف بڑھتے دیکھ کر واپس پکارا اور وہ دو تین لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس کمرے میں داخل ہونے لگا تھا کہ ایک گرانڈیل کتا تیزی سے باہر نکلا اور وہ قد آور اور قوی نوجوان ٹھٹک کر دیوار سے لگ گیا۔ عابد بے اختیار مسکرا دیا۔

"یہ کچھ نہیں کہتا صاحب! آپ بے کھٹکے چلے جائیے۔"

مگر کتا نووارد اور دروازے کے درمیان حائل تھا اور سوالیہ انداز سے اس کی طرف منہ اُٹھائے غراہٹ کی غصیلی آواز اپنے حلق سے نکال رہا تھا۔

"دوست! دیکھئے وہ تو صاف کچھ کہنے لگا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ کچھ نہیں کہتا؟"

اجنبی نوجوان نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ کتے سے دہشت پر وہ شرمسار ضرور تھا۔ مگر اپنی جرأت کی آزمائش اُسے اس نازک موقع پر منظور نہ تھی۔

"اصغر — ؟ یہ اصغر کی آواز کہاں سے آئی؟"

اندر سے سعید کی آواز سنائی دی؟"

"ارے یار! آواز ہی نہیں۔ میں خود بہ نفسِ نفیس موجود ہوں مگر یہ تمہارا کتا — !"

وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر پایا تھا کہ سعید بیتابانہ کمرے سے نکلا اور اس سے لپٹ گیا۔

"اصغر! میرے عزیز دوست! اس وقت تم فرشتۂ رحمت بن کر چلے آئے بخدا مجھے تمہاری اشد ضرورت تھی!" وہ گلوگیر آواز سے بولا۔

اونہہ! خط کبھی لکھتے نہیں اور دعوے دیکھو کہ میری اشد ضرورت تھی!"

اصغر اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے ہوئے بناوٹی خفگی سے بولا۔

بخدا! سعید نے اپنے دعوے کی صداقت ثابت کرنے کے لئے پُر زور انداز سے کہا۔ اور وہ دونوں دوست کمرے میں چلے گئے۔ عابد شکست خوردہ

سی چال سے پلٹا اور اپنے کمرے میں جا بیٹھا" ڈکی" نے بھی گویا اپنے آقا کے دوست کے حقوق تسلیم کرلیئے اور دم ہلاتا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔

خط لکھنے میں تو خیر تم بھی مجھ سے کم سست نہیں ہو، پورا ڈیڑھ ماہ ہوا تمہارا خط آیا تھا اور پھر میرے پاس تو سوائے پریشان خیالات کے لکھنے کو ہوتا بھی کیا ہے ۔۔؟" سعید کہنے لگا۔

" اور میرے پاس لکھنے کو بڑے بڑے خیالات تھے کہ وہ خط میں سما ہی نہ سکتے تھے! بس فیصلہ کر لیا کہ خط ہی نہ لکھو، جس قدر جلد ممکن ہو، خود ہی چلو۔ چنانچہ چھٹی مانگتے مانگتے یہ دن آ گئے ۔"

اصغر نے خیالات کے حجم کو دونوں ہاتھوں کے اشارہ سے ظاہر کرتے ہوئے کہا اور دونوں ایک گداز صوفہ پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ اصغر موٹر کے ہارن پر چونک پڑا۔

" ارے بھائی! کوئی میرا سامان تو ٹیکسی پر سے اٹھا لائے ۔!"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ سعید نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو دو منٹ بعد بوڑھا رفیق کمرے میں آیا۔

صاحب کا سامان ٹیکسی میں سے اٹھوا کر میرے کمرے کے ساتھ والی خواب گاہ میں پہنچا دو اور ان کے لیئے ناشتہ تیار کرو " اس نے ملازم کو حکم دیا۔

" نہیں ناشتہ کی ضرورت نہیں۔ بس کھانا ہی کھائیں گے اب تو "

اصغر نے کہا تو رفیق سوالیہ انداز میں اپنے آقا کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سے پھر ہارن سنائی دیا۔

" ارے بھائی! بھاگو سامان نکالو۔ ڈرائیور گھبرایا ہوا ہے میں جو کہتا ہوں کہ ناشتہ نہیں چاہیئے مجھے!"

اصغر نے کہا تو ملازم کمرے سے نکل گیا۔

" اچھا تو کوئی خاص باتیں تھیں جو تم خط میں نہ لکھ سکے؟"

سعید نے براہِ راست ہی گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

ہاں خاص الخاص ! مصلحت یہی تھی ، کہ تمہیں زبانی سب کچھ بتایا جائے مجھے ڈر تھا کہ اکیلے میں یہ خبر پاکر تم خواہ مخواہ کڑھتے رہو گے !" اصغر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

" تو کیا کوئی ـــ ؟" سعید متفکر سا ہو کر کچھ پوچھنے لگا۔ مگر اصغر نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔

" میں بالترتیب سب کچھ سناؤں گا۔ گھبراؤ نہیں کوئی سوگوار بات نہیں ہے نگار یا بقول تمہارے جوہر بہر حال بقید حیات ہے ۔"

اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ سعید بھی اپنا سلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں میں تھامے مشتاق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تم چلے آئے تو میرے لئے ہر جگہ سونی اور ہر شے بے کیف ہو کر رہ گئی کچھ دنوں تو میں عجیب قسم کے جمود میں پڑا رہا لیکن جلد ہی میں اس شکستگی کے احساس پر غالب آگیا اور حالات سے عملی طرح نپٹ لینے کی ٹھان لی۔

پہلی کیفیت کے اس ردِ عمل نے مجھ پر یک دم حملہ کر دیا اور میں غصہ اور جوش سے کھولنے لگا۔

۔ ایک سہ پہر کو جب کہ نئے کمانڈنٹ کی آمد اور کمانڈنٹ غازی کے تبادلہ اور وداع کی تقریب میں ڈنر دیا جانے والا تھا۔ اور انتظام کا نگران کیفی تھا میں نے موقعہ کو غنیمت سمجھا کہ وہ اس دن نگار سے ملنے نہ جا سکے گا۔ اور جیپ لے کر خود چلا گیا۔ جیپ کو میں نے خاصے فاصلہ پر ٹھہرایا اور تھیٹر کے پچھواڑے سے ہوتا ہوا نگار کے خیمہ تک پہنچا میرا خیال تھا وہ اس وقت اکیلی مجھے مل جائے گی، لیکن میں خیمہ کے پیچھے پہنچا تو اندر سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ٹھہر گیا اور گفتگو پر کان لگا دیا نگار غصہ سے کہہ رہی تھی۔

یہ سراسر آپ کی زیادتی ہے شیرازی صاحب ! آخر کنٹریکٹ ہی ہے نا؛ کوئی آپ نے مجھے خرید تو نہیں لیا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا مخاطب منیجر تھا۔

" آپ کنٹریکٹ کا کیا مطلب سمجھتی ہیں ـــ ؟" وہ ہنس کر بولا۔ جھنجھ

لگا۔

"محض ایک معاہدہ!" وہ کہہ رہی تھی۔

"جی ہاں معاہدہ مگر کس قسم کا معاہدہ؟ کہ آپ چند خاص تحریری شرائط کے ماتحت، ایک خاص شخص کی پابند ہیں۔ اسے چاہے آپ کنٹریکٹ کہیں یا زیادہ کھلے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ اس خاص مدت کے لئے آپ کو میں نے خرید لیا ہے! آپ اُس اگریمنٹ کی مدت ختم ہونے سے پیشتر میری کمپنی کی ملازمت چھوڑ نہیں سکتیں۔ جو آپ کے اور میرے درمیان لکھا گیا" مینجر شیرازی کہہ رہا تھا۔

"کرنل کہتے ہیں کہ آپ کی تمام رقم جو آپ مجھے دے چکے واپس کر دی جائے گی!" نگار کہنے لگی۔

ایسی کوئی شق ہمارے اگریمنٹ میں نہیں۔ موعودہ مدت سے پیشتر آپ کسی طرح بھی کمپنی سے الگ نہیں ہو سکتیں" مینجر کہنے لگا۔

"گویا آپ اسی پر بضد ہیں کہ ایک خاص مدت کے لئے آپ نے مجھے خرید لیا ہے؟ نگار نے غصہ بھری آواز سے کہا۔

"بالکل!" مینجر نے تائید کی۔

"آپ دیکھ لیں گے، آپ کی یہ ضد محض بیکار ثابت ہو گی۔ اگر آپ دوستانہ طریقہ سے معاملہ کو سلجھا لیں تو آپ کو رقم واپس مل جائے گی۔ ورنہ ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

ورنہ کیا؟ کہہ جائیے پوری بات —!" مینجر نے بھی تلخی سے پوچھا۔

ورنہ آپ کو نقصان اٹھانا پڑے گا — کرنل آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے، کہ آپ نے مجھے دھوکہ دے کر ایسا اگریمنٹ لکھوایا جو میرے حقوق کے منافی تھا۔"

نگار نے بیان کیا۔

ہوں — تو گویا احسان فراموش کرنل میری رعایت اور مہربانی کا یہ عوض دے گا؟ میں نے واقعی سخت حماقت کی کہ اس کی آمد و رفت پہ پابندی نہ

رکھی ۔ تمہیں وقت نا وقت اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت دے رکھی۔ تھیٹر میں ناچنے والی چھوکریاں ایسے احمق افسروں کو اپنے پھندے میں پھانس کر مالکوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں - انہیں الو بنا کر طرح طرح کے فائدے حاصل کرتی ہیں۔ اور تم ہو کہ ایکا ایکی خود اس کے جھانسے میں آگئیں. مگر یاد رکھو کہ جو لڑکی ایک دفعہ گھر کی چوکھٹ سے نکل آئی وہ دوبارہ کبھی گرہستی میں قدم نہیں رکھ سکتی، شرفا کا معاشرہ اس کے لئے اپنے دامن میں کبھی گنجائش پیدا نہیں کر سکتا یہ کرنل تمہیں جل دیکر رے جائے گا۔ لیکن گھر کی ملکہ بنانے کے واسطے نہیں وہ چند دن تم سے دل بہلا کر ادھر اُدھر چھوڑ کر چلتا بنے گا پھر تم ادھر کی رہو گی نہ ادھر کی ۔" وہ غرائی ہوئی آواز میں مسلسل کہے جا رہا تھا ۔

شیرازی! بس میں زیادہ جھک جھک سننا نہیں چاہتی — ! نگار نے چلا کر کہا ۔

وہ دن گئے کہ میں تمہاری عزت کرتا تھا میں تمہیں بلند کردار فنکارہ سمجھتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ذوق فنکاری نہیں بلکہ محض تمہاری فطری بے راہ روی تمہیں گھر سے نکال کر سٹیج پر لے آئی ہے اور سٹیج سے گر کر تم بازار میں پہنچنا چاہتی ہو !" شیرازی خاصی بلند آواز میں بولا ۔

" خاموش! بیہودہ آدمی !" اس نے غصہ کے جوش میں بری طرح چلاتے ہوئے کہا ۔

" خیر میں دیکھتا ہوں، کہ اب وہ کرنل یہاں کیسے آتا ہے ؟ یا تم کیسے باہر جاتی ہو !"

وہ غصہ سے پاؤں پٹختا ہوا باہر جانے لگا ۔

" کیوں ؟ میں تمہاری قیدی ہوں کیا ؟ نگار چیخی ۔

" بیشک ! جب تک اگریمنٹ کی معیاد ختم نہیں ہوتی تم میری قید میں ہو !"

وہ دروازہ کے قریب کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا ۔

اس گھمنڈ میں نہ رہنا" نگار نے طنزاً کہا ۔

" ہوں — ؟ دیکھوں گا !" وہ کہتا ہوا چلا گیا ۔

میں نے خیمہ کے عقب سے جھانک کر دیکھا۔ وہ تھیٹر کی طرف جا چکا تو میں جلدی سے اندر داخل ہوا۔ میں وردی میں تھا۔ کیونکہ فوجی وردی میں کوئی ٹوکنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ حیرت سے چند لمحے کچھ کہہ نہ سکی، اس سے پیشتر اُس نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے میں ہمیشہ پس منظر ہی میں رہتا تھا۔

" آپ کون ہیں ؟ کیا آپ کو کرنل کیفی نے بھیجا ہے ؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

" نہیں! مجھے کیپٹن سعید نے بھیجا ہے ۔" میں نے جواب دیا۔

" کرنل تو کہتے ہیں کہ وہ ڈسچارج لے کر چلا گیا ۔ عجیب ہی سر پھرا آدمی ہے وہ !" وہ گردن جھٹک کر بولی۔

آپ ہی کی روگردانی نے اُس غریب کو چکر میں ڈال کر سر پھرا بنا دیا ورنہ وہ تو بڑا لائق ڈاکٹر ہے ۔"

میں نے وکالت کے انداز سے کہا۔ وہ ہنس دی۔

" واہ! اچھا لائق ڈاکٹر ہے کہ اپنے ہی مغز کا علاج نہیں کر سکتا !" وہ کہنے لگی۔

" اس کے مغز میں آپ کا سودا ہے کیا علاج کر سکتا ہے غریب !"

اچھا چھوڑیے آپ اپنے آنے کا مقصد بتایئے ۔ !" وہ کہنے لگی۔

میں نے باہر تخلیہ کا انتظار کرتے کرتے بلا ارادہ ہی آپ کی اور مسٹر شیرازی کی گفتگو سن پائی۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کہ وہ آپ پر پابندی عائد کر دے گا۔ اگر آپ اس کے پنجے سے بروقت رہائی پانا چاہتی ہیں تو یہ موزوں وقت ہے۔ میرے پاس باہر جیپ موجود ہے، خیمہ کے عقب سے نکال کر میں آپ کو بخوبی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میں آپ کی بے حد احسان مند ہوں گی صاحب! آپ مجھے کرنل کیفی

کے پاس پہنچادیں ۔" وہ بمنت کہنے لگی ۔

کرنل کیفی کے پاس نہیں ! کیپٹن سعید کے پاس البتہ پہنچا سکتا ہوں ۔ کرنل تو فی الحال فوجی قوانین و ضوابط کے پابند ہیں مگر کیپٹن ڈسچارج لے کر گھر جا چکے ہیں وہ آپ کو بخوبی پناہ دے سکتے ہیں —— چھوڑیئے اس بہروپ کو اور اپنی اصلی صورت اختیار کر کے ان کے ہاں چلی جایئے —— یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے ۔ —"

میں نے اُسے ناصحانہ طریقے سے سمجھایا مگر وہ تنک کر بولی !

آپ بھی اپنے دوست کی طرح بے تکی باتیں کرنے لگے ؟ میں کیا جانوں کیپٹن سعید کون ہے ۔ میں کرنل سے شادی کا وعدہ کر چکی ہوں ۔ اُن کے علاوہ میں کسی شخص کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی حیرت ہے کہ آپ لوگ مجھے سمجھتے کیا ہیں ؟" وہ غصہ میں آ گئی ۔

" اور لوگ تو جو بھی سمجھیں ۔ مجھے سعید کی زبانی آپ کی اصل شخصیت معلوم ہو چکی ہے !"

" مانا کہ چند ناگفتہ بہ حالات کے باعث آپ سٹیج تک پہنچنے پر مجبور ہو گئیں لیکن تعجب ہے کہ سعید سے یکسر روگرداں ہو کر اُسے یک دم نظر انداز کر کے آپ کرنل کی طرف متوجہ ہو گئیں ؟ اُسے تو آپ پہ اب تک اس قدر اعتماد ہے کہ وہ آپ کے اس رویہ کے بھی جواز سوچتا رہتا ہے ؟'

میں کہتا گیا وہ اکتا کر بولی ۔

یہ محض کوئی شدید غلط فہمی ہے شاید اُن کی محبوبہ میری ہم شکل ہو گی ۔ بخدا میں نے سعید کو اس رات سے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں ۔"

مختصر یہ کہ بہت بحث ہوتی رہی آخر میں اس عورت کی ہٹ سے مجبور ہو کر واپس آنے لگا تو وہ منت سے کہنے لگی ۔

" مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد دو میں اور کرنل تمہارے شکر گزار ہوں گے"

" واہ ! میں کیوں کسی کے لئے اغوا کے جرم کا مرتکب ہوں ۔ ! مگر یاد رکھنا کہ میں تم جیسی بے درد ، دو رخی ناگن کو زندہ نہ چھوڑوں گا ۔ دوست تڑپا

کرے اور تمہیں کرنل اڑا لے جائے ؟ نا ممکن ! میرے پاس اسوقت پستول موجود ہوتا تو میں یقیناً تمہیں گولی مار دیتا خیر

" پھر سہی ۔۔ !"

میں جوش جنون میں بہت کچھ کہتا ہوا بالکل باہر نکل آیا ۔

ڈنر پر کرنل کیفی کے رخصت ہو جانے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی کہ وہ شادی کے واسطے تین ماہ کی رخصت لے کر جا رہا تھا ۔ ڈنر ختم ہونے پر میں اپنے خیمہ کی طرف جا رہا تھا ۔ کہ دور سڑک پر میں نے کیفی کی سیاہ واکس آل " کو جاتے دیکھا اس وقت رات کے ساڑھے بارہ کا عمل تھا اور وہ سر پھرا اس ریاکار عورت کی دیوانگی میں گرفتار اسے ملنے جا رہا تھا ۔

اگلے ہی روز وہ رخصت لے کر چلا گیا مگر جلد ہی یہ خبر قصبہ میں پھیلتی پھیلتی ہمارے کیمپ تک بھی آ پہنچی کہ نگار ۔۔۔ تھیٹریکل کمپنی کی مقبول عام رقاصہ کہیں فرار ہو گئی ہے ۔ اس خبر سے سارے قصبہ میں جوش کا مظاہرہ ہونے لگا لوگوں نے اعلانیہ کرنل کیفی پر الزام دیا ۔ کمپنی کا مالک بذات خود کمانڈنٹ کے پاس شکایت لے کر آیا مگر کمانڈنٹ جیسا غیور افسر کسی صورت بھی ایک افسر اعلیٰ پر ایسا گھناؤنا الزام برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے مینجر سے صاف کہہ دیا کہ کرنل کیفی ہرگز اغوا جیسے شنیع فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا اس کی آرٹسٹ اتفاقیہ ایسے موقعہ پر فرار ہوئی کہ ادھر کرنل رخصت پر جا رہا تھا مینجر شیرازی سخت بددل اور پریشان حال واپس چلا گیا ۔ گو کمانڈنٹ نے مینجر کو کورا جواب دے دیا لیکن وہ حقیقت حال سے ناواقف نہ تھا اس نے اپنے طور پر کرنل کے خلاف محکمانہ تحقیقات کا حکم دے دیا ہے اور خفیہ کارروائی کے بعد قیاس اغلب ہے کہ اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ۔ مگر رخصت کے اختتام پر یونٹ میں سب سے یہی کہا گیا کہ کرنل نے مزید رخصت لی ہے تاہم اس کے بعد اسے کہیں بھی دیکھا نہیں گیا ۔ البتہ ایک موقعہ پر میں نے کراچی میں نگار کو دیکھا ۔ وہ ایک دکان سے کچھ چیزیں خرید رہی تھی ۔ کہ میں بھی

اتفاقیہ اُسی دکان کے اندر چلا گیا اور اس کے عین مقابل کھڑا ہو کر اپنی مطلوبہ اشیاء دیکھتا رہا لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس وقت سے پیشتر مجھے دیکھا ہی نہ ہو ۔۔۔! میں کہتا ہوں دوست غضب کی پُرفن اداکارہ ہے وہ عورت! یوں اجنبی بن گئی کہ بس کیا کہیئے! اتنے ہی میں اسی دکان کے مردانہ ڈیپارٹمنٹ سے ایک شخص کئی پیکٹ اور ڈبے دکان کے ملازم چھوکرے پر لدوائے ہوئے نکلا اور نگار بھی اس کے ساتھ ہی باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی پر بیٹھ گئی میں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ساتھی کی شکل وصورت ڈیل ڈول بالکل کسی بن مانس جیسی تھی، خبر نہیں وہ ایسے کریہہ منظر آدمی کے پہلو میں بیٹھنا کیسے برداشت کر سکتی تھی اور کرنل کیفی جیسے جدید شخص کو چھوڑ کر وہ اس ہنومان کے ساتھ کہاں پھر رہی تھی۔ وہی مثال تھی کہ پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت!" — میں کہتا ہوں سعید! ایسی عورتوں کا مطمع نظر دولت کے سوا کچھ نہیں ہوتا محبت محض ان کا ڈھونگ اور دام فریب ہوتا ہے۔ تم اس خلجان کو اپنے ذہن سے نکال دو اور اپنا کام کاج دیکھو۔ احمق لڑکے! تم نے اس حرافہ کے لئے اپنی اتنی اعلیٰ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ خدا سمجھے تم سے!"

وہ اپنی تقریر ختم کرتے کرتے یک دم خفگی کے مارے سعید پر برس پڑا۔ سعید اس کی طرف دیکھتے ہوئے ویران جیسی مسکراہٹ چہرے پر لایا۔

"یہ کتنے عرصہ کی بات ہے کہ تم نے اُسے دیکھا؟" وہ پوچھنے لگا۔

اس بات کو مہینہ بھر ہو گیا۔ بلکہ مہینے سے بھی زیادہ" اس نے جواب دیا۔

"ہوں!" سعید نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"یعنی کیا سمجھے؟" اصغر اس کی معنی خیز "ہوں" پر پوچھنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ ہٹلر شیرازی کا عندیہ درست ثابت ہوا۔ وہ چند ہی ماہ کے بعد اُسے چھوڑ کر چلا گیا ہوگا۔ اور وہ واپس ذاکر کے پاس چلی گئی ہو

گی۔" سعید نے قیاساً کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے کہ وہ بدرو شخص ذاکر ہی ہو۔"

"میں نے بارہا تم سے ذاکر کا حلیہ بیان کیا ہے — خوب سانولی اور داغ دار رنگت، تنگ پیشانی چپٹی ناک موٹے موٹے ہونٹ۔ چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں، گرانڈیل، چوڑا چکلا سینہ۔ سینہ تان کر اور بازو پھیلا کر بڑی رعونت سے چلتا ہے۔"

سعید نے زیر بحث آدمی کا حلیہ بیان کیا اور اصغر کی طرف استعجاب سے تکنے لگا۔

"بھئی اصل بات تو یہ ہے کہ میں اُس شخص کی مجموعی بدہیئتی میں اس درجہ محو ہو گیا کہ دہشت سے فرداً فرداً اس نقش و نگار کی ساخت کا مطالعہ نہ کر سکا اور چلنے میں بازوؤں کے پھیلائے رکھنے کا انوکھا انداز بھی دیکھنے سے محرومی ہوئی کہ وہ ان میں کئی چھوٹے بڑے پیکٹ سمیٹے ہوئے کار تک لے گیا تھا۔ ویسے تمہارا قیاس درست ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کی چال میں تو واقعی اس غضب کی رعونت تھی کہ بس کیا کسی شاعر کے محبوب کی رفتار میں ہو گی۔"

ذاکر کے تصوّر اور محبوب کے لفظ کے باہمی تفاوت اور تضاد پر سعید پر بے ساختہ ہنسی کا دورہ پڑا۔

"خدا ہی سمجھے تم سے!" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"کیوں؟ میں نے کیا کیا؟" وہ سنجیدگی اور معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"شرارت سے کبھی نہیں چوکتے۔" سعید نے کہا۔

خدا مجھے ایسی شرارت کی دن دوگنی رات چوگنی توفیق دے جس سے تم جیسے آدم بیزار کے منہ پر بھی ہنسی جیسا انسانی عمل پیدا ہو سکے۔ سچ کہتا ہوں رتی بسورتی شکلوں کو ہنسانا کار ثواب ہے۔ زیادہ نہیں تو نفل عبادت کے برابر تو ضرور ثواب ہو گا اس کا!" اصغر بدستور سنجیدگی سے کہہ رہا

تھا۔

"خدا غارت کرے تمہیں! یہ اپنی الگ شریعت بنائی ہے تم نے؟ کوئی مولانا سن پائیں تو یقیناً تمہیں الحاد اور شرک کا فتویٰ دے دیں!" سعید ہنس کر کہنے لگا۔

"چلو شکر ہے کہ کفر کے فتویٰ تک تو نوبت نہ پہنچے گی پھر بھی ۔ اور تمہاری کرتوت اگر مولانا مذکور کے کانوں تک پہنچے تو یقیناً تمہیں پکا کافر ہونے کا حکم لگا دیں۔" اصغر کہنے لگا۔

"کیوں میں نے کافروں والی کون سی بات کی؟" سعید حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"واہ! ابھی کوئی بات ہی نہیں کی! ایک بت کافر کے تصور میں ترک دنیا ترک عقبیٰ کئے بیٹھے ہو۔" اصغر کہنے لگا۔

"چلو چھوڑو یہ لغویات! کوئی مطلب کی بات کرو۔ ہاں تو اس کے بعد کبھی اتفاق ہوا کرنل یا نگار کو دیکھنے کا ۔ ؟" سعید سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔

"ارے! تم بھی نگار ہی کہنے لگے ۔ ؟" اصغر نے حیرت ظاہر کر کے کہا۔

"اس نے خود جو نام اختیار کر لیا اب وہی کہنا چاہیئے۔" سعید نے جواب دیا۔

"گویا سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے؟" اصغر ہنس کر کہنے لگا۔

"پھر وہی بک بک؟ اور جو میں نے پوچھا، اس کا جواب ہی غائب!" سعید پھر خفا ہو گیا۔

"کیا پوچھا تھا تم نے؟ کہ پھر میں نے کبھی نگار کو دیکھا یا نہیں؟ نہیں بھائی پھر میں نے اس ریاکار قطامہ کو کہیں نہیں دیکھا نہ خدا دکھائے" اصغر توبہ کے انداز سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

سعید نے کچھ جواب نہ دیا اور انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھامے

کسی گہری سوچ میں کھو گیا لیکن اصغر اُسے سوچنے کا موقع کب دیتا تھا۔
" ارے واہ! چل دیئے مراقبہ میں؟ اس نے بلند آواز سے کہا تو سعید بے اختیار چونک پڑا۔
سبحان اللہ! حضرت تو مراقبہ سے گزر کر معاشقہ کی حدود تک پہنچے ہوئے تھے! ایک ہم جیسے شکم کے بندے ہیں کہ مارے بھوک کے کسی لطیف احساس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" وہ ہنس کر کہنے لگا۔
" اوہ! ہاں سچ تمہیں تو واقعی بھوک لگ رہی ہو گی!"
سعید نے گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ جواب میں ملازم حاضر ہوا
کھانے میں کیا دیر ہے جلال؟ اب تو ڈیڑھ بجنے کو ہے؟" اس نے گھڑی کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
" کوئی دیر نہیں صاحب! میز لگ گیا میں اطلاع کرنے کو حاضر ہوا ہی چاہتا تھا۔"
اُس کے مہذب بٹلر نے کندھے پر پڑے ہوئے سفید تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
دیکھا، مراقبہ میں پڑے رہنے سے اتنی جلدی دعا قبول نہیں ہوتی جتنی جلدی کہ بھوک میں مانگی ہوئی دعا!" اصغر نے کرسی سے اُٹھنے میں سبقت کرتے ہوئے کہا۔
جلال اس بے تکلف مہمان کی بات پر مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔
" تمہیں اتنی ہی بھوک لگ رہی تھی۔ تو کیوں نہ تم نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا؟" سعید نے شکایت کے لہجہ میں کہا۔
" تم سے کیوں کہتا؟ تم سے تو مجھے خدشہ تھا کہ شاید کھانے کی عادت ہی بھول چکے ہو گے!"
اصغر نے اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے جواب دیا۔
دونوں کھانے کے کمرے میں آئے۔ شاندار، آراستہ ڈائننگ روم تھا خوش گوار برقی حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ نرگس کے تازہ پھول جا بجا گلدانوں میں

رکھے ہوئے تھے جن کی عطر بیزی سے فضا مہک رہی تھی اور میز پر چنے ہوئے لذیذ کھانوں کی مرغوب خوشبو سے خلط ملط ہو رہی تھی۔

"عابد کو اطلاع نہیں کی —؟" سعید پوچھنے لگا۔

"جی آ رہے ہیں —" جلال نے جواب دیا۔

"وہ کون صاحب ہیں؟" اصغر نے پوچھا۔ اُسے توقف ناگوار تھا۔

"میرے اسسٹنٹ ہیں — وہ آ جائیں گے تم شروع کرو۔" سعید نے کہا۔

"خیر آ جانے دو —" اصغر نے بے دلی سے کہا اور اتنے ہی میں عابد داخل ہوا، سعید نے تعارف کروایا۔

"ان سے ملو عابد یہ میرے عزیز اور دنیا میں واحد دوست کیپٹن اصغر علی ہیں۔"

"یہ نہ کہیئے گا صاحب ایک دوست تو آپ کا میں بھی ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اصغر سے مصافحہ کیا۔

"ہاں بھئی یہ بھی تم نے درست کہا تم تو میرے دکھ سکھ کے ساتھی ہو۔ ان کے علاوہ ایک تم ہی تو ہو جس کو میں دوست اور ساتھی کے پیارے لفظ سے بلا سکتا ہوں۔" سعید نے لمبا سا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

اصغر کی شگفتہ باتوں نے سعید کو بھی زندہ دلی بخش دی اور ہنسی خوشی کھانا کھاتے رہے۔ عابد اتنی ہی دیر میں اس کا مداح بن گیا اور اس سے استدعا کرنے لگا۔

"کیپٹن! خدارا کچھ دن رہیئے گا۔ تاکہ ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی ہنسنا بولنا سیکھ جائیں — انہوں نے تو ایک دم چپ سادھ رکھی ہے۔"

عابد کہنے لگا۔

دیکھئے گا کس طرح ہنسنا بولنا سکھاتا ہوں انہیں، میرے ہوتے یہ چپ

نہیں سادھ سکتے "۔ اصغر ہنس کر کہنے لگا۔

جب ہی عرض کیا کہ جتنے دن ممکن ہو، یہاں ہی قیام رکھیئے "۔

عابد نے دوبارہ استدعا کی ۔ اور کھانے کے دوران اسی قسم کی بے تکلفانہ باتیں ہوتی رہیں ۔

(۱۴)

اصغر اس دن واپس جا رہا تھا۔ اس نے دو ہفتے سعید کے ہاں قیام کیا اور یہ دو ہفتے گویا آنکھ جھپکتے گزر گئے۔ اس نے سعید کو یوں بہلائے رکھا کہ وہ اپنا دکھ بھول گیا۔

باتوں ہی باتوں میں اُس نے نگار کے لئے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس حقیقت کو اس کے ذہن نشین کر دیا۔ کہ اگر وہ نگار سے پھر جو ہر نکر اس کی طرف لوٹ بھی آئے تو وہ اپنا لینے کے قابل نہیں۔ جس عورت نے ایک دفعہ اُسے اس حد تک نظر انداز کیا۔ کہ نہ صرف اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا، بلکہ اپنی شخصیت کو بھی تسلیم نہ کیا وہ پُرفن اور ریاکار عورت محبت جیسے الوہی اور پاکیزہ جذبہ کی اہل نہیں۔ اور اصغر کی یہ باتیں بس اس حد تک اثر انداز ہوئیں جیسے مرہم سے کسی رستے ہوئے زخم پر عارضی سا اندمال آجائے۔

بظاہر وہ اپنے معمول پر آگیا۔ مریضوں کو توجہ سے دیکھنے لگا، سیر و تفریح میں دلچسپی لینے لگا، غرض عابد کی تمنا کے مطابق وہ اصغر کے اس

مختصر دورِ قیام میں "ہنسنا بولنا" سیکھ گیا۔ عابد بھی خوش اور ان کی پر لطف صحبتوں میں برابر کا شریک تھا۔ اس کے اور سعید کے درمیان تکلف اور رازداری کا جو پردہ حائل تھا وہ بھی اصغر کی بدولت اب اُٹھ گیا تھا۔ اصغر نے اُسے سعید کے درد سے خبردار کر کے اُسے بہلانے اور دلجوئی کرنے کا فرض بھی سپرد کر دیا تھا۔ عابد کو اپنے شریک کار سے اب محض ایک خودغرضانہ جیسا کاروباری تعلق نہ رہا تھا۔ بلکہ اب تو وہ اس کے دل کے قریب ہو کر سچا غمگسار بن گیا تھا۔ اور اس کے درد سے آشنا ہو کر اُس سے دلی ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور اصغر کو اپنی روانگی کے وقت اس بات سے اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دوست کو یکسر اکیلا چھوڑ کر نہیں جا رہا۔

وہ تین ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ پہلے دو ہفتے اس نے سعید کے پاس گزارے تھے اور اب گھر جا رہا تھا۔ کچھ ضروری چیزوں کی فہرست اس کی والدہ نے بھیجی تھی اور وہ سعید کو ساتھ لے کر مطلوبہ چیزیں خریدنے بازار گیا۔

"عجب مصیبت ڈالتے ہیں یہ لوگ! مجھے ایسی چیزوں کے متعلق خاک بھی تجربہ نہیں۔" وہ راستہ میں جھنجھلا رہا تھا۔

آخر کیسی چیزیں ہیں وہ جن کا خریدنا تمہیں "جوئے شیر" لانے کے برابر کٹھن محسوس ہو رہا ہے۔" سعید نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے مسکرا کر اس کے طرف دیکھا۔

"یہی کچھ ساڑھیاں، کچھ میک آپ کا سامان اور خبر نہیں کیا کیا الا بلا!" وہ جیب سے فہرست نکالتے ہوئے کہنے لگا۔

"اوہ! تمہاری دلہن کے لئے چاہیئں ہوں گی یہ چیزیں۔! لائیے یہ فہرست میرے حوالے کرو میں خود اپنی پسند سے سب کچھ خرید دوں گا!" سعید نے اس کے ہاتھ سے فہرست جھپٹتے ہوئے کہا۔

"دونوں کو مل کر ہی یہ مصیبت بھگتنی پڑے گی۔ اکیلے تم کیسے ایک دن میں یہ سب کچھ خرید سکتے ہو۔" وہ کہنے لگا۔

ایسے بدشگون کلمے کیوں زبان سے نکالتے ہو خدا نہ کرے کہ یہ مصیبت

ہو۔!" سعید نے ٹوکا۔"

اور نہیں تو۔ میں چاہتا تھا کہ آج کا دن تمہارے ساتھ خوب ہنسی خوشی اور تفریح میں گزرتا۔" وہ بددلی سے کہنے لگا۔

"تو یہ خدانخواستہ کوئی ناگوار کام تھوڑے ہی ہے۔ ساتھ ساتھ ہنسی خوشی اور تفریح بھی ہوتی چلی جائے گی۔ میں تمہیں ایک ایسی دکان پر لے آیا ہوں کہ ضرورت کی سب چیزیں تمہیں یہاں سے مل جائیں گی۔"

" اور سعید نے ایک بہت بڑی دکان کے سامنے کار ٹھہرا لی۔

"اچھا تم فہرست کے مطابق چیزیں نکلوا کر رکھو میں پہلے جا کر اپنے کپڑے لے آؤں جو اس روز ڈرائی کلین کرنے کو دیئے تھے۔ ایسا نہ ہو پھر بھول ہی جاؤں۔"

اصغر سعید کو چھوڑ کر خود کار ڈرائیو کر کے آگے بڑھ گیا۔

سعید نے دوکان میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ تصویر حیرت بن کر وہیں ساکت وجامد کھڑا رہ گیا۔ اس سے چند قدم آگے اس طرف پشت کئے ہوئے کاہی رنگ کی ساڑھی پہنے جو خاتون کھڑی تھی اس کا عکس سامنے والے قد آدم آئینہ میں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تو جوہر تھی! — اس کی جوہر نہیں بلکہ وہ بے مروت اور جفا پیشہ حسینہ جو اس کے خواب وخیال پر مسلط تھی! جوہر کوشش کے باوجود اس کے ذہن سے نکالے نہ نکل سکی تھی، جس کے ناپاک کردار سے اُسے انتہائی نفرت تھی مگر وہ پھر بھی اُسے چاہتا تھا۔ لیکن اس چاہت کے باوجود اگر وہ اسے مل سکتی تو وہ اُسے اپنانے سے انکار کر دیتا۔ کیونکہ انتہائی محبت بھی اس کی غیرت مردانہ اور عزت نفس کو کچل نہیں سکی تھی۔ یہی احساس تھا جس نے اُسے یک دم جھنجوڑ کر اس جمود کو توڑا اور یکایک پلٹ کر واپس نکلنے کو تھا کہ یک دم جوہر نے اُسے دیکھ لیا۔

"سعید —!"

اُسے اپنے عقب میں وہی شیریں جیسی پُر محبت آواز سنائی دی اور چشم زدن میں وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔

"سعید! تم —؟ وہ آنکھوں میں حیرت اور محبت کے اُبلتے ہوئے چشمے لئے اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سراپا کو اپنی نگاہوں میں بھر لینا چاہتی ہو اور جواب میں سعید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور اس پر وہی حیرت اور جمود چھا گیا اس کی گویائی مفلوج سی ہو گئی۔ آج کتنی مدت کے بعد وہی محبوب چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اس کے دل میں شکایات کا سمندر بھرا پڑا تھا لیکن اُس کے ہونٹوں پر سکوت کی مہر لگ گئی تھی، وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور وہ متواتر اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ لیکن یہ محض چند خفیف لمحوں کی بات تھی۔

"آہ! مجھے تم سے کیا کچھ کہنا ہے سعید! لیکن — وہ عفریت میرے ساتھ ہے اُس کے ارادے نہایت خطرناک ہیں۔ خدا کے لئے تم جلد یہاں سے ٹل جاؤ۔ ہو سکے تو شہر سے باہر چلے جاؤ۔ وہ تمہاری تلاش میں ہے!" وہ ایک ہی سانس میں سرگوشی کا لہجہ - - - - - - اختیار کئے کہتی۔

"مگر جوہر — تم - تم نے —" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جوہر نے قطع کلام کر کے کہا۔

"مجھے اعتراف ہے سعید! میں جانتی ہوں جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو لیکن میں مجبور تھی — انتہائی مجبور۔! لیکن ان سب باتوں کا یہ موقعہ نہیں پھر کبھی سہی — فی الحال تم جلدی یہاں سے چلے جاؤ —" وہ التجا کرنے لگی۔

مگر کون ہے تمہارے ساتھ۔! کرنل کیفی؟" سعید نے پوچھا۔

"کون —؟ نہیں نہیں! میرے ساتھ ذاکر ہے۔ بس وہ آتا ہی ہوگا! وہ گھبراہٹ میں پیچھے دیکھ کر کہنے لگی۔

لیکن میں کیوں جاؤں —؟ ذاکر ہے تو کیا ہوا —؟ سعید نے کہا۔

خدا کے لئے میرا کہا مانو سعید! وہ تمہارا جانی دشمن ہے۔" وہ کہنے لگی۔

"تو مجھے اب جان کی پروا نہیں —! مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے جسے

تم نے جہنم سے بدتر بنادیا۔" وہ گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔

یہ ایسی باتوں کے لئے موقعہ و محل نہیں ہے سعید ۔! للہ!

میری خاطر، جو میں کہوں کرو ۔! میں تمہیں ملنے کی کوشش کروں گی۔

اس وقت جاؤ ۔!"

وہ گھبراہٹ میں اُلجھی اُلجھی باتیں کر رہی تھی۔ سامنے سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ سے ٹھہراتے ہوئے بولی۔

"خدا حافظ ۔ جلدی کرو وہ آ رہا ہو گا ۔"

وہ خدشہ کے ماتحت دھیمی آواز سے بولی۔ مگر سعید بدستور متامل تھا۔

"للہ !" اس نے اس قدر منت اور پیار سے کہا۔ کہ وہ انکار نہ کر سکا اور ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے بولا۔

خدا حافظ جوہر ۔! وعدہ یاد رکھنا ۔ اس لمحہ کے بعد میں ہر گھڑی تمہارا منتظر رہوں گا۔ یہ ہے میرا کارڈ ۔!"

جوہر نے کارڈ لے کر جلدی سے اپنے بیگ میں رکھ لیا اور ٹیکسی چل دی۔

اصغر دوکان سے نکل ہی رہا تھا۔ کہ سعید پہنچا وہ اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔

"خیر باشد ۔؟" وہ اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

سعید نے ٹیکسی کو رخصت کیا اور کار میں آ بیٹھا۔

میں پوچھ رہا تھا کہ خیر گزری ؟ کیا اُس دوکان سے کسی نے نکال باہر کیا حضور کو ؟"

وہ سعید کے پہلو کی نشست پر بیٹھے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں ۔!" اور وہ بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

کیا ہوں ۔؟" اصغر نے منہ اوپر اٹھا کر اس کی نقل اتاری۔

کہ دکان سے نکال دیا گیا اور کیا — ؟ سعید کہنے لگا اور پھر قدرے توقف سے اس نے اچانک جوہر سے ملاقات کا حال کہہ سنایا۔

" تم نے اس چڑیل سے اتنا تو پوچھا ہوتا کہ اب تمہیں کیسے پہچانا اس نے؟" اصغر چڑ کر کہنے لگا۔ اس کی اتنے دن کی ریاضت محض بیکار ہو کر رہ گئی صاف ظاہر تھا کہ اس وقت جوہر کی ایک ہی نگاہِ التفات اُس تمام بے اعتنائی کی تلافی کر گئی تھی جو اس نے نگار کے روپ میں اس کے ساتھ روا رکھی تھی اور اب وہ یوں تمتمایا ہوا چہرہ لئے باغ باغ ہو رہا تھا جیسے وہ اس عورت کے ہاتھوں کبھی رویا ہی نہ ہو۔

اچھا تو اب وہ آنے کا وعدہ کر گئی تم سے ؛ چنانچہ اب تمہارے وہاں میرے پاس آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ وعدے تو خود بخود ہی "کینسل" سمجھنے چاہییں !" اصغر نے تلخی بھرے لہجہ میں طنز سے کہا۔

یعنی تمہاری شادی پر آنے کا وعدہ — ؟" سعید نے پوچھا۔

" ہاں ! اور نہیں تو کیا میرے مر —" وہ غصہ میں کچھ کہنے کو تھا کہ سعید نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

" خبردار جو کوئی منحوس بکواس کی — ! آپ آپ ہی بڑبڑا رہے ہو ! " میں نے کب کہا کہ نہیں آؤں گا۔" سعید نے کہا۔

کہا نہیں مگر ظاہر تو یہی ہے کہ جب ایک غیر معین عرصہ کے لئے پابند ہو کر بیٹھ کر انتظار کرو تو کیسے آؤ گے ؟" اصغر نے خفگی سے کہا۔

" کیا وہ یہاں مہینوں بیٹھ رہے گی ؟ آج ہی کل میں کسی وقت موقعہ پا کر چلی آئی یا کیا خبر مجھے وہاں سے ٹالنے کو کہہ دیا ہو۔ بہر حال تمہارے پاس میں اپنے وعدہ کے مطابق ضرور پہنچوں گا۔" سعید نے اب کے ایک اور دکان کے سامنے کار روکی اور دونوں اتر کر اندر چلے گئے۔ چیزوں کے انتخاب میں سعید خاصی دلچسپی لے رہا تھا مگر اصغر مسلسل بددل اور خاموش رہا۔ اس کے اُس مرحلہ پر جب کہ وہ اس کی یاد کو سعید کے ذہن سے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوہر کا اس طرح پھر منظر پر آجانا بے حد ناگوار گزرا۔ وہ نہیں چاہتا تھا

کہ ایک ایسی اخلاق باختہ عورت اس کے عزیز دوست کی زندگی میں داخل ہو جسے کسی مرد کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اور کبھی دوسرے کے ساتھ. گاہ وہ کسی روپ میں نظر آتی تھی گاہ کسی روپ میں کبھی کسی نام سے، گویا وہ کسی خاص شخصیت کی حامل تھی نہ کسی خاص حیثیت کی پابند، شرم و حیا کی بجائے اس کے چہرے پر اسرار کا نقاب تھا۔ غیرت اور عزت کی بجائے وہ کسی مکروہ راز کا لبادہ اوڑھے پھر رہی تھی۔ اُسے تو ایسی عورت سے سخت نفرت تھی ۔" ایسی عورت کیا معنی، اُسے تو یکسر عورت ذات ہی سے نفرت ہو گئی تھی ۔ جب عاصمہ نے اسے نظر انداز کر کے اس کے متمول حریف سے شادی کر لی تو اس نے عہد کر لیا تھا کہ کبھی کوئی عورت اس کی زندگی میں داخل نہ ہوگی ۔ ماں کی حیثیت سے اگر عورت کے ساتھ لازمی لگاؤ، ایک فطری مجبوری نہ ہوتی تو وہ شخص شاید ماں سے بھی قطع تعلق کر چکا ہوتا۔ اب ایک عرصہ کے بعد وہی لازمی لگاؤ وہی فطری مجبوری ایک مرتبہ پھر اس کے عزم کی سنگلاخ چٹان سے نبرد آزما ہوئی تھی اور آنسوؤں اور منتوں کی آہستہ رو سرنگ لگاتے لگاتے آخر خفگی، غصہ اور دھمکیوں کا ایسا بارود پھونکا کہ وہ چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اُسے شادی کر لینے پر مجبوراً آمادہ ہونا پڑا۔ اور اس وقت خبر نہیں کیوں اس کی زندگی کی ساری تلخیاں اس کے حافظہ میں ابھر آئی تھیں ۔

" ارے کچھ تم بھی تو بولو! کیا مجسمہ بنے بیٹھے ہو ۔!"

سیلز مین فرمائش کی اور چیزیں لینے گیا تو سعید نے موقعہ پا کر اصغر کو جھنجھوڑا ۔

" مجھے کچھ سمجھ نہیں۔ نہ عورتوں کی چیزوں کے انتخاب کا کچھ ڈھب ہے تم لسٹ کے مطابق لے لو جو کچھ مناسب سمجھو!"

اس نے بیزاری سے کہا اور منہ پھیر لیا۔

" واہ! خوب ہے! تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے یہ تمہاری شادی کا نہیں کسی ایسے آدمی کی شادی کا سامان ہے جس سے تمہیں کوئی دلچسپی نہ ہو" سعید کہنے لگا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میری شادی نہیں بلکہ محض میری امی کے چاؤ کی شادی ہے۔ وہ اپنے دل بہلاوے کے لئے ایک گڑیا بیاہ کر لا رہی ہیں اور وہ گڑیا انہیں کا دل بہلایا کرے گی۔ میری شریکِ حیات نہ بن سکے گی۔"

وہ تلخی میں اپنا رازِ دل کہہ گیا۔

"وہ کیوں — ؟" سعید نے پوچھا۔

"جیسے تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں — !" وہ بولا۔

"کم از کم اس کی وجہ معلوم نہیں جو عندیہ تم نے اس وقت ظاہر کیا۔" سعید نے کہا۔

اصغر کچھ نہ بولا۔ سیلز مین سامان لئے ہوئے آ گیا تھا۔ سعید نے اپنی سمجھ اور پسند کے مطابق چیزیں منتخب کر کے پیک کروائیں اور کار میں رکھوا کر واپس آئے۔ راستہ میں سعید نے اصغر کو خاموش پا کر وہی ذکر چھیڑا۔

"ہاں بھئی تم نے وجہ نہ بتائی کہ آخر کیوں تم اپنی ہونے والی بیگم کو شریکِ حیات تسلیم نہ کرو گے۔ بلکہ وہ محض خالہ جان کے دل بہلاوے کی گڑیا بن کر زندگی بسر کرے گی — ؟"

سعید نے کھلی سڑک پر بے فکری سے کار کو تیز رفتار پر چھوڑتے اپنے دوست سے مواخذہ کیا۔ اصغر نے توقف کرتے ہوئے چند لمحے غور سے سعید کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کے تجاہل پر جل ہی گیا ہو —

"اس لئے کہ میرے دل سے اس مخلوق کے لئے جسے عورت کہتے ہیں اعتماد دائمی طور پر تلف ہو چکا ہے۔ اور اپنے پہلے تلخ تجربہ کے بعد عہد کر لیا ہے کہ اب کوئی عورت میری زندگی میں نہ آئے گی —"

وہ دکھ بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔ جیسے اس ہر وقت ہنسنے والے شخص کا دل اندر سے رو دیا ہو۔

"خدا بچائے! سخت زہرناک آدمی ہو — ! مگر بندۂ خدا ایک کے

قصور کی سزا دوسرے ناکردہ گناہ کو دنیا کہاں کا انصاف ہے — ؟ سعید پوچھنے لگا۔

ناکردہ گناہ کبھی سزا نہیں پاتا۔ اور سزا پانے والا کبھی یکسر معصوم نہیں ہوتا یہ الگ بات ہے کہ بادی النظر میں اُس نے جس غلطی کی سزا بھگتی اس کا وہ واقعی مرتکب نہ ہوا ہو۔ بلکہ وہ اس گناہ کی سزا بھگت رہا ہو۔ جس کا اقدام کر کے وہ صاف بچ گیا اور بادی النظر میں بے گناہ و بے خطا بنا رہا — قدرت نے اُسے مہلت دے رکھی مگر اس نے اپنی خطا کو تسلیم نہ کیا، اپنی غلطی کی تلافی کرنے کی کوشش نہ کی تو قضا و قدر نے اُسے کسی اور عذر میں پکڑ کر قرار واقعی بدلہ دلوا دیا قدرت ناانصاف نہیں ہے میرے بھائی —

اصغر نے سنجیدگی سے تقریر کی —

" آداب عرض ہے مولانا! آپ تو واقعی مخزنِ معانی اور خزینۂ اسرار ثابت ہوئے! بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ ایسے پرمغز نکتے اس ننھے جیسے بے مغز سر میں بھرے پڑے ہیں؟ بھئی واہ وا! ایک ہی زناٹے دار تقریر جھاڑ کر آنکھیں کھول دیں کہ بس کیا کہیے!" سعید نے سر خم کر کے عجب انداز سے آداب بجالاتے ہوئے کہا۔

" اب قائل ہوئے؟ تم کیا ہو، میں تو تمہارے فلک کو بھی قائل کر کے چھوڑدوں!"

اصغر نے فخریہ انداز اختیار کر لیا۔

کیوں نہیں — کیوں نہیں — ! مگر ایک نکتہ ابھی وضاحت طلب اور رہ گیا ؛" سعید کہنے لگا۔

" وہ بھی پوچھ ڈالو — !" اصغر نے اینٹھ کر کہا وہ پھر موڈ میں آچلا تھا —

" تو کیا اس مفروضہ کو اپنے لئے وجۂ تسلی بنائے رکھنے میں تم حق بجانب ہو گئے۔ کہ تمہاری بے التفاتی اور عدم توجہی سے تمہاری ہونے والی بیوی کو جو روحانی کوفت اٹھانی پڑے گی وہ اس کی کسی سابقہ غلطی کی سزا ہوگی؟

سعید نے پوچھا۔

عین ممکن ہے! کیا عجب کہ اس نے بھی کسی ایسے شخص سے بے وفائی اور وعدہ خلافی کر کے اس شادی کا اجارہ منظور کر لیا ہو۔ جو ظاہری جاہ و حشمت۔ دولت و ثروت کے لحاظ سے مجھ سے کمتر ہو اور سچی محبت کے سوا تہی دامن و تہی دست ہو۔!"

اصغر نے یک دم جوش میں بھر کر پُر زور لہجہ میں کہا۔ کسی خیال سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔
آنکھوں میں عجیب قسم کی تلخی بھر گئی۔ اس کے لہجہ سے گہری طنز کا زہر ٹپک رہا تھا۔

تم ہر لڑکی کو عاصمہ کے وزن سے ہی تولنے لگو یہ محض تمہاری ہٹ دھرمی اور دلیل باطل ہے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔!"
سعید کہنے لگا۔

" یہ مقولہ کسی ظاہر بین بزرگ نے انگلیوں کی ظاہری ساخت کے متعلق فرما دیا ہو گا۔ دیکھنے میں بے شک چھوٹی بڑی اور مختلف ہیں لیکن عمل اور افادیت کے لحاظ سے بلاشبہ یکساں ہیں۔ اپنی اپنی جگہ پر انگلی ضرورت کے لحاظ سے لازمی ہے۔ قوت اور باہمی تعاون میں سب برابر ہیں۔ ان کی خاصیت میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا میں یہی کہوں گا۔ کہ اوصاف کی رو سے سب انگلیاں اور سب عورتیں برابر ہیں۔!" وہ بحث کے انداز سے سنجیدہ ہو کر بولا۔

کیا کہنے ہیں تمہاری اس کج بحثی کے! اگر یونہی ہے تو کیوں نہیں انکار کر دیتے شادی کرنے سے؟ کیوں ایک لڑکی کو خواہ مخواہ مصیبت میں گرفتار کرتے ہو ۔؟ سعید نے بگڑ کر کہا۔

کوئی میری مانے بھی ۔! امی کو تو بس ہو چاہیے۔ اپنی تمناؤں کے سامنے انہیں نہ کسی لڑکی کے مستقبل کا احساس ہے نہ اپنے بیٹے کے جذبات کا پاس۔ انہیں تو بس یہ اندھا دھند اعتماد ہے کہ بیاہ کے بعد

سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے ۔

اصغر کہنے لگا ۔

خدا ان کے اس اعتماد کی آبرو رکھے اور واقعی سب کچھ ٹھیک ہو جائے !"

سعید نے کار کو ڈرائیو پر روکتے ہوئے پر عقیدت لہجہ میں کہا اور مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا ۔

دورِ ثانی

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

میرزا غالبؔ

(۱۴)

اصغر کی روانگی کے بعد سعید نے کچھ دن تو انتظار کی پُر امید آویزش میں گزارے۔ اُمید و بیم کے خوش گوار و ناگوار مد و جزر میں ڈولتا رہا۔ پھر امید و انتظار نے اضطراب کا رنگ اختیار کیا۔ بے قراری کا روپ بدلا اور بالآخر یاس کی تاریکیوں نے ایک دفعہ پھر اُسے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ایک دفعہ پھر اس پر اضمحلال اور زندگی کی تلخیوں نے غلبہ پالیا۔ ان دنوں وہ یکسر جمود اور زندہ درگور حالت میں پڑا ہوا تھا۔ کہ ایک دن اصغر کا ٹیلی گرام موصول ہوا۔ اُس نے فوراً پہنچنے کو لکھا تھا۔ اس فوری طلبی پر وہ حیران ہوا کہ کون سی غیر معمولی بات ہو گئی کہ اصغر اُسے باہمی طے شدہ تاریخ سے دو ہفتے پہلے بلا رہا ہے۔ بہر حال اُس نے کوشش کر کے اپنے تساہل اور مردہ دلی پر قابو پایا اور تیار ہو کر روانہ ہوا۔

اصغر اُس کے خیر مقدم کے لیے اُسٹیشن پر موجود تھا۔ وہ حسب معمول بے تکلفانہ گرم جوشی کے ساتھ سعید سے بغل گیر ہوا۔ اور پھر دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے اپنے سے ذرا دور ہٹاتے ہوئے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

" ہوں — ! مسٹر مجنوں کے چہرے پر غم لیلے کے نشان ثبت ہیں ؟
میرا بھولا بھالا غریب دوست !"

اس نے گرد وپیش کے ہجوم سے احتیاط رکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ مگر اُس کے لہجہ کی مٹھاس اور انتہائی دردمندی کا جوش واضح تھا۔ سعید نے محبت بارنگاہ سے اپنے غمگسار دوست کی طرف دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ قلی مختصر سامان اُٹھائے ان کے آگے آگے چلا۔ باہر اصغر کی کار منتظر تھی۔ دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

" خیریت ہے — ؟ میں تمہاری اس فوری طلبی سے پریشان ہو گیا" سعید نے راستہ میں کہا۔

" گھر چل کر سب کچھ بتاؤں گا۔ کیا جلدی ہے ؟" اصغر نے سادگی سے کہا۔ مگر اس کے چہرے سے جیسے کوئی اہم بات پھُوٹی پڑتی تھی۔ خدا خدا کرکے گھر پہنچے۔ اصغر نے اپنے کمرے کے ساتھ والا کمرہ اصغر کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اس کا سامان اتروایا گیا۔ اصغر کی امی نے بیٹے کے عزیز دوست کا مشفقانہ خیر مقدم کیا۔ نہایت محبت سے خیر وعافیت پوچھی، اس کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔

" غسل خانہ میں گرم پانی موجود ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کرلو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی۔ سعید تو شاید شام کو جلد ہی کھانا کھا لینے کے عادی ہوں گے ——— ڈاکٹر جو ہوئے "۔

" جی نہیں ڈاکٹروں کے ایسے احتیاطی مقولے دوسروں کے لئے ہوتے ہیں اپنے لئے نہیں۔ علاوہ ازیں ان کا نظریہ ہے۔ بلا وقت کی پابندی کے جس وقت بھوک لگے اُس وقت کھاؤ اُور بھوک ان کو شاذونادر ہی لگتی ہے ——— ! چنانچہ یہ کھانا بھی کبھی کبھار کھاتے ہیں !"
سعید کی بجائے اصغر نے جواب دیا۔ اس کی امی ہنسنے لگیں۔

" اب لگے ہو تم اپنی عادت کے مطابق آتے ہی انہیں تنگ کرنے ؟

ابھی دم تو لینے دو۔"

وہ کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ اصغر لباس تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سعید نے بھی اپنے کمرے میں جا کر سامان درستی سے رکھوایا اور کپڑے تبدیل کئے۔ کھانے کی میز پر یہ دونوں ہی تھے۔ سعید کے استفسار پر اصغر نے اُسے گھورا۔

ارے بھئی تمہیں بلوایا ہے تو آخر بتاؤں گا سب کچھ۔ آرام سے کھانا تو کھا لینے دو!"

ڈانٹ کھا کر سعید پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ گو اشتہا مطلق نہیں تھی مگر اصغر کے ڈر سے چار و ناچار کھا رہا تھا۔

"عجب بے دلی سے کھا رہے ہو۔ جیسے کسی نے گھاس تمہیں کھانے کو دے دی ہو! امی نے مجھ سے پوچھ پوچھ کر تمہاری پسند کی چیزیں تیار کی ہیں۔ نہ کھاؤ گے تو مفت میں مجھے ڈانٹیں گی۔" اصغر نے خفگی سے کہا۔ مہمان داری کے اس نرالے طریقہ پر سعید مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"کھا تو رہا ہوں اور کیا کروں؟" وہ بولا۔

"یہ پسندوں کے کباب اور لو امی نے خود بنائے ہیں۔ اور یہ روغن جوش تو تم نے چکھا تک نہیں۔" اصغر نے اُس کی پلیٹ میں خود سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

"اسے بھائی! میں اپنی ضرورت کے مطابق خود لے رہا ہوں۔ میں کوئی مہمان ہوں کہ تکلف کروں؟" سعید نے ہنس کر کہا۔

"مہمان سے بدتر ہو ———!"

اس کی اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ اصغر کی امی میٹھے کا قاب لئے ہوئے داخل ہوئیں تو وہ مارے ہنسی کے لوٹ ہو رہے تھے۔

"کیا ہوا ———؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگیں۔

"آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میں مہمانوں سے بدتر ہوں!" سعید نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی تو ایسی ہی باتیں ہیں ——!" وہ بھی ہنس دیں۔

"امی جان! کہیں ہمیں آپ کا انتظار تو نہیں کرنا تھا! ہم کبھی کے کھانا شروع کر چکے اور آپ اب آئیں ——" اصغر یک دم کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں بھائی! تم شوق سے کھاؤ۔ میں تو بہت پہلے کھا چکی —— اب تو میں یہ میٹھا لے کر آئی ہوں۔ یہ گرم گرم کھایا جائے تو اچھا لگتا ہے۔ اس لئے تم نے کھانا شروع کیا تو میں یہ تیار کرنے لگی تھی —— لو کھاؤ ——! اور ہاں بیج کھانے کے بعد چائے پیتے ہیں یا کافی؟" وہ پوچھنے لگیں

"چائے ——! وہ گلابی والی نمکین اور بالائی دار چائے جو آپ بنایا کرتی ہیں۔" اصغر نے جواب دیا۔

"یہ تمہاری فرمائش ہے یا سعید کی؟" وہ ہنس کر پوچھنے لگیں۔

"مضمون واحد ہی سمجھئے۔ میں اور سعید دو تھوڑے ہی ہیں —— کیوں سعید؟"

اصغر کی امی ہنستی ہوئی واپس چلی گئیں۔ اصغر اور سعید چند منٹ بعد ڈرائینگ روم میں پہنچے تو چائے کے لوازمات موجود تھے۔ سعید نے کچھ کہنا چاہا تو اصغر نے قطع کلام کر کے کہا۔

"چین سے چائے پی لو پھر باتیں ہوں گی۔"

چند منٹ بعد اصغر نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے سعید کے استفسار کے بغیر ہی کہنا شروع کیا۔

"ہمارے مکان کے نیچے کا حصہ کرایہ پر دیا ہوا ہے۔ اس میں رہنے والے دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں۔ کوئی دس روز ہوتے کہ میں ایک دوست کے ہاں سے رات گئے واپس آیا۔ خیالات کچھ اس طرح الجھے کہ دیر تک نیند نہ آئی میں

خاصی دیر کتاب پڑھتا رہا کہ شاید یوں ہی نیند آجائے مگر بے سود۔ کوئی ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا کہ دروازہ پر ایک کار ٹھہری اور نیچے کے حصہ میں برقی گھنٹی کی آواز گونجی کوئی مریض آیا تھا میری طبیعت مطالعہ سے بھی اکتا چکی تھی میں بلا ارادہ ہی اٹھا اور دریچہ کھول کر اپنے کمرے کے سامنے کی بالکنی میں کھڑا ہوگیا۔ اتنے ہی میں گھنٹی کے جواب میں ڈاکٹر کے ملازم نے بھی صدر دروازہ کھولا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا —— تو یک دم میرا دل دھک سے رہ گیا —— بھلا بوجھو تو سہی نیچے میں نے کس کو کھڑے دیکھا —— ؟" وہ سعید سے پوچھنے لگا۔

"میرا تو ذہن کام نہیں کرتا —— تم ہی بتاؤ کون تھا؟" سعید نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کرنل کیفی —— !" اصغر کے منہ سے یہ الفاظ کیا نکلے کہ سعید کے دماغ میں گولی کی طرح سنسناتے ہوئے گھس گئے وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہوں —— تو پھر —— ؟" اس نے فرطِ استعجاب سے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے غور سے اپنے دوست کو گھورا۔

وہ ڈاکٹر کے متعلق کچھ آہستہ آہستہ پوچھتا رہا۔ میں سُن نہیں سکا۔ کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ مگر اتنے ہی میں ڈاکٹر فیاض خود باہر آگیا۔

"ہلو! کرنل! میں سہ پہر کو آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آپ نے آج شام پانچ بجے ہی میڈم کو لے کر آنے کے لئے کہا تھا نا —— ؟"

ڈاکٹر فیاض نے اپنی عادت کے مطابق پوری آواز سے کہا۔ کرنل نے زیر لب جواب دیا جسے میں سن نہ سکا۔

"آگئیں —— ؟ تو اندر لے آیئے نا انہیں!"

ڈاکٹر فیاض نے پھر بلند آواز سے پکار کر کہا کرنل نے کار کے پاس آکر دروازہ کھولا اور ایک عورت لمبے کوٹ میں لپٹی ہوئی باہر نکلی۔ میں نے پہچانا کہ وہ نگار رہتی ——"

نگار —— ؟ یعنی —— اے —— ا ے" سعید بے طرح ہکلایا

"یعنی تمہارے لفظوں میں —— جوہر —— اخیر تحمّل سے سنتے جاؤ یہ ابابات

بات پر چونک جاؤ گے تو یقیناً پھر "نروس بریک ڈاؤن" کا شکار ہو جاؤ گے۔ خیر جیسا کہ میں تمہیں بتانے کو تھا۔ وہ سب لوگ اندر چلے گئے۔ اور میں فرطِ حیرت و استعجاب سے بے حال ہو گیا کہ آخر اس عورت کو کیا تکلیف تھی، کہ وہ باوجود وعدہ کے روزِ روشن میں ڈاکٹر کے ہاں نہ لائی جا سکی۔ بلکہ یوں آدھی رات کے وقت، پراسرار طور پر، چھپا کر لائی گئی۔ میں لپک کر صحن کی طرف والے کوٹھے پر گیا۔ اور حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لئے اخلاق کی حدود سے گزر کر دوسرے کے گھر میں جھانکنے تک کو گوارا کر لیا۔ میری اس حرکت کے لئے یہ کافی جواز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں کوئی جوان لڑکی نہیں۔ صرف ایک نو عمر لڑکا صفدر ہے جو میرا خاصہ دوست ہے اور میں اُسے اکثر اوپر کھڑا ہو کر پکار لیا کرتا ہوں —— خیر میں نے جھانک کر دیکھا تو ڈاکٹر فیاض کی بیوی ڈاکٹر شمسہ مریضہ کو زنانہ مطب کی طرف، معائنہ کے کمرہ میں لے جا رہی تھی —— میں وہیں کھڑا رہا، خاصے پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میری پسلیاں مارے ٹھنڈک کے اینٹھ رہی تھیں لیکن میں اپنا بڑا کوٹ لینے کے واسطے اندر نہیں جا سکتا تھا —— مبادا ادھر کوئی کار آمد منظر میری نگاہوں سے چوک جائے —— آخر ڈاکٹر شمسہ اپنے مطب سے نکل کر ڈاکٹر فیاض کے کمرہ کی طرف آئی۔ جہاں وہ کرنل کیفی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا —— اُس نے غالباً اپنے شوہر کو کچھ خاص بات کہنے کے واسطے الگ بلایا تھا۔ کہ وہ دونوں عین دروازہ میں کھڑے تھے۔ شمسہ نے شاید اپنے معائنہ کی رپورٹ شوہر کو دی۔

"اچھا ——!" ڈاکٹر فیاض نے بڑے پر اہمیت اور ساتھ ہی فکر مندانہ لہجہ میں کہا۔ اور چشم زدن میں کرنل بھی اُن کے قریب آ گیا۔ پھر وہ تینوں کمرے کے اندر چلے گئے۔ کافی دیر کے بعد ڈاکٹر فیاض اور کرنل باہر نکلے، میں لپک کر پھر بالکنی میں پہنچا۔

ڈاکٹر کرنل کے ساتھ کار کے قریب کھڑا ہاتھ ملا رہا تھا۔

"کوئی فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔ کرنل زیرِ لب کچھ بڑبڑایا۔

"بہت بہتر ——!"

ڈاکٹر نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ اور کرنل کیفی اکیلا کار میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ اصغر بیان کر رہا تھا۔ سعید کے ہونٹ خشک ہوتے جاتے تھے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ جیسے عالم خواب میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔

"تو ——— تو کیا وہ ———؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں پھندا بن کر گھٹ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے ساتھ استفسار پیدا ہوا۔

"ہاں ——— نگار یہیں اس مکان میں موجود ہے۔ گو اس کی موجودگی کو ان لوگوں نے خفیہ رکھا ہوا ہے ——— اگلے دن صفدر مجھے ملنے آیا تو میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے پوچھا۔ کہ کیا ان کے ہاں مریضوں کے لئے باقاعدہ کمرے بھی مخصوص ہیں اور بیک وقت کتنے مریض رکھے جانے کا انتظام ہے مگر وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگا اور بتایا کہ مریضوں کے لئے شب و روز رہنے کا تو کوئی انتظام نہیں وہ دن میں مشورہ کے لئے آتے ہیں اور ہدایات لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس جواب پر میں حیران ہوا۔

"کیا آجکل تمہارے ہاں ایک مستقل مریضہ نہیں رہتیں ———؟"

میں نے پوچھا۔

"نا نہیں ——— کوئی بھی نہیں ———" لڑکے نے یکسر انکار کیا اور میں غور سے اس کی طرف دیکھ کر اندازہ کرنے لگا۔ ——— کہ وہ واقعی کسی غیر عورت کی گھر میں موجودگی سے بے خبر ہے یا دانستہ چھپا رہا۔ مگر لڑکے کی معصوم اور بھولی صورت پر اغماض کا قیاس پورا نہ اترا۔ وہ واقعی لاعلم تھا۔ نگار کی گھر میں موجودگی کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ میں نے اس کے بعد صفدر سے کبھی کچھ نہ پوچھا مگر خود اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ نگار کو کس وجہ سے ان کے ہاں چھوڑا گیا ہے۔ جہاں تک قیاس کیا جا سکتا تھا۔ ایک ہی وجہ تھی کہ وہ اُمید سے ہو گی اسی لئے کرنل

اُسے لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں چھوڑ گیا۔

تین روز پہلے کی بات ہے۔ میں اور صفدر اکٹھے ہی گھر سے نکلے اُسے کالج جانا تھا۔ راستہ میں وُہ کچھ اچانک یاد آجانے سے میری طرف متوجہ ہوا۔

"بھائی جان! اُس دن آپ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ ہمارے ہاں مریضوں کی رہائش کا بھی انتظام ہے یا نہیں ——؟"

"ہاں —— تو اس کا کیا ذکر؟ میں نے تعجب سے پوچھا

"امی سے میں نے پوچھا تو وُہ ہنسنے لگیں۔ کہ بھائی جان کو ابھی سے کیا فکر ہے —— اور پھر انہوں نے بتایا کہ خاص خاص مریضوں کے لئے انتظام ہو سکتا ہے۔ آجکل بھی ہمارے ہاں ایک خاتون رہتی ہیں۔ مگر امی نے اُنہیں بالکل الگ کمرے میں ٹھہرایا ہوا ہے۔ کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں۔ ان کے لئے کھانا اور ناشتہ وغیرہ لے کر بھی خود امی اُن کے کمرے میں جاتی ہیں کسی ملازم کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ —— وہ بتا رہا تھا۔

"یعنی ان کی رہائش کو خفیہ رکھا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں ——" وہ کہنے لگا۔

"جب ہی تم مجھے بتا رہے ہو ——؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"آپ کی خیر کوئی بات نہیں اور پھر اُن کی موجودگی کا تو سب کو علم ہے صرف اِن کے کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا بس ڈیڈی اور امی جا سکتے ہیں ——" وہ بتا رہا تھا۔

جب چوک میں پہنچ کر وہ کالج کی طرف مڑا تو جاتے جاتے رُک کر جیب سے چند خطوط نکالے۔

"آپ شہر کی طرف جا رہے ہیں تو یہ خط پوسٹ کر دیجئے

گا۔ میں پھر بھول جاؤں گا تو جیب ہی میں پڑے رہ جائیں گے یہ کل دوپہر امی نے مجھے دیئے تھے میں دن بھر انہیں جیب میں لئے پھرتا رہا اور شام کو گھر واپس لے آیا ـــــ " وہ ہنس کر کہنے لگا۔

میں نے اُس سے خط لے لئے۔ وُہ سلام کر کے آگے بڑھ گیا، میں بازار کی طرف پیدل ہی چلا اور بلا ارادہ ان خطوط کے پتے پڑھنے لگا۔ ایک خط پر کرنل کیفی کا پتہ درج تھا یہ خط راولپنڈی بھیجا گیا تھا۔ صریحًا یہ نگار ہی نے اُسے لکھا تھا۔ اسی طرح کے ایک اور ہلکے گلابی رنگ کے لفافہ پر میں نے نظر ڈالی تو یک دم چونک اُٹھا اس خط پر مجھے کچھ مخصوص اور آشنا سے نام نظر آئے۔ یہ خط "نگم" اور چھاگانگ کے پتہ پر ذاکر حسین کی معرفت کسی بیگم آسیہ خانم کی طرف لکھا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کو تو میرے دل میں آیا۔ کہ ان دونوں خطوں کو کھول کر پڑھا جائے تو بہت سے حالات پر روشنی پڑ سکتی ہے لیکن پھر حوصلہ نہ پڑا۔ اس دن مجھے پورا تجربہ ہوا۔ کہ ایسی معنوی چوری کے لئے بھی خاصے دل گردے کی ضرورت ہے اور اس کے مرتکب ہونے والے لوگ کسی حد تک اپنے ضمیر کو کچل سکنے کے اہل ہوتے ہوں گے۔ خیر میں اس معاملہ میں تو سچی بات ہے کافی بزدل ثابت ہوا اور دونوں خط معہ دوسرے خطوط کے ڈاک میں ڈال دیئے پھر تمہیں ٹیلی گرام بھیج دیا کہ کہیں تم مجھ سے شکایت نہ کرو کہ میں خاموش تماشائی بن کر دیکھتا رہا۔ اور تمہیں ان سب کوائف سے آگاہ نہ کیا ـــــ میں سوچتا ہوں اس کا خط پاکر ذاکر اور وُہ خاتون جس کے نام خط بھیجا گیا ہے ضرور یہاں پہنچیں گے ـــــ یہ آسیہ خانم کون صاحبہ ہیں؟"

وہ پوچھنے لگا۔

"میں نہیں جانتا ——— غالباً یہ ماں جی کا نام ہوگا۔ میری وہاں رہائش کے دوران اس نام کی کوئی عورت وہاں نہ تھی اور ماں جی کا نام پکارتے میں نے کسی کو نہیں سُنا ———"

سعید نیم مردہ سی آواز میں بولا۔

"پھر اب کیا خیال ہے ——— ؟ کیا کرنا چاہیے ——— ؟"

اصغر پوچھنے لگا۔

"اگر تمہارا قیاس درست ہے تو پھر اب کرنے کو باقی کیا رہ گیا ہے ——— ؟"

سعید نے زیرِ لب کہا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور مایوسی کی ایسی دردناک کیفیت اس کی نگاہوں سے برسنے لگی تھی جیسے اُمید کی آخری کرن بھی ڈوب چکی ہو۔

"ہاں کہتے تو ٹھیک ہو۔ بقول کسے ——— "اب رہ ہی گیا گیا کہ رقیبوں کا ڈر کریں"

اصغر نے بھی آزردگی سے کہا۔ چند منٹ کمرے میں مکمل خاموشی رہی دونوں دوست چپ بیٹھے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے اور کچھ سوچتے رہے۔

"اگر مناسب سمجھو تو امی سے ساری بات کھول دی جائے اور ان کے ذریعے کچھ معلوم کیا جا سکے۔ کہ واقعی وہ "بچے" وغیرہ کے سلسلہ میں اس جگہ مقیم ہے ——— ؟"

اصغر نے گویا یکسر مایوسی سے بچانے کو ایک نکتہ نکالا۔

"یقیناً ایسا ہی ہے ورنہ یوں خفیہ طور پر ایک لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرتے کے کیا معنی ؟" وہ اصغر کی تجویز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔

اتنے ہی میں اصغر کی امی اپنے ضروری کاموں سے فارغ

ہو کر مہمان نوازی کے خیال سے اُن کے پاس بیٹھنے کے لئے چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں خشک میووں سے بھری ہوئی بلور کی خوشنما طشتری تھی جسے انہوں نے قریب کی تپائی پر رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

لو کھاؤ ——— سردی کو بہلانے کا یہ بڑا ہی دلچسپ شغل ہے" اور امی کسی نہایت ہی عزیز مہمان کے واسطے یہ شغل تجویز کیا کرتی ہیں۔ ورنہ ان کے اس خاص ذخیرہ کو کوئی نہیں چھیڑ سکتا۔ اصغر نے طشتری کی طرف پیش دستی کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ سعید نے بھی رسماً تقلید کی۔ اور اپنے دردِ نہاں کو سینے میں دبائے بظاہر خوشی سے خاتون خانہ کے ساتھ گفتگو میں شریک رہا۔ اصغر نے اشارے سے اس کا عندیہ دریافت کیا۔ لیکن سعید نے اشارہ ہی سے منع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوست کی والدہ کے رو برو اس کی کسی عزیزہ کی سُبکی ہو۔ چنانچہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اصغر کی امی اُٹھ گیئں اور جاتے جاتے لڑکوں کو فہمائش کر گیئں کہ کہیں اس وقت باہر جانے کا پروگرام نہ بنا لیں۔ سردی بے حد ہے سرد ہوا چلنے لگی ہے۔ گھر ہی ٹھہریں۔

"آپ بے فکر رہیے امی ——— ہم لوگ بڑے کوٹ پہن کر ذرا تھوڑی دُور گھومنے کے واسطے جائیں گے۔ ہم ٹھہرے سپاہی لوگ، آپ ہمیں ایسی ناز برداریوں سے آرام طلب بنا دیں تو واپس جا کر دقت محسوس ہوگی" اصغر کہنے لگا۔

"تم جانو ———" امی زیر لب بڑبڑاتی ہوئی چلی گیئں۔ اصغر اصرار کر کے سعید کو باہر لے گیا تاکہ کچھ دیر اُس کے ذہن پر سے رنج و غم کا بوجھ کم ہو جائے۔ راستہ میں بھی یہی واقعہ اُن کے زیر بحث رہا مگر وہ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ دونوں ہی کا

ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔ کبھی تجویز ہوتی کہ سعید براہ راست اسے پیغام بھیجے کہ وہ اس کی اس جگہ موجودگی سے واقف ہے۔ کبھی اس تجویز کو مسترد کر دیا جاتا۔ کہ وہ کرنل کیفی کو اطلاع دے کر یہاں سے کہیں اور

چلی جائے گی۔ اصغر خود ہی ایک مشورہ دیتا خود ہی اسے منسوخ کر کے دوسری تجویز پیش کرتا، سعید صرف ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس کی قوت فکر سلب ہو چکی تھی وہ ڈیڑھ میل کے قریب چل کر بازار پہنچے ایک دوکان سے سگریٹ خریدے اور واپس چلے۔

کچھ تو تم بھی کہو —! بولتے بولتے میرا سر پھر گیا!" اصغر نے آخر جھنجلا کر کہا۔

میرے پاس تو اب کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں دوست! تمہاری روانگی کے دن جب وہ مجھے اچانک مل گئی تو اس کے چہرے کی ایک ہی جھلک نے میرے بجھے ہوئے دل میں پھر امیدوں کے چراغ روشن کر دیئے تھے۔ وہی فرشتگان معصومیت اُس کے چہرے پر موجود تھی جیسے "نگار" کے اس میک اپ کے ساتھ ہی اُس نے وہ اوڑھا ہوا غرور اور پہنی ہوئی سی رعونت اتار پھینکی ہو۔

اگرچہ میرا دل اُس کی طرف سے پوری طرح صاف نہ ہوا تھا۔ پھر بھی میرے دل کو اُسے دیکھنے کے بعد تسکین ہو گئی تھی کہ اس نے معصیت کی حدود میں قدم نہیں رکھا اور وہ ادھر ہی سے لوٹ آئی ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟ میں اس کے متعلق باتیں کرتے کرتے نہ تھکتا تھا اور تم اکتا جاتے تھے۔ مگر اب دو ماہ بھی نہیں گزرنے پائے کہ — وہ اس حالت میں یہاں موجود ہے۔ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی اصغر! میرا دماغ یکسر ماؤف ہو چکا ہے۔" وہ اتنی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

تو چھوڑو دفع کرو۔ تم ایسی بیہودہ عورت کے لئے کیوں اس قدر پریشان ہوتے ہو؟ یاد نہیں اس کے ملنے سے تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ اب

تو وہ تمہیں مل بھی جائے تو تمہاری غیرت گوارا نہ کرے گی کہ اُسے اپنا لو۔ پھر بیکار کیوں ہلکان ہوتے ہو اور مجھے بھی پریشان کرتے ہو۔ میرا تمہیں یہاں بلانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد تمہیں اس سے نفرت ہو جائے گی اور تم اس کی طرف سے توجہ ہٹا لو گے ۔"

اصغر نے ساتھ چلتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور انتہائی ہمدردی کے لہجہ میں کہتا رہا۔

محبت کی غائت یہ نہیں ہوتی کہ محبوب اپنا ہی ہو کر رہے — اگر وہ میری دنیا سے نکل کر کسی اور کی دنیا بسانے چلی گئی تو میں اس سے محبت کرنا چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں اصغر! اور اُسے چاہتے ہوئے یہ بھی میری عین تمنا ہے کہ وہ جہاں رہے خوش رہے، اُسے کوئی آنچ نہ آئے۔ یہ میں اب بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جن کے ہاتھوں اُسے ضرر پہنچا اُن سے مواخذہ کروں ۔ میں ذاکر سے مل کر جواب طلبی کروں گا کہ وہ کن حالات میں گھر سے نکلنے اور سٹیج تک آنے پر مجبور ہوئی — ؟ اور ذاکر کو اس کا جواب دینا ہی ہوگا۔ پھر میں کیفی سے مواخذہ کرونگا کہ اس نے تھیٹر سے لانے کے بعد اُسے کس حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا ؟ یہ موجودہ صورت کن حالات میں رونما ہوئی ؟ کیا وہ اس کی منکوحہ ہے ؟ کیا وہ اس کے جائز بچے کی ماں بننے والی ہے ؟" اور کیفی کو یہ ثابت کرنا پڑے گا ۔ ورنہ

سعید کی آواز میں اب تو جوش نے زندگی کے آثار پیدا کر دیئے تھے وہ تو غنیمت ہوا کہ سڑک سنسان تھی ورنہ راہ گیر صاف اُس کی تقریر سن سکتے ۔

" ہوں — ٹھیک کہتے ہو بھائی ! محبت بدستور قائم نہ ہوتی تو یہ والہانہ جنون اور از خود رفتگی بھی نہ ہوتی — اور ذہن بھی ضرور نارمل ہوتا کہ یہ موٹی سی بات سمجھ میں آ سکتی ۔" اصغر نے سگریٹ سلگا کر کش لیتے ہوئے توقف کیا ۔

"کون سی بات — ؟" سعید نے بے صبری پوچھا ۔

"یہی نہ اگر وہ کیفی کے ساتھ شرعاً اور قانوناً شادی کر چکی ہوتی تو اس اخفا کی کیا ضرورت تھی؟" اصغر نے کہا۔

"بس تو پھر وہ میرے انتقام سے بچ کر کہیں نہ جا سکے گا۔ اگر اس نے جوہر کو اس حد تک دھوکا دیا۔ اس حد تک اس کی تحقیر کی تو مجھے اس کا بدلہ چکانا ہوگا میں ایک موقعہ پر خطرہ میں تھا تو اُس نے میری جان بچائی تھی۔ میری حفاظت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی اس کے احسان کو میں کسی سلوک کے عوض بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات تو میرے دل میں بے اختیار یہ خیال اٹھتا ہے کہ شاید اس ساری افتاد کا موجب میری ذات ہی نہ ہو!" سعید نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ کیسے؟" اصغر اس بات پر یک دم چونک کر پوچھنے لگا۔

"جب اُس نے فرار ہونے میں مدد دی تو ممکن ہے ذاکر نے اُس سے اس قدر بدسلوکی روا رکھی کہ وہ گھر چھوڑ کر روپوش ہونے پر مجبور ہو گئی ہو۔" سعید نے دلیل پیش کی۔

"لیکن گزشتہ ششماہی میں اُسے ذاکر کے ساتھ ایک مرتبہ میں نے کراچی میں دیکھا۔ ایک دفعہ تم نے لاہور میں دیکھا۔ اور اب پھر وہ کیفی کے ساتھ یہاں آئی۔ مگر ذاکر اور گھر کے دوسرے لوگوں سے اس کی خط و کتابت بھی ہے جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ پھر اس کا روپوش ہونا کیسا۔؟"

اصغر نے سعید کے خیال کی تردید میں کہا۔ تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس کا واقعی اُس کے پاس کیا جواب تھا۔

"کیوں نہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر اس سے خود ملوں اور اُسے مجبور کروں کہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتائے؟" سعید نے بڑے غور و خوض کے بعد تجویز پیش کی۔

"مشکل ہے وہ کسی سے ملنے پر رضامند نہ ہو گی۔" اصغر کہنے لگا۔

"کیا تمہارا دوست اس سلسلہ میں کچھ مدد نہ کر سکے گا؟" سعید نے پوچھا۔

"کون؟ صفدر؟" اصغر نے پوچھا۔

ہاں ۔۔۔ وہی ڈاکٹر کا بیٹا جس کا تم ذکر کر رہے تھے ۔" سعید کہنے لگا۔
" میرا دوست کیا وہ تو سولہ سترہ برس کا لڑکا ہے ۔ فرسٹ ایر میں پڑھتا ہے ۔ اس قسم کے معاملات میں دخل اندازی کی اُسے اجازت نہیں۔ وہ کیا مدد کرے گا ۔"

اصغر کے اس مایوس کن جواب پر سعید سرنگوں ہو گیا اس پر ناامیدی نے پوری یورش کے ساتھ حملہ کر دیا۔ ساڑھے دس بجے تھے جب وہ واپس آئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے

(۱۵)

اگلی صبح ناشتہ کی میز پر سعید اصغر کے مقابل کی نشست پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بے خوابی کی کسلمندی اور خمار اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ ایک اذیت ناک جلن تھی کہ مسلسل اُس کے قلب و جگر کو چاٹ رہی تھی۔ ایسی بیزاری اس نے اتنی ناکامیوں کے باوجود بھی آج تک محسوس نہ کی تھی۔

اس بیزاری کے پس منظر میں تو پھر امید کی کوئی ننھی سی کرن اسے زندگی کا راستہ دکھانے کو ٹمٹمایا کرتی تھی۔ مگر اب کی بار تو پس و پیش اندھیرا ہی اندھیرا تھا ناامیدی۔ ناکامی، نامرادی کا گھٹاٹوپ اندھیرا! جس کی سیاہی اور تاریکی میں اس کی زندگی کا راستہ گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کو کسی بات کے سوچنے سمجھنے کے یکسر ناقابل محسوس کر رہا تھا۔

"یہ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی اور میاں مجنوں ہیں کہ پھرائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ابھی امی آئیں گی تو مجھ پر برسیں گی کہ مجھے مہمان داری کا ڈھنگ نہیں کچھ نہ کچھ تو کھا پی لو کہ میری جان چھوٹے۔"!

اصغر گویا سعید سے زیادہ امی کی خفگی سے بچنے کے لئے اُسے کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ سعید نے چائے کی پیالی اٹھائی اور جلدی جلدی حلق میں

انڈیل لی۔

واہ بھئی واہ! آج تو چائے کے مردِ میداں بن گئے، کہ ایک ہی سانس میں پوری پیالی ختم! لو اب یہ پڈنگ بھی نگل ڈالو کہ پاپ کٹے! امی ابھی آرہی ہوں گی۔"

وہ خائف نظروں سے دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے یوں کہہ رہا تھا جیسے کوئی بچے کو ڈراتا ہے۔

بخدا بالکل جی نہیں چاہتا۔ تم خالہ جان سے کہہ دینا کہ میں نے سب کچھ اچھی طرح کھایا ہے البتہ چائے کی ایک پیالی اور لئے لیتا ہوں۔" سعید نے چائے دانی اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

اوں ہوں! پہلے یہ پڈنگ ۔۔! اصغر نے پیالی اس کے سامنے سے ہٹا کر پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے کہا سعید نے چاروناچار دو تین چمچے نگلے ۔

اور یہ انڈا ۔۔۔؟" اٹھاؤ جلدی! وہ امی آرہی ہیں۔ للہ اٹھاؤ جلدی سے!"

دروازہ پر واقعی قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اور سعید نے بھی جیسے سچ مچ اصغر کو گھڑکیاں پٹنے کے خوف سے اُبلا ہوا انڈا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا اور چمچے سے کھانا شروع کیا۔ ادھر اصغر کی امی حسب معمول کسی گرما گرم پکوان کی پلیٹ لئے عجلت سے داخل ہوئیں۔ جیسے انہیں اس کے ٹھنڈا ہو جانے کا خدشہ ہو۔

یہ سادہ حلوہ تو گرم گرم ہی لذیذ ہوتا ہے۔ کہیں تم ناشتہ ختم تو نہیں کر چکے دونوں؟"

کتنا ہی ختم کر چکے ہوں۔ اس حلوے کے لئے تو بہر حال گنجائش پیدا ہو جائے گی ۔۔ یہ میرا مرغوب پکوان ہے سعید! چکھ کر دیکھو امی کتنا اچھا بناتی ہیں یہ!"

اور سعید کو چاروناچار اس پیش کش کو بھی قبول کرنا ہی پڑا، جب وہ میز سے اُٹھے تو اصغر مطمئن تھا کہ اس نے اپنے مہمان دوست کو بھوکا نہیں رکھا

اب وہ بالکنی میں آبیٹھے۔ سعید کے کمرے کے سامنے والی بالکنی پر صبح سویرے دھوپ آجاتی تھی اور اصغر یہیں بیٹھ کر شیو بناتا اور اخبار دیکھا کرتا تھا۔ معمول کے مطابق مصروفیات سے فارغ ہو کر اس نے سعید سے بھی لباس تبدیل کرنے کو کہا۔

"کہاں جاؤ گے اس وقت! میری طبیعت کسلمند ہے میں تو کہیں نہیں جانا چاہتا۔"

سعید نے نڈھال جیسی آواز میں کہا اور کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ واقعی اتنا مضمحل اور بیدل ہو رہا تھا کہ اس کی طبیعت اخبار تک دیکھنے پر مائل نہ تھی۔

"بڑے سست ہو بھئی! چلو ذرا بازار تک چلتے ہیں۔" اصغر نے مجبور کرنا چاہا۔

"اگر سعید بیٹے کا جی نہیں چاہتا تو کیوں مجبور کرتے ہو۔ تمہارے تو پاؤں میں چکر ہے گھر بیٹھنا اچھا ہی نہیں لگتا۔"

اصغر کی امی پان لے کر آئی تھیں اور کمرے میں آتے آتے انہوں نے دونوں کی گفتگو سنی تھی۔

خالہ جان! آپ کس قدر زحمت اٹھاتی ہیں ہم لوگوں کی خاطر۔ آپ نے اصغر کو بلا لیا ہوتا یہ خود پان لے آتے۔" سعید نے جیسے اُن کی مدارت پر شرمسار ہو کر کہا۔"

میرے علاوہ بھی گھر میں دو تین ملازم موجود ہیں لیکن امی تمہاری تواضع بذات خود ہی کرنے کا شوق رکھتی ہیں۔ کہتی ہیں سعید ہمیں بہت ہی پیارا لگتا ہے بس اس لڑکے میں ایک ہی نقص ہے کہ یہ اصغر کا کہنا نہیں مانتا۔"

اصغر ہنس کر کہنے لگا۔ تو امی بھی ہنسنے لگیں۔

"شریر کہیں کا! بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ تم سعید کے کہنے پر چلو تو اور بھی اچھے لڑکے بن جاؤ۔" وہ خاصدان میز پر رکھ کر ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ وہ واقعی سعید کو بہت چاہنے لگی تھیں۔ بلکہ انہیں بار بار خیال آتا تھا کہ ان کے پاس کوئی بیٹی ہوتی تو وہ اسے اپنے کنبہ میں شامل کر لیتیں۔ اور پھر وہ کسی خیال

سے رنجیدہ ہو جاتی ۔

اصغر نے سعید کی طبیعت کا اندازہ کرکے باہر جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا کھلی چھت پر خوب دھوپ آگئی تھی ۔ اصغر کی امی نے کرسیاں بچھوائیں اور سب باہر آبیٹھے ۔ سعید کا دل بے اختیار تڑپا کہ نیچے جھانک کر دیکھا جائے شاید کہیں اُسے جوہر کی جھلک نظر آسکے ۔ مگر یہ تمنا اس کے دل میں ہی تڑپ کر رہ گئی وہ عملی طور پر ایسا نہ کرسکا کہ کسی کے گھر میں جھانکے زیریں حصّہ کے صحن کے اوپر چاروں طرف چار فٹ اونچی منڈیر تھی ، جس کے گرداگرد نیچے کے کمروں کی فراخ چھتیں تھیں ۔

صحن کے اوپر اندرونی طرف والے کمروں میں ڈاکٹر اور اس کے مختصر کنبہ کی رہائش تھی اور بیرونی طرف کے کمرے مطب کے لئے مخصوص تھے ۔ صدر دروازے اور ڈیوڑھی ایک ہی تھی ۔ ڈیوڑھی میں تین دروازے تھے ۔ دو اطراف میں اور ایک سامنے ۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ ان سیڑھیوں میں کھلتا تھا جو اوپر کی منزل کو جاتی تھی ۔ اُس کے مقابل کا دروازہ ڈاکٹر کے مطب میں کھلتا تھا اور درمیان والا دروازہ صحن میں جس کے سامنے لکڑی کا پارٹیشن لگا ہوا تھا ۔

"امی ! یہ البم کیسے نکل آیا ۔۔ ؟" اصغر نے ایک دم چونک کر قریب بچھی ہوئی چارپائی پر سے ایک سبز مخملی جلد کا البم اٹھایا اور کچھ خفگی کے لہجہ میں ماں سے پوچھا ۔

"ہاں بھیا ! میں نے گرم کپڑے نکالے تو یہ تمہارے بڑے بکس میں پڑا پایا کپڑوں کو دھوپ دکھا کر رکھوں گی تو رکھ دوں گی اسے بھی ۔" اس کی امی رنجیدہ سی آواز میں کہنے لگیں ۔

"میں دیکھ سکتا ہوں ۔۔ ؟" سعید نے ہاتھ بڑھایا ۔

"دیکھو ۔۔ !" اصغر نے بھی اداس سے لہجہ میں کہا اور البم اُس کی طرف بڑھا دیا ۔

سعید نے البم کھولا ، سب سے پہلی تصویر ایک ننھے منھے بچے کی تھی ۔ وہ تالی بجا رہا تھا اور سامنے بہت سے کھلونے رکھے تھے ۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا

ہمارا جیتا جاگتا کھلونا ___ اصغر۔

" ارے! یہ اتنے پہلوان جیسے تھے تم بچپن میں ؟ میں تو تمہیں اُٹھا ہی نہ سکتا اس وقت!" سعید اس تصویر کو دیکھ کر بے ساختہ کہنے لگا۔ اصغر کی امی ہنسنے لگیں" گویا اس وقت تم اتنے ہی بڑے تھے جتنے اب ہو ___؟" وہ کہنے لگی۔

اس پر تینوں ہنسنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری تصویر تھی۔ دو بچے ایک جھولے میں پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے مسکرا رہے تھے ___ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا "نیر اور خاور ___ ہمارے گھر کی تابندہ شمعیں "

" یہ ___؟" سعید نے نگاہ اُٹھا کر استفسار کے انداز سے اصغر کی طرف دیکھا وہ اداس جیسی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے بڑی ہی اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی امی نے دانستہ دوسری طرف رخ پھیر لیا۔ سعید کو اب احساس ہوا کہ اس البم کے چھپا رکھنے کی کیا وجہ تھی۔ اور وہ اپنے سوال پر پشیمان سا ہو گیا۔ لیکن اصغر نے اپنی طبیعت پر قابو پاکر جواب دیا۔

" یہ ___ میری چھوٹی بہنیں تھیں ___ دونوں مجھ سے تین سال چھوٹی تھیں۔" اصغر نے بتایا۔

" اچھا ___!" سعید نے تجسس کے واضح لہجہ میں کہا اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ دونوں ہی کیسے تین سال چھوٹی تھیں۔

" یہ بھی انہیں دونوں کی تصویر ہے جب اُن کی دوسری سالگرہ ہوئی ڈیکھو ان کی شکل وصورت میں ذرا بھر فرق نہیں۔"

اصغر نے البم کا ورق پلٹتے ہوئے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جس میں دو پھول سی ہمشکل بچیاں اپنی اپنی گڑیاں آغوش میں دبائے مخاطب جیسی مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ تصویر کے نیچے خوشخط لکھا تھا۔

" مسکراتے پھولوں کو دوسری بہار مبارک!" وہ جھولے ہوئے جھالروں والے سفید فراک پہنے گھنگھریالے بالوں پر پھولوں کے تاج لگائے معصوم فرشتوں کا تصوّر دلا رہی تھیں۔ دونوں کی صورت میں ایک بال برابر فرق نہ تھا اور

سعید کافی دیر تک اُس حسنِ معصوم اور اُس حیرت زا مشابہت میں گم رہا۔
تو یہ دونوں بچیاں توام تھیں —؟ سعید نے تامل کرتے ہوئے پوچھا۔
" ہاں —" اصغر نے بھی غور سے تصویر پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔
" تو کیا ہوا ان کو —؟" سعید نے اشتیاق سے پوچھا۔ مگر اصغر نے اس خیال سے تامل کیا کہ یہ ذکر اس کی ماں کے لیے رنج دہ ہوگا۔
میری یہ بچیاں اغوا کر لی گئی تھیں بیٹا —" اصغر کی امی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے متحمل لہجہ میں کہا۔
" اچھا —؟" سعید نے حیرت اور اشتیاق سے کہا اور متوقع نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگا —
اصغر کے ابو اس وقت ڈھاکہ میں ایک فرم کے منیجر تھے۔ اصغر تین برس کا تھا کہ یہ جڑواں بچیاں پیدا ہوئیں۔ میں بے حد بیمار ہو گئی۔ ایک بچی کو اس کی پھوپی نے اپنی نوزائیدہ بیٹی کے ساتھ دودھ شریک کر لیا۔ دوسری کے لئے انا رکھی گئی، جس کی گود میں لڑکا تھا مگر وہ لڑکا اس عورت نے کسی کارخانہ دار کی بیگم کو دے دیا تھا۔ کیونکہ اس کا بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا۔ اور وہ بچے کی غیر موجودگی سے متاثر ہو کر دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔
انا کے اس ایثار پر میں اس کی بہت قدر کرنے لگی۔ نہ صرف پورے اعتماد کے ساتھ بچیوں کو اس کی نگرانی میں دے دیا بلکہ اُسے گھر کا سارا انتظام سونپ دیا۔
جب رضاعت کی مدت ختم ہو گئی اور بچیوں کا دودھ چھڑایا گیا تو دوسری بچی کو بھی اسی انا کے سپرد کر دیا۔ عموماً اصغر کے ابو دورہ پر جاتے تھے تو میں بھی اصغر کو ساتھ لے کر ان کے ہمراہ جاتی۔ وہ بچیوں کو بھی بے حد چاہتے تھے مگر اصغر کو تو چند لمحے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اسی وجہ سے مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ ہم لوگ ان کے ہمراہ دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ کہ سیلاب آگیا اس بے پناہ طوفان نے ہمیں مسلسل دو ہفتے روکے رکھا۔ بچوں کے لئے ہم لوگ بے تاب اور پریشان تھے کیونکہ اطلاعات کے مطابق ہمارا علاقہ بھی طوفان کی زد میں آچکا تھا۔ ہم نے ٹیلی فون کئے ٹیلی گرام دیئے۔ لیکن ڈاک اور تار کے سلسلے بھی طوفان کی قیامت خیز یورش سے منقطع ہو چکے تھے کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی اٹھارویں روز ہم لوگ گھر پہنچے۔ دروازہ پر تالا پڑا تھا، کوئی ملازم، مالی یا چوکیدار موجود نہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ کسی حفاظت کی جگہ گئے ہوں گے۔ اب واپس آجائیں گے تالا توڑ کر گھر کھولا گیا۔

شام کو مالی اور چوکیدار آئے۔ ان سے انا کے متعلق پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ انا تو ہماری روانگی سے آٹھویں روز بچوں کو لے کر چلی گئی تھی۔ اس کے نام ایک خط آیا تھا۔ اس نے گھر میں سب سے یہی کہا کہ صاحب کا خط آیا ہے۔ انہوں نے بچوں کو لے کر چلے آنے کے واسطے حکم دیا ہے خانساماں نے اُسے گاڑی لاکر دی وہ کچھ سامان کے ساتھ دونوں بچوں کو لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے سے دو روز بعد سیلاب اور طوفان آیا۔

گھر میں پڑتال کی گئی تو تمام قیمتی کپڑے۔ زیور، چاندی کے برتن، قیمتی گھڑیاں اور آرائشی سامان غائب تھا۔ یہ بات اس حقیقت کو صاف ظاہر کرتی تھی۔ کہ انا گئی تو واپس آنے کے خیال سے نہیں گئی۔ بس بیٹا تم خود قیاس دوڑا سکتے ہو کہ ہم نے ان گم شدہ بچوں کی بازیافت کے واسطے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ مگر اس بد بخت عورت کا کچھ سراغ نہ مل سکا۔ کہ وہ میری پھول سی اُن میناؤں کو لے کر آسمان پر اڑ گئی یا پاتال میں اتر گئی۔

وہ سرد آہ بھرتے ہوئے خاموش ہو گئیں ان کے دکھ کا احساس سعید کے دل کو جیسے مسلنے لگا۔ وہ بھی رنجیدہ ہو کر سرنگوں بیٹھ گیا۔

یاد ہے امی! جب ان دونوں نے اپنے نام کو پہچاننا شروع کیا، میں جان بوجھ کر خواہ مخواہ بھی آواز دیتا۔ نام پکارنے پر جو میرے پاس آجاتی غور سے اُس کی صورت دیکھ کر شناخت کے لئے کوئی فرق ڈھونڈھنا چاہتا۔ مگر ہمیشہ

ناکام رہتا۔" اصغر کچھ سوچ کر اداسی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں — مگر میں نے شناخت کے واسطے ایک نشانی ڈھونڈھ لی تھی۔ جب وہ پانچویں برس میں لگی ہیں تو نیر کے بائیں رخسار پر ٹھوڑی کے قریب ایک ننھا جیسا سیاہ خال نظر آنے لگا تھا، مگر خاور کا چہرہ بالکل صاف تھا اس کے علاوہ ان کی طبیعتوں میں خاصا فرق تھا۔ نیر ہٹیلی اور ضدی تھی، کسی بات پر اڑ جائے تو من مانی کر کے رہتی۔ مگر خاور فوراً حکم مان لیتی — آج کو ہوتیں تو کتنی حسین اور جوان ہوتیں میری بچیاں! جیسے چاند اور سورج کو قدرت نے یکجا کر دیا ہو — اچھا جہاں کہیں ہوں صاحبِ نصیب ہوں، نیک بخت ہوں، خوش و خرم ہوں —!"

"کتنی عمر تھی جب وہ آپ سے الگ ہوئیں —؟" سعید نے پوچھا۔

"پانچ برس کی ہوئی تھیں ابھی — چھٹی سالگرہ نہ ہوئی تھی!" اصغر کی امی کہنے لگیں۔

"پانچ برس کی ہوئی تھیں۔ ابھی البم میں وہی تصویریں ہیں —" اصغر نے کہا اور صفحے پلٹنے لگا۔

وہ اسی طرح باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے سیڑھیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا ملازم نے اطلاع کی کہ صفدر بلاتا ہے۔

"بلا لو، ان سے کیا پردہ ہے اس جگہ؟" اصغر کہنے لگا۔

چند لمحے بعد صفدر آگے چلا آیا، سب کو سلام کر کے اصغر کی طرف مخاطب ہونے ہی کو تھا کہ اس نے ٹوکا۔

"ارے بھئی! بیٹھ جاؤ۔ کیا کھڑے ہی کھڑے گلا صاف کر کے تقریر جھاڑنے لگے ہو!"

"واپس آ کر کافی دیر آپ کے پاس بیٹھوں گا بھائی جان فی الحال تو مجھے ایک ضروری ٹیلی گرام دینے جانا ہے۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے مجھے سائیکل دے سکیں گے —؟"

صفدر نے جو دبلا پتلا سترہ سالہ مودب جیسا لڑکا تھا، نرم اور آہستہ

آواز میں کہا۔

"بھوتنی کیا تم جتنی دیر کے لئے چاہو سائیکل لے جا سکتے ہو — مگر خیریت تو ہے کیسی ضروری ٹیلی گرام ہے وہ؟ اصغر نے فکر مندانہ انداز سے پوچھا۔

وہ — کوئی —"

اس نے پیشانی پر ہلکا سا شکن ڈال کر پینٹ کی جیب کو ٹٹولا اور ایک کاغذ نکال کر پھیلاتے ہوئے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا، اصغر نے اشتیاق سے کاغذ پر نگاہ دوڑائی —

"ہوں — لے جاؤ سائیکل۔ ڈیوڑھی میں تو پڑی ہے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

بہر حال اجازت تو لازم ہی تھی — اگر آپ کو ضرورت ہوتی؟

"بس میں ابھی حاضر ہوا — !"

صفدر نے حسب عادت دھیمی آواز میں زیر لب کہا اور قدم بر داشتہ زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اصغر کی امی باورچی خانہ میں جا چکی تھیں۔ اصغر نے سعید کے کندھے کے قریب جھک کر کہا۔

"ڈاکٹر نے کرنل کیفی کو فوراً پہنچنے کے لئے ارجنٹ تار بھجوایا ہے —!"

"ہوں — ؟ تو گویا زیادہ بیمار ہے؟ سعید نے چونک کر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ظاہر تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر تم اتنے بدحواس کیوں ہو گئے؟" اصغر نے پیشانی پر بل ڈال کر خفگی سے پوچھا۔

"اصغر — !" سعید نے واقعی بدحواس ہو کر اصغر کو پکارا۔

کیا ہو گیا سعید! اپنے آپ کو سنبھالو۔ کچھ دیوانے تو نہیں ہو گئے تم؟" اصغر نے خفا ہو کر اسے ڈانٹا۔

تم نہیں جانتے اصغر۔ اگر —" وہ جز نہیں کیا کہنے کو تھا کہ اصغر نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں سب جانتا ہوں — اسی لئے تو مجھے غصہ آتا ہے کہ ایسی بے وفا اخلاق باختہ عورت کے لئے تم اب بھی مرے جا رہے ہو —! احمق نہ ہو تو!"

اصغر کو سچ مچ غصہ آ رہا تھا۔

"خیر میں تو اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہ بچوں گا۔" اس نے زیر لب کہا۔

"اب جو خدا کی مرضی — میں ملک الموت کا راستہ روکنے سے رہا —!"

اصغر اس کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھ کر بولا۔ سعید کرسی سے اٹھا اور بے قراری سے ٹہلنے لگا۔

"واہی لڑکا —! واللہ! دیوانگی کی بھی حد ہے کوئی!"

اصغر بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی امی باورچی خانہ سے نکلیں۔ ملازم کھانا لے کر کھانے کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ میز پر کھانا لگوانے کے لئے خود ساتھ گیئں۔ گو اپنی گم شدہ بچیوں کی یاد سے وہ بے حد آشفتہ خاطر ہو رہی تھیں مگر مہمان کا خیال مقدم تھا، بیٹے کے عزیز، دوست کی مدارت میں فرق آئے یہ انہیں کسی حالت میں گوارا نہ تھا۔ ہر کام بذاتِ خود کرتیں یا اپنی نگرانی میں کرواتیں۔

کھانے سے فرصت پا کر اصغر بڑے اصرار سے سعید کو باہر لے گیا شہر کے مختلف قابل دید مقام دکھائے، چند دوستوں کے ہاں ملاقات کے لئے ہر ممکن کوشش کی کہ سعید کی توجہ اس ناگوار واقعہ کی طرف سے ہٹی رہے۔ لیکن وہ دیکھتا تھا کہ اس کے دوست کا اضمحلال اور روحانی کوفت بدستور قائم تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بظاہر وہ معمولی گفتگو میں حصہ لے رہا تھا مگر اس کی دلی کیفیت سے اصغر بے خبر نہ تھا۔

آخر شام کے قریب وہ واپس آئے۔ نچلی منزل میں کچھ غیر معمولی مصروفیت دکھائی دے رہی تھی۔ کمپونڈر اور دونوں نرسیں مطبب اور رہائشی حصہ کے درمیان

بار بار آجا رہے تھے۔ امریکن ہسپتال کے ہاؤس انچارج سرجن کو بلوایا گیا تھا۔

"ڈاکٹر کے ہاں کوئی مریضہ آئی ہوئی ہے۔ بیچاری بے حد تکلیف میں ہے اب تو ڈاکٹر ہیریسن کو مدد کے واسطے بلوایا ہے۔ ڈاکٹر خود کہہ رہے ہیں ہماری بس کا کیس نہیں۔!"

اصغر کی امی نے بتایا۔ اصغر کو معلوم تھا کہ سعید اصرار کے باوجود بھی کھانا نہیں کھائے گا۔ چنانچہ اس نے عذر کر دیا کہ وہ کسی دوست کے ہاں کھانا کھا کر آئے ہیں۔ مگر سعید کی بے قراری اتنی واضح تھی۔ کہ اصغر کی امی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

"سعید بیٹے! کیا بات ہے؟ جی تو اچھا ہے تمہارا؟ اصغر دیکھنا ذرا تو ایک دم پیلے ہو رہے ہیں۔ کیسی زردی کھنڈی ہے چہرے پر۔!"

سعید کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے ان کی نگاہ اس کی طرف اُٹھ گئی تو وہ گھبرا کر کہنے لگیں۔ سعید نے عجب بے بسی کی نظر سے اصغر کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے، تم لوگ کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے!"

وہ فکر مند ہو کر کبھی بیٹے کو اور کبھی سعید کو دیکھ رہی تھیں۔

"وہ جس مریضہ کا آپ ابھی ذکر کر رہی تھیں نا؟ اسی وجہ سے اس بے غیرت کی جان پر بنی ہوئی ہے!"

اصغر نے کڑی نگاہوں سے سعید کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر مختصر لفظوں میں سارا قصہ ماں کو سنا دیا۔ سعید سکتہ کے عالم میں یوں کھویا کھویا سا بیٹھا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

"تم اس سے ملنا چاہتے ہو ۔؟ میں ڈاکٹر سے بات کروں؟"

اصغر کی امی نے انتہائی شفقت سے سعید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاید وہ نہ مانے ۔" سعید نے زیر لب کہا۔

کون؟ ڈاکٹر؟ نہیں میں اُسے رضامند کر لوں گی، تم جاکر اسے ایک نظر دیکھ آؤ۔ شاید اس سے تمہیں تسکین ہو جائے —!" وہ ترس کھائے ہوئے لہجہ میں بولیں۔

"اونہہ —!" اصغر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم کیوں خفا ہوتے ہو اس پر؟ اس کے بس کی بات تھوڑے ہی ہے!" وہ سعید کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"لعنت ہے ایسی بے تسبی پر کہ وہ تو دوسرے —" وہ کچھ کہنے کو تھا کہ ماں نے درمیان میں ٹوک دیا۔

خیر بکو نہیں! بڑے کٹھور ہو تم! دیکھتے نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے اور تسلی دینے کی بجائے الٹا ملامت کئے جا رہے ہو —؟

سعید نے اتنے وقت میں پہلی مرتبہ انہیں بیٹے سے تلخ ہوتے سنا مگر اس میں بولنے کی قوت ہی باقی نہ تھی کہ کچھ کہتا۔ بس انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

لے میں کہتی ہوں جاکر شمسہ سے کہ مریضہ کے ایک عزیز اتفاقیہ اس موقعہ پر میرے مہمان ہیں وہ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اتنا کہتے کہتے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ اصغر نے سگریٹ جلایا اور دریچہ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے وہیں کھڑے کھڑے سگریٹ پینے لگا، اس نے سعید کو تسلی دینا اس حقیقت کے پیش نظر ضروری نہ سمجھا کہ تسلی کا کوئی بھی لفظ اس کے دردِ نہاں کو کم نہ کر سکے گا، کامل دس منٹ کمرے میں سکوت چھایا رہا سعید مسلسل بے حس و حرکت بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا اور اصغر برف بار ہوا کے جھونکوں کو برداشت کرتے ہوئے سگریٹ کا دھواں تاریک فضا میں پھونکتا رہا حتیٰ کہ قدموں کی آہٹ پر واپس پلٹا۔

میں نے بڑی منت سے ڈاکٹر شمسہ کو تو رضامند کر لیا کہ لڑکا صرف ایک نظر مریضہ کو دیکھ لے۔ مگر وہ مریضہ سے پوچھنے کے واسطے گئیں تو اُس نے سختی سے منع کر دیا، کہ کسی کو اس کے کمرے میں نہ آنے دیا جائے"

اصغر کی امی نے بتایا۔

"ہوں ۔۔! اُسے پھر کچھ شرم محسوس ہوئی اپنا منہ کالا دکھاتے ہوئے لیکن یہ بے حمیت مرد ہے کہ اُسے ملنے سے بہ ایں نوبت بھی گریز نہیں۔ کبھی تف ہے میں تو کہوں گا!"

اصغر غصہ سے کہہ رہا تھا۔ سعید کے لبوں پر مہر خاموشی تھی، مگر ضبط سے اُس کا دل پھٹا جارہا تھا۔ اس نے اپنا سر کرسی کے تکیہ پر گرا دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔۔

اصغر مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں تمہیں تھپڑ نہ مار بیٹھوں!

"اسی بوتے پر ایک دکھی دوست کو گھر لائے ہو کہ اس کی دلجوئی اور دردمندی کا یارا نہیں ہے تمہیں؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ اصغر کا دل خود دکھا ہوا تھا لیکن وہ سعید کو غیرت دلا کر اس کے جذبۂ تنفر کو جگانا چاہتا تھا

اگر میرا بس چلے تو کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کروں، اس بچے کا درد مٹانے کے لئے ۔ مگر کیا کروں ۔۔!"

وہ سچ مچ رونے کے قریب ہو رہی تھیں۔

ایک تو پہلے ہی اُس غریب لڑکی کی تکلیف کے احساس سے میرا دل اڑ رہا تھا اوپر سے یہ واقعہ معلوم ہوا تو اور بھی حالت غیر ہوئی جاتی ہے اور تم ہو کہ مجھے غصہ دلا رہے ہو۔"

وہ بیٹے کی طرف خفگی سے دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

"نہیں امی ۔۔!" مگر امی بات قطع کر کے بولیں۔

"کچھ مت کہو۔ میں نہیں سنتی تمہاری بے ڈھنگی باتیں۔"

پھر انہوں نے منت سماجت کر کے سعید کو چائے کی گرم پیالی پلائی۔ شفقت سے باتیں کرتی اور تسلی دیتی رہیں۔ کافی رات جا چکی تھی جب وہ اٹھیں۔

تو اب اٹھو اور سو جانے کی کوشش کرو، میں نے تو اس وقت عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی۔ اصغر اپنے دوست کا دل بہلا رہا تھا اور تسلی کی باتیں کر رہا تھا اس سے۔ تو شب بخیر اللہ پاک بہتر کرے گا۔!"

وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے چلی گئیں۔ اصغر کا دل اپنے عزیز دوست کے لئے پگھل رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سعید کے گلے میں باہیں ڈال کر اُسے پیار کرنے اور تسلی دینے لگا۔ پھر وہ دونوں دبے پاؤں نکل کر چھت پر آئے اور دیوار پر سے نیچے جھانک کر دیکھنے لگے نیچے وہی بے چین سی نقل و حرکت جاری تھی۔ اتنے ہی میں اندر سے ایک نرس نکلی اور مطب کے دروازہ پر کھڑی ہو کر کہنے لگی۔

فلورا۔ تم اوزار اُبالو جلدی سے۔ ڈاکٹر ہیرلین پھر آ رہے ہیں۔"

تو اپریشن ہوگا ۔۔ ؟" دوسری نرس نے پوچھا۔

" ہاں ہاں ۔۔ وہ کہہ گئے تھے کہ دس بجے تک ڈیلوری نہ ہو تو انہیں ٹیلیفون ہیرلین کی نرس نے جو اوزار تمہارے سپرد کئے تھے انہیں خوب ابالو اور صاف ٹرے میں رکھ کر اوپر سے ڈھانپ رکھو میں ابھی آتی ہوں۔" پہلی نرس نے دوبارہ تاکید کی۔

" ویسے کیفیت کیا ہے؟ بچ تو جائے گی نا ۔ ؟" دوسری نرس نے پوچھا۔"

" بے ہوش ہے اب تو مشکل ہی نظر آتا ہے بچنا تو اس کا!" پہلی نرس مایوسی سے کہتی ہوئی پلٹی۔

ہائے بیچاری! کیسی خوبصورت ہے خدا کرے بچ جائے ۔!" وہ اکیلی ہی دعائیہ لہجہ میں کہہ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی مخاطب نرس تو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر جا چکی تھی۔

" اصغر ۔۔ سنا تم نے ؟" وہ بچ نہ سکے گی اور میں اُسے آخری بار دیکھ بھی نہیں سکتا!" سعید نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

" اس وقت صرف دعا کرو اُسے سچے دل سے چاہتے ہو۔ اللہ پاک

سے اُس کی زندگی کی بھیک مانگو تمہاری بے غرض اور بے لوث دعا ناکام نہ رہے گی ۔" میں نے اس وقت سے اب تک کتنی دعائیں مانگیں۔ مگر سنا تم نے وہ نرس کیا کہہ کر گئی ہے ۔" سعید نے انتہائی درد بھری آواز میں کہا ۔

" میں یہاں ٹھہر کر خبر گیری کرتا ہوں تم اندر جا کر نماز پڑھو اور تنہائی میں دعا مانگو ۔" اصغر نے کہا اور اتنے ہی میں کار ٹھہرنے کی آواز آئی ۔

" ڈاکٹر ہیریسن آگیا ہے !"

سعید نے سرگوشی جیسی آواز میں کہا ۔ اُسے اپنا سانس ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں جسم میں سنسنی اور ارتعاش تھا۔ اس نے اصغر کا بازو تھام لیا۔

ہاں آگیا ڈاکٹر ہیریسن ۔" اصغر نے جواب دیا۔

" اب — اب اپریشن — آف ! میری نازک سی جوہر یہ برداشت کر سکے گی ؟ یا اللہ رحم — رحم — !" اس نے بے تابی سے روتے ہوئے کہا ۔

جاؤ نا جا کر نماز پڑھو اور دعا کرو — !" اصغر نے اسے سنبھالتے ہوئے منت سے کہا اور سعید ہمت کر کے اندر چلا گیا۔ لباس تبدیل کیا۔ غسلخانہ میں جا کر وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگا ۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف یہ بات تھی کہ اس کی جوہر خطرہ میں تھی ۔ اس کی بے وفائی — بے اعتنائی کچھ بھی اُسے یاد نہ تھا اور اس نے حضور قلب کے ساتھ گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خالق دو جہاں میری جوہر کو زندگی بخش !"

خود رفتگی میں اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ڈھلک رہی تھیں اور دل کی گہرائیوں سے یہ ایک ہی فقرا اُبھر اُبھر کر زبان پر آتا تھا ۔ اور جب وہ جائے نماز سے اُٹھا تو کوئی غیبی آواز اُسے تسکین دے رہی تھی اور اس کا دل اس وعدہ کو محسوس کر رہا تھا کہ " اس کی جوہر زندہ رہے گی ۔ !"

انشاء اللہ ! میری جوہر زندہ رہے گی !" اس نے طمانیت قلب اور

پورے اعتماد کے ساتھ بلند آواز سے کہا اور باہر آیا۔ اصغر بدستور دیوار کے قریب کھڑا تھا سعید بھی اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور نیچے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں — ؟ کچھ پتہ چلا — ؟"

"ابھی تک ہیریسن باہر نہیں نکلا —" اصغر نے زیر لب جواب دیا سعید چپ ہو گیا دونوں گوش بر آواز کھڑے تھے کہ بھاری بھرکم قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ڈاکٹر ہیریسن سامنے کمرہ سے نکل کر مطب میں گھس گیا۔

"اپریشن ختم ہو گیا —! چلو نیچے چلیں اور صفدر کو بلا کر پوچھیں کہ اپریشن کیسا رہا۔" سعید نے اصغر کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"صفدر اس وقت سو رہا ہو گا سعید — کیوں نہ یہیں کھڑے رہیں کسی نہ کسی سے معلوم ہو ہی جائے گا۔" اصغر کہنے لگا۔

"نہیں —! چلو کسی ملازم سے پوچھتے ہیں —!" سعید نے بیقراری سے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا، اتنے ہی میں، ڈاکٹر ہیریسن تولیہ سے ہاتھ پونچھتا ہوا باہر نکلا اس کا ملازم قریب ہی جیسٹر اور ہیٹ لئے کھڑا تھا۔ اس نے صحن ہی میں کھڑے کھڑے جیسٹر پہنا ہیٹ لیا، اتنے ہی میں ڈاکٹر فیاض اور شمسہ بھی باہر نکل آئے لیکن سب خاموش تھے۔ ایک معنی خیز سی خاموشی ہر طرف مسلط تھی۔ اصغر نے اس خاموشی کا مطلب اخذ کر لیا تھا اور اب سعید کے خیال سے دل ہی میں خائف تھا۔ اُس نے سوچا بہتر ہے سعید کو اس جگہ سے ہٹا لیا جائے ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ آپس میں کوئی ایسی بات کریں جس سے اصلیت کا اظہار ہو جائے۔ لیکن اس کی احتیاط بعد از وقت تھی۔

"اچھا ڈاکٹر! مجھے بے حد افسوس ہے —! مگر ہم نے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی۔"

ڈاکٹر ہیریسن نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے افسوس اور معذرت کے لہجہ میں کہا۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے ؟" سعید کو جیسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا تو اس نے اصغر سے پوچھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر تم اندر چلو میں پتہ کرتا ہوں۔" اصغر نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ مگر وہ بدستور دیوار کو پکڑے کھڑا رہا۔ تینوں ڈاکٹر باہر چلے گئے۔ نرس دروازہ تک جا کر پلٹ آئی۔ مطب سے کمپونڈر نکلا۔

"کیا مر گئی ——؟" وہ نرس سے پوچھنے لگا۔ مگر وہ دبی آواز میں بول رہا تھا اور اصغر نے سعید کو اس طرف کھینچ رکھا تھا۔

"ہاں مر گئی بیچاری —— !تم اس وقت سے اب واپس آئے انجکشن لے کر ؟" نرس نے جواب دیا۔

"کہیں سے ملتے ہی نہ تھے سارے شہر میں گھومنا پڑا۔" وہ کہنے لگا۔

"خیر اب کس کام کے —— یہ تو ڈیلیوری کے بعد مریضہ بچ جاتی تو درکار تھے ——" نرس نے یہ آخری الفاظ ذرا بلند آواز میں کہے تھے

"ہیں ——؟

تو کیا مریضہ بچ نہ سکی —— ؟" سعید نے چیخ کر پوچھا۔ اس کی آواز پر نرس نے اوپر دیکھا۔

"نہیں صاحب! مر گئی بیچاری!" وہ کہنے لگی۔ سعید نے ایک ہی جھٹکے سے اپنا بازو اصغر کی گرفت سے چھڑایا اور نیچے بھاگا۔

"کہاں ہے ——؟"

"کہاں ہے —— ؟ کہاں ہے میری جوہر؟ ظالمو! اب تو بتا دو مجھے کہاں ہے وہ —— !" سعید دیوانہ وار دوڑتا ہوا کمرے میں گھس گیا سب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

"جوہر —— !" سعید کی فلک شگاف چنگھاڑ! اصغر نے ڈیوڑھی ہی میں سنی ڈاکٹر اور اس کی بیوی بھی گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے وہ —— لاش پر گر کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

(۱۶)

اس نے تین شب و روز کے بعد آنکھیں کھولیں تو اس کی دھندلی نگاہیں اپنے سامنے کی کرسی پر ایک دلکش ہیولے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، وہ نیم باز آنکھوں سے سفید سفید دھند میں لپٹے ہوئے سر سے پاؤں تک سفید دودھیا لباس میں ملبوس، اس مبہم سے مجسمہ کو دیکھتا چلا گیا ۔۔۔ اتنے میں نرس داخل ہوئی۔ سعید کی پیشانی پر سلوٹیں سمٹ آئیں وہ اس فردوس نگاہ سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس نرس نے ظلم کیا ۔۔۔

یہ کم بخت درمیان میں حائل ہوئی اور اسی لمحہ کرسی پر سے جوہر کی وہ حسین شبیہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی دوا پلا کر نرس ہٹی تو کرسی خالی تھی، جوہر غائب ہو گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا خوابیدہ سا دماغ قسم قسم کی قیاس آرائیاں کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں جوہر کی موت کا شعور موجود تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ خواب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ بھی اپنی محبوبہ کے پاس عالم بالا میں پہنچ گیا ہے۔ لیکن پھر اُسے نرس کا خیال آیا۔ دوائی کا کسیلا اور تلخ ذائقہ اب بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس حقیقت

کا احساس کرتے ہوئے کہ وہ بیمار ہے۔ اس کا دل دکھنے سا لگا، کتنی قابل رحم حالت تھی کہ ابھی زیست کی حدیں اس کی محبوب ہستی کے درمیان حائل تھیں اف! تار نفس کا یہ بُعد کتنا ناقابل عبور تھا! وہ یکدم گھبرا اٹھا اس نے آنکھیں کھولنی چاہیں۔ مگر اُس کے پپوٹے بیقراری سے پھڑ پھڑا کر رہ گئے پھر اُسے اپنی جوہر کا وہ ہیولےٰ یاد آیا جسے اسی نے ابھی ابھی کرسی پر دیکھا تھا اور وہ دل ہی دل میں روح کی بقا کا قائل ہو گیا۔ جس سے وہ ہمیشہ انکار کیا کرتا تھا۔ اس کی کشش محبت زخم خوردہ دل کو ایک گونہ تسکین محسوس ہوئی کہ اس کی کشش محبت جوہر کو اس مادی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔

اور خواب آور دوائیوں اور دماغی بخار کی غنودگی کے ملے جلے اثرات کے ماتحت کامل ہفتہ بھر سعید نیم خوابی کی حالت میں پڑا رہا۔ اس کیفیت میں اُسے بارہا اپنی جوہر نظر آتی۔ کبھی وہ اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی ہوتی کبھی کمرے میں چلتی پھرتی نظر آتی اور کسی وقت تو وہ اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے آنکھیں کھول دیتا وہ اس کی پیشانی یا نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوتی۔ وہ غنودگی ہی میں مسکرا دیتا۔ اس کی نیم باز آنکھیں اس محبوب چہرے کو دیکھتے ہی دیکھتے مندمل جاتیں اور پھر اُس مصنوعی نیند کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا جو معالجوں نے اس کے علاج کے لئے لازمی قرار دی تھی۔

گیارھویں دن بخار اترا۔ اصغر کے پیار سے پکارنے پر سعید نے آنکھیں کھول دیں۔ اصغر اس کا ہاتھ تھام کر محبت بھرے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

"اُٹھو بھائی! دیکھو ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا۔ میں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں!"

سعید نے نقاہت سے آنکھیں کھول دیں اصغر کا مخلص چہرہ اس کے سامنے تھا وہ مسکرانے لگا۔ لیکن فوراً ہی گزشتہ حالات کا نقشہ اس کے سامنے آ گیا اور وہ رنجیدہ سا ہو گیا۔ اصغر نے دودھ میں اوولٹین ملائی

اور اپنے بازو کا سہارا دے کر سعید کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔
"ڈاکٹر نے تمہارے ساتھ زیادہ بولنے چالنے کا حکم دیا نہیں ہے ورنہ تمہیں عجیب وغریب واقعات سناتا۔ خیر تم جلدی اچھے ہو جاؤ اب تو۔"
وہ چائے کی دوسری پیالی بناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اتنے ہی میں نرس آئی۔
"بس اب انہیں تنہا چھوڑ دیجئے صاحب! ڈاکٹر نے انہیں بولنے کے لئے منع کر رکھا ہے۔" نرس نے یکسر خشک لہجہ میں حکماً کہا
"لیجئے صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔ اچھا سعید خدا حافظ! سو جاؤ زیادہ سوچنا نہیں۔ ہوں؟"
اور اصغر اسے آہستہ سے تھپکتے ہوئے کمرے سے چلا گیا۔ نرس نے چارٹ دیکھ کر دوائی پلائی انجکشن لگایا اور مریض کو تنہا چھوڑ کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔ سعید پر آہستہ آہستہ غنودگی چھانے لگی۔ اس نیم خوابیدگی کی حالت میں اُسے پھر جوہر نظر آئی۔ وہ کبھی جھک کر اس کی پیشانی کو چھوتی کبھی اس کے بال سلجھاتی یہاں تک کہ جب وہ بیدار ہوتا تو اس کی طبیعت سخت بدمزہ ہوتی اور وہ آرزو کرنے لگتا کہ کاش اس پر ہمیشہ ایسی ہی کیفیت طاری رہے کہ اسکے خواب جوہر کے جلوؤں سے منور رہیں۔ یہ بیداری، یہ زندگی کس قدر سونی اور ویران تھی۔ جس میں نہ کوئی اُمید باقی رہی نہ انتظار۔ — آخر کئی دن کے بعد وہ اس قابل ہو سکا کہ نکل کر باہر دھوپ میں بیٹھ سکے۔ اصغر اس کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی امی کتنی اداس نظر آ رہی تھیں۔ جب وہ یخنی کی پیالی لے کر باورچی خانہ سے نکلیں تو اصغر کہہ رہا تھا۔
"تاش کھیلو گے سعید .... ؟"
"خدا بچائے اصغر! تم تو سچ مچ کے فوجی ہو کر رہ گئے ہو۔ ابھی اس میں ہمت ہے تاش کھیلنے کی؟ تھک جائے گا۔" وہ خفا ہونے لگیں۔
اسے ہمت پیدا کرنی چاہیے اور ادھر کیا سے کیا ہو گئی۔ اور یہ ہیں کہ

ابھی ہمت ہی ہارے بیٹھے ہیں !" اصغر کچھ پر معنی انداز سے کہنے لگا۔

خیر تم چپ رہو ابھی —— لو سعید بیٹے اٹھو یخنی پی لو۔ یہ خاص طور پر تمہارے لئے بنائی گئی ہے ساری پینا ہو گی تمہیں۔" وہ کہنے لگیں۔

" ہوں —! اور یہ بھی تو بتا دیجئے نا کس نے بنائی ہے!"

اصغر نے شرارت بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ خفگی سے اس کی طرف پلٹیں اور گھورتے ہوئے بولیں۔

" تم چپ نہیں رہو گے نا؟"

بھئی امی! اب چپ نہیں رہا جاتا پیٹ میں بری طرح چوہے دوڑ رہے ہیں۔" وہ ضد کرنے کے انداز میں کہنے لگا۔

" سننا ذرا سعید! اس کے پیٹ میں بری طرح چوہے دوڑ رہے ہیں وہ ہنس کر بات ٹالنے کو بولیں۔

" کیا بات ہے —؟" سعید نے اشتیاق سے پوچھا۔

" بات کیا ہوتی —— بس بھوک لگی ہو گی۔ آؤ میرے ساتھ باورچی خانہ میں تمہیں کچھ کھانے کو دوں۔" باورچی خانہ کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگیں۔

جی ہاں میں باز آیا —— مجھے معلوم ہے وہاں آ کر کیا ملے گا کھانے کو" اصغر قہقہہ لگا کر بولا۔

کیا ملے گا بھلا —؟ امی نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

" جوتے —!" اصغر نے بلا توقف کہا۔

" شریر ہو سراسر!" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئیں۔

کیا کوئی خاص بات ہے اصغر؟ کہیں میری بیماری کے دوران ہی میں تمہاری شادی تو نہیں ہو گئی؟" سعید نے قیاس دوڑایا۔

واہ وا —! کیا سوجھ بوجھ پائی ہے! میں کہتا ہوں لال بجھکڑ" بھی سو سال

متواتر تمہاری شاگردی کرے۔ کان پکڑے۔ پانی بھرے، تب کہیں جاکر اس تیزی سے بات بوجھ سکے!"

اصغر نے داد دینے کے انداز سے سر ہلاتے ہوئے اور آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

للّٰہ بتا دو بھئی ــــ کیوں تنگ کرتے ہو۔ دیکھو مجھے پھر بخار آجائے گا۔ سعید نے بضد ہو کر کہا۔

ارے واہ! تمہاری اس بات پر تو مجھے ایک بھولا بسرا لطیفہ یاد آگیا ــــ ہماری ایک عزیزہ ہیں۔ جب چھوٹی سی تھیں تو ان پر بے ہوشی کا دورہ پڑ جایا کرتا۔ اب جو انہیں اپنی کوئی بھی بات منوانے میں دقت ہوئی تو فوراً الٹی میٹم دیا کرتیں۔ کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو میں ابھی دورہ ڈال لوں گی!" وہی بات تم نے کی۔"

اصغر نے قہقہہ لگایا اور اس طرح بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا۔ لیکن سعید بدستور مصر تھا۔

بتا دو بھی نا ــــ کیوں تنگ کرتے ہو۔" سعید نے مارے نقاہت کے تکیے پر سر ٹکاتے ہوئے اصرار کیا۔

نہیں بھیا کہاں شادی ہو سکی میری ــــ ایک تمہیں نے رنگ میں بھنگ ڈال دی بیمار پڑ کر تاریخ بڑھا دی گئی اور چھٹی منگوانی پڑی مجھے۔" اصغر کہہ رہا تھا۔

"تو خالہ جان کون سی بات پر چپ رہنے کو کہہ رہی تھیں تمہیں؟" سعید نے پھر ضد کے انداز سے پوچھا۔

"بڑی عجیب و غریب باتیں سناؤں گا تمہیں کہ بس حیران رہ جاؤ گے۔ مگر شرط یہ کہ جو میں کہوں بلا عذر کرتے جاؤ ــــ" اصغر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"اچھا کہو کیا کروں ــــ؟" سعید نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

"فی الحال تو اتنا کرو کہ صحت کا خیال رکھو اور خوش خوش رہو" اصغر نے کہا۔

" خوش خوش رہوں ؟" سعید نے عجب پرمعنی انداز سے پوچھا۔
" ہاں دوست! ابھی تم نے میرا کہنا ماننے کا وعدہ کیا ہے اور ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں کہ ہر وقت خوش رہو!" اصغر نے جواب دیا۔
" ڈاکٹروں کی اور بات ہے۔ مگر تم —؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتے ہو!" اس نے کمزور آواز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔
ارے واہ! تم ابھی تک اس واقعہ کے خیال میں ہو! بھئی واللہ عجب احمق ہو تم بھی!" اصغر نے قہقہہ لگا کر کہا۔
" اصغر —!"
وہ زیادہ نہ کہہ سکا مگر اس ایک لفظ میں کتنی شکایت، کس قدر ملامت بھری ہوئی تھی۔ اُسے دکھ ہوا۔ کہ اصغر جیسا دلی دوست اُس کے درد نہاں سے اس قدر بے خبر ہے۔
کچھ بات ہونا آخر —؟ تم بیکار کو اتنے دن بیمار پڑے رہے۔
اصغر کہنے لگا۔ سعید نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور غور سے اس کے چہرے کی طرف تکنے لگا، جیسے اُس کے ذہنی توازن میں فرق کا خدشہ ہو۔
" کیا کہہ رہے ہو —؟" بخدا مجھے الجھن ہونے لگی۔"
سعید اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
تو الجھن کو سلجھاؤ —— حواس اور حوصلہ قائم کرو تو انسان کوئی بات بھی کرے۔ امی بات بات پر کہتی ہیں اس میں ابھی ہمت نہیں اور تم واقعی ثابت کر رہے ہو کہ تم میں ہمت نہیں کوئی غیر معمولی بات سننے کی!" اصغر نے اب سنجیدہ ہو کر کہا۔
" مجھ میں پوری ہمت ہے —! میرے اچھے بھیا بتا دو کیا بات ہے؟"
سعید نے ہاتھ بڑھا کر اصغر کا ہاتھ تھام لیا اور منت کہنے لگا۔
"ہوں! یہ بات ہے تو امی سے جوتے پٹنے کی بھی مجھے پروا نہیں۔
" لو سنو تمہاری جوہر اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہے!" اس نے

سعید کے ہاتھ کو محبت سے دباتے ہوئے کہا۔

"مگر ــ" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اصغر نے ٹوکا۔

"میری بات سنتے جاؤ تحمل سے ــــ نگار کو ہم غلطی سے جوہر سمجھتے رہے مگر بیچاری نگار دراصل جوہر کی بہن تھی۔"

"سچ ـــ؟" سعید نے دفور حیرت سے منہ کھول دیا۔

"بالکل سچ!" اصغر نے پرزور لہجہ میں کہا۔

"نہیں ـــ تم محض مجھے بہلانے کو کہہ رہے ہو۔ بھلا میں اور اپنی جوہر کو شناخت کرنے میں غلطی کروں؟" سعید کے چہرے پر پھر مایوسی چھا گئی۔

اب قسم دلوانا چاہتے ہو تو بھی کھانے کو تیار ہوں ــ کہ تم نے شناخت میں فاش غلطی کی۔ ایک خط "نگم" کے پتہ پر بھیجا گیا تھا وہ خط امی کے پاس موجود ہے۔

اُسے پڑھ کر تمہیں میری صداقت کا یقین ہو جائے گا۔"

اور وہ سوچنے لگا کہ امی سے خط کیسے حاصل کیا جائے۔ وہ ابھی سعید کو آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"امی خفا تو ہوں گی مگر تمہاری خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں بھائی!"

وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر باورچی خانہ میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد امی بڑبڑاتی ہوئی اس کے ساتھ آئیں۔

"تم ہمیشہ کے خودسر ہو ــ! اگر ہیجانی کیفیت سے اُسے کچھ تکلیف ہو گئی تو تم ذمہ دار ہو گے!"

"دیکھ لیجئے امی وہ تو بالکل مطمئن اور پُرسکون ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس خبر سے اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔" اصغر کہنے لگا۔

اور چند ہی لمحے کے بعد وہ ایک کاغذ لئے ہوئے آیا۔

"لو پڑھو ــ!" اس نے گلابی رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ سعید دفور اشتیاق سے سیدھا ہو بیٹھا اور خط کھول کر

پڑھنے لگا۔

پیاری ماں جی - آداب

آپ میرا خط پاکر یقیناً حیران ہوں گی۔ کیونکہ آپ لوگ تو مجھے مردہ تصور کرکے مطمئن ہو چکے ہوں گے۔

اس تین سال کے عرصہ میں مجھ پر کیا گزری ؟ یہ ایک لمبی داستان ہے جسے مختصر طور پر میں جوہر کے خط میں لکھ رہی ہوں پڑھ لیجئے، میں آپ کی شفقت کو کبھی فراموش نہیں کرسکی۔ مگر ذاکر بھائی کے ناروا سلوک نے مجھے دربدر ہونے پر مجبور کیا میرے انجام کے صرف وہ ذمہ دار ہیں۔

دوسرا خط جوہر کو دے دیجئے۔

آپ کی گوہر!

" گوہر — ؟" سعید نے حیران ہوکر اصغر سے پوچھا۔

" ہاں — نگار کا ایک نام گوہر بھی تھا سعید —"

اصغر کے ہر وقت مسکراتے چہرے پر اس وقت غم کے بادل چھا رہے تھے۔

" اسے — یعنی — ؟ ایک نام یہ بھی تھا - گویا ان دونوں ناموں کے علاوہ تیسرا بھی نام تھا ؟ وہ آنکھیں جھپک کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

" تم دوسرا خط پڑھو — یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کیا تھا تیسرا نام ؟"

دوسرا خط پڑھ رہا تھا —

پیاری جوہر - سلام محبت!

یہ خط ملتے ہی تم ماں جی کو ساتھ لے کر فوراً اس پتہ پر پہنچ جاؤ جو میں اس خط میں لکھ رہی ہوں، میری حالت خراب ہے اسی لئے خط کے شروع ہی میں تاکید لکھ دی کہ ممکن ہے میں زیادہ طویل خط لکھنے کی مہلت نہ پاؤں۔ گو میں اس میں نہیں وہ سب کچھ

لکھنا چاہتی ہوں گھر سے باہر نکل کر جو تلخ تجربہ مجھے ہوا کاش کہ اس کی تفصیل ہر لڑکی کے کان تک پہنچانے کی میرے پاس مہلت ہوتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جس جانکاہ دور سے میں گذر رہی ہوں اُس سے جانبر نہ ہو سکوں گی اور نہ اب زندہ رہنے کی مجھے ہوس ہے۔

اور اتنا تو میں خدائے رحیم کے روبرو بھی کہے بغیر نہ رہ سکوں گی کہ جو کچھ مجھ سے سرزد ہوا اُس کا مواخذہ ذاکر سے کیا جائے جس نے مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس مالک کے ہاں جو سب کچھ دیکھتا اور سب کچھ سنتا ہے یہ اندھیر نہ ہو گا۔ کہ گناہ کے راستہ پر ڈالنے والے بچ جائیں۔ سب سے پہلے مجھے ذاکر ہی نے گناہ کی ترغیب دی مگر یہ گھناؤنی اور کراہیت آمیز محسوس ہوئی۔ میں نے اُسے ہمیشہ حقیقی بھائی سمجھا تھا اور اس تصور کو میں حقیقت حال جاننے کے بعد بھی مٹا نہ سکی۔ مگر اس درندے نے میرے لئے گھر میں سانس تک لینا محال کر دیا۔ اُس نے مجھ پر عافیت تنگ کر دی وہ ہر موقعہ پر میرے راستہ کا پتھر بن کر حائل ہو جاتا۔ میری ملازمت کے سلسلہ میں بھی اسی نے رکاوٹ ڈالی اور میری درخواست کہیں خورد برد کر دی۔ انٹرویو کے لئے تمہیں بلایا گیا تم منتخب ہو گئیں میں رہ گئی۔ یاد ہے نا تمہاری روانگی کی رات کو اُس نے مجھ پر دست اندازی کی اور میرے ہاتھ سے زخمی ہوا اور مجھے قتل کر دینے کی قسم کھا کر گھر سے نکل گیا، ماں جی نے ڈر کر مجھے مجبور کیا کہ تمہارے ساتھ ہی شہر چلی جاؤں، اور دوبارہ کالج میں داخل ہو کر تعلیم مکمل کر لوں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

کالج میں داخل ہوئی تو مجھے ہوسٹل میں جگہ نہ ملی میں ایک ہم جماعت لڑکی کے ساتھ الگ مکان لے کر رہنے لگی۔ اس وقت تک

تم سے میری خط و کتابت جاری رہی۔ لیکن انہیں دنوں ذاکر نے میرا سراغ پا لیا اور ایک دن کالج جاتے ہوئے مجھے راستہ میں روک لیا۔ میں اس کی دھمکیوں کا جواب بڑے حوصلہ سے دیتی رہی اور بظاہر اُسے جتایا کہ میں اس سے خائف نہیں ہوں مگر اُس شیطان صفت آدمی کی کمینگی سے خوب واقف تھی۔ میں نے بڑی کوششوں سے ہوسٹل میں جگہ حاصل کی اور کالج سے نکلنا بند کر دیا۔ لیکن اس بدفطرت آدمی نے مجھے بدنام کرنے کے لئے میرے پتہ پر قابل اعتراض خطوط لکھنے شروع کئے اور ظلم یہ کہ میرا خرچ آنا بند ہو گیا۔

کئی مہینوں کی فیس میرے ذمہ واجب الادا ہو گئی تو میرا نام کالج سے خارج کر دیا گیا۔ ماں جی نے بھی میرے کسی خط کا جواب نہ دیا غالباً ذاکر میرا خط اُن تک پہنچنے ہی نہیں دیتا تھا آخر پھر میں اُسی لڑکی کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوئی وہ یوں تو بڑی ہمدرد اور غمگسار تھی۔ مگر آزاد منش اور سیر و تفریح کی بے حد شائق تھی۔ امیر آدمی کی بیٹی تھی۔ اخراجات فراوانی سے ملتے تھے۔ اس نے میری کافی مدد کی اور مجھے ایک مقامی مدرسہ میں ملازمت دلوا دی۔

مگر ذاکر میرے سر پہ بلائے مبرم کی طرح سوار تھا اس نے پھر میرے مکان اور میرے اسکول کا سراغ لگا لیا اسکول میں وہی خرافات سے بھرے ہوئے خط بھیجنے لگا اور مکان کے گرد وقت بے وقت منڈلاتا نظر آتا۔

مختصر یہ کہ میری ملازمت بھی جاتی رہی اور ہمیں پھر مکان تبدیل کرنا پڑا۔ میں بے حد پریشان رہنے لگی۔ کیونکہ میرے ساتھ والی لڑکی زمرد بھی چھٹیوں میں گھر جا رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا اور میں تھوڑے بہت اصرار کے بعد رضامند ہو گئی

اس کے والد ایک تھیٹریکل کمپنی کے مالک تھے دیکھ کر انہوں نے کہا کہ مجھ میں ایک بہترین فن کار کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں خود زمرد کو تکمیل تعلیم کے بعد وہ سٹیج پر لائیں گے۔

انہوں نے سٹیج ڈرامہ کو ایک باعزت فن اور مہذب آرٹ ثابت کرنے میں ایسی مدلل لفاظی اور چرب زبانی سے کام لیا کہ مجھے واقعی سٹیج کا مقام عرش معلےٰ کے ہم پایہ نظر آنے لگا۔

اور یوں میں ہر احتیاط کے باوصف غلط ہاتھوں میں پڑ گئی غلط فیصلہ کر بیٹھی اور غلط قدم اٹھاتے ہوئے محسوس بھی نہ کیا، کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔ میں نے آرٹسٹک نام "نگار" رکھ لیا اس مرحلہ پر گوہر مر گئی۔

اپنے لئے بھی اور دنیا کے لئے بھی۔ اب اس کی جگہ نگار نے جنم لیا۔ نگار جو گوہر کو ماضی کی گہری قبر میں دفن کر کے مستقبل کے آسمان پر مہر نیم روز بن کر چمکنے کی آرزو میں آرٹ کی دنیا میں داخل ہوئی۔

لوگ مجھے سر آنکھوں پر جگہ دینے لگے۔ میں سیم وزر اور جاہ وحشم میں کھیلنے لگی۔ مگر بایں ہمہ لوگوں نے مجھے اسی زاویہ سے دیکھا جس سے وہ اس نوعیت کی دوسری عورتوں کو دیکھنے کے عادی تھے۔ ان کے نزدیک میں ماہر فن رقاصہ ہی تھی جس کی ہر ادا پر وہ جان کی بازی تو ہار سکتے تھے۔ مگر اس کے پاکباز اور شریف ہونے کے قائل نہ ہو سکتے تھے ــــ رقاصہ اور شرافت ــــ؟ معاذ اللہ! اجتماع ضدین کو کون مانے؟ اس کے باوصف میں نے مدتوں مرد کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ کبھی کسی کو الگ ملاقات کی اجازت نہ دی۔

وہ منیجر کو بیش قیمت تحفے پیش کرتے۔ "نگار" کی بارگاہ ناز پر جبین سائی کرتے۔ التجائیں کرتے۔ روتے۔ مگر نگار کو وہ

سب ذاکر کے ہیولے دکھائی دیتے۔ مسخ شدہ انسانیت کی گھناؤنی پرچھائیاں جو عورت کی معصوم اور پاکیزہ فطرت پر یوں تاک لگائے رہتی ہیں جیسے کوئی شکاری باز کسی بھولی بھٹکی چڑیا کو تاکتا ہے اور جب اپنے مکر و ریا کے داؤ پیچ لگا کر اُسے اپنے چنگل میں گرفتار کر لیتا ہے تو پھر پیٹ سے ایسے پنجے نکالتا ہے کہ وہ بھولی اور زود اعتماد عورت اس کی قلب ماہیئت پر دنگ رہ جاتی ہے ۔ اکاش میں اس نظر فریب عفریت سے ہمیشہ محتاط رہتی ۔ مگر ۔

مگر میں ہزار کوشش کے باوجود محتاط نہ رہ سکی۔ میں ہزار احتیاط کے باوصف دھوکہ کھا گئی ۔ ہماری کمپنی ایک فوجی چھاؤنی میں فوجیوں کی تفریح طبع کے واسطے خاص پروگرام مرتب کر کے قیام پذیر ہوئی۔ اس جگہ ایک کرنل نے میجر شیرازی کو اس درجہ مجبور کیا۔ کہ فن کار لڑکیوں کو ہمیشہ نصیحتیں کرنے والا اور محتاط رہنے کی تلقین کرنے والا شیرازی خود اس کی سفارش اور خط لے کر میرے پاس آیا اور میری بدبختی کہ میں اس کی تحریر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ میں نے ملاقات کی اجازت دے کر اپنی تباہی کے محضر پر مہر ثبت کر دی۔

کرنل کیفی، میری زندگی میں ایک تباہ کن طوفان بن کر داخل ہوا ۔ طوفان! تیز و تند طوفان ۔ ! جس نے میری ہستی کو ایک تیز رو بگولے میں لپیٹ دیا۔ میرے ہوش و حواس ایک چکر میں پڑ گئے۔

مجھے کبھی محسوس نہ ہوا کہ اُس ریاکار مرد کی شیر و شکر باتوں میں، میں زہر ہلاہل کی کتنی مقدار پی گئی۔ اس کی شعبدہ بازیوں میں دکھائے جانے والے سبز باغوں میں میری فریب خوردہ نگاہ کو

کہیں خزاں کا سایہ تک کبھی نظر نہ آیا۔ میں شب و روز کی بسائی ہوئی خیالی جنت میں رہنے لگی۔ اس کی تخلیق کی ہوئی تخیلاتی کائنات کی بلندیوں پر اڑنے لگی۔

حتیٰ کہ وہ مجھے اس وعدہ پر اپنے ساتھ لے گیا کہ میرا کھویا ہوا مقام مجھے واپس دلا دے گا۔ مجھے اپنی بیگم بنا کر ایک دفعہ پھر معاشرہ میں میرے لئے شرافت کا مرتبہ حاصل کرے گا۔ مگر ان سارے بلند بانگ دعوؤں کے باوصف، معاشرہ تو کیا وہ مجھے اپنی ماں کے روبرو تک لے جانے کی جرأت نہ کر سکا۔

بھلا ایک سٹیج کی چھوکری کو وہ باعزت خاتون اپنی بہو بنا کر آغوش میں بٹھانا پسند کرے گی؟ اور وہ مجھے شہر شہر لئے لئے پھرا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں عنقریب اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو یک بیک وہ باد گرد جس میں گرفتار کئے مجھے وہ مجھے لئے لئے پھرتا تھا چھٹ کر فضا میں منتشر ہو گیا اور جب میری آنکھیں کھلیں تو میں تن تنہا یوں پڑی تھی جیسے کبھی کوئی میرے ساتھ تھا ہی نہیں جیسے میں ازل سے یوں ہی اکیلی اور لاوارث تھی۔

وہ مجھے ان ڈاکٹر میاں بیوی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا گیا جن کا پتہ لکھ رہی ہوں۔ اس نے میرے درجنوں خطوط کا ایک بھی جواب نہیں دیا۔ اس نے ڈاکٹر کے ٹیلی گرام تک کی پرواہ نہ کی۔

جوہی! میری بہن! گو تمہیں مجھ سے کتنی ہی نفرت ہو مگر یہ خط پا کر ضرور چلی آنا۔ ہو سکتا ہے کہ میں زندگی میں تم سے چند باتیں کر لوں۔ اور اگر مر جاؤں تو کوئی میری لاش کو لاوارث کہہ کر نہ اٹھا پھینکے۔

اور ہاں سنو جوہی! ایک شخص جس کا نام سعید تھا اور کرنل کیفی کی یونٹ میں کیپٹن ڈاکٹر تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے "جوہر" سمجھتا اور ملاقات پہ مصر رہتا ــــ جوہر! گو بظاہر وہ شخص تمہارے لئے دیوانہ ہے۔ مگر نہ میری بہن! یہ مرد سب کے سب بھیڑ کے لباس میں بھیڑیے ہوتے ہیں فطرتاً خود غرض اور حریص! تم کبھی کسی کی باتوں میں نہ آنا کبھی کسی کا اعتبار نہ کرنا، میرے تجربہ سے عبرت حاصل کرد کہ
"من نہ کردم شما حذر بکنید!"

کاش میں کیفی جیسے وجیہہ قالب میں چھپے ہوئے مرد سے بھی اُسی طرح ڈرتی جس طرح ذاکر جیسے کریہہ اور بدہیئت قالب میں چھپے ہوئے مرد سے ڈرتی تھی تو میرا یہ حشر نہ ہوتا۔

تمہاری بدنصیب بہن

گوہر

یہ خط پڑھ کر سعید نے آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ کا سہارا لے لیا۔ وہ واقعی بے حد کمزور تھا یہ طویل خط پڑھنے سے اور عجیب و غریب انکشاف سے متاثر ہو کر اس پر نقاہت نے غلبہ پا لیا۔ اور کئی منٹ تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔

اصغر نے اُسے سوچنے کا موقعہ دیتے ہوئے مداخلت موزوں نہ سمجھی اور خاموشی سے اس کے نحیف اور زرد چہرے کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے خود بخود آنکھیں کھولیں اور اصغر کی طرف دیکھا۔ وہ عالم از خود رفتگی میں اس کی موجودگی کو بھول ہی گیا تھا۔

"آؤ اب چلیں ــ سرد ہوا چلنے لگی ہے"

اصغر نے خط کے واقعہ کو جیسے کچھ اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا اور سعید کو سہارا دے کر اس کے کمرے میں لے آیا۔ نقاہت اور ہیجانی کیفیت نے اس کے اعصاب کو بڑی طرح جھنک کر رکھ دیا تھا۔ وہ نڈھال سا ہو

کر بستر پر لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد کمرے کی خوش گوار بوتی حدت اور آرام دہ گرم بستر نے اُس کے جسم میں توانائی پیدا کر دی، کہ وہ کچھ کہہ سکے۔

"سعید ——؟" اس نے دھیمی آواز میں اپنے دوست کو مخاطب کیا۔

"بس دو منٹ میں یہ تھوڑی سی یخنی پی لو۔ پھر باتیں کریں گے —— ہوں ——؟"

اصغر نے بڑے ہی میٹھے لہجہ میں کہا۔ سعید کو خبر بھی نہ ہوئی۔ کہ کب کوئی آیا اور اس سبک جیسی خوبصورت پیالی میں اس کے لئے یخنی رکھ گیا اس نے "پو میپیا" کی مانوس جیسی خوشبو محسوس کر کے آنکھیں کھولی تھیں۔

اور اب تو یخنی کی گرم گرم باس نے اُس جانفزا مہک کے اثر کو زائل کر دیا تھا۔ جس کے متعلق وہ ابھی اصغر سے سوال کرنے والا تھا۔ اصغر سہارے کے لئے اُس کی پشت سے لگا بیٹھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ یخنی پی رہا تھا۔ پھر اصغر نے اسے تکیہ کے سہارے بٹھا دیا اور خود قریب بیٹھ کر بڑے متمل انداز سے پوچھنے لگا۔

"لو اب کہو —— کیا کہنا چاہتے تھے؟"

وہ دل ہی میں ڈر بھی رہا تھا کہ اگر امی نے سعید کو یوں نڈھال سا پڑا ہوا دیکھ لیا تو بس شامت آئی۔

"اصغر سچ کہو —— یہ سارا معاملہ حقیقت ہے یا محض میری تشفی کے لئے تم نے یہ مفروضہ گھڑا ہے —— تم میرے لئے کیا کچھ نہیں کر رہے اصغر! میں تمہاری اس بے لوث اور بے انداز محبت پر حیران رہ گیا ہوں —— !" اس نے اصغر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مسلتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ! میں نے تمہیں پہلے ہی نہیں بتا دیا تھا کہ تم جیسا لال بجھکڑوں کا استاد سب کچھ یوں بوجھ لیتا ہے!" اصغر نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا

للّٰلہ ! سنجیدگی سے بات کرو اصغر ! تم سے تو میری حالت پوشیدہ نہیں
اُس نے اس قدر منت سے کہا۔ کہ اصغر کا دل تڑپ گیا۔ وہ کہنی کے
بل اس کے اوپر جھک گیا۔ اور زیر لب بولا۔

"امی پہلے ہی مجھ پہ بگڑ رہی ہیں — آج کے لیئے اسی قدر کافی ہے
باقی آئندہ !"

"اور نہ ستاؤ مجھے — !" سعید کہہ رہا تھا۔

"ورنہ تم دورہ ڈال لوگے — ؟ ہوں ؟" اصغر نے لاڈ کے انداز
میں اُس کی بات قطع کر کے کہا۔

"بتا بھی دو نا ! — میرے پیارے جیسے اصغر جو ہوئے تم ! تمہیں میری
جان کی قسم !"

سعید نے پھر منت کی۔ اصغر سنجیدگی سے چند لمحے اس کے چہرے
کو دیکھتا رہا۔

"بجذا یہ خط گوہر نے اپنی حقیقی بہن جوہر کو اسی گھر کی نچلی منزل میں بیٹھ
کر لکھا۔ لفافہ پر نگاہ ڈالو یہ وہی خط ہے جس کے متعلق میں تمہیں بتا چکا ہوں
کہ صفدر نے ایک دن چند خطوط راستہ میں میرے سپرد کئے کہ انہیں ڈاک
میں ڈال دوں۔ انہیں میں ایک یہ خط بھی تھا۔"

اصغر نے واقعی سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

"تو یہ خط "نگم" سے واپس تمہارے پاس کیسے پہنچا ؟" سعید نے پوچھا۔

"مجھے یہ خط بذات خود — جوہر نے دیا۔" اصغر نے قدرے توقف
کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا — ! تو وہ یہاں آئی تھی — ؟"

سعید نے مارے اشتیاق کے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اس کی آواز تجسس
اور جذبات سے گھٹ کر رہ گئی تھی۔

"ہاں — !" اصغر نے مسکرا کر کہا۔

"پھر — ؟" وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ اور

صورت سوال اصغر کے منہ کو تکنے لگا۔

"پھر کیا ۔۔ ؟" اصغر نے ہنستے ہوئے خود اُس سے سوال کیا۔

"نہ ستاؤ ۔۔ اصغر! سب کچھ خود بخود بتادو مجھے ۔" وہ نڈھال سا ہو کر منت کرنے لگا۔

"اور جوامی نے مجھے پیٹ کر رکھ دیا تو تم بچاؤ گے بھی نہیں۔" وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"کیوں نہیں ۔۔ ؟" سعید نے بے ساختہ کہہ اُٹھا تو ساتھ کے کمرے میں پس پردہ کسی کے آہستہ سے ہنسنے کی آواز آئی۔

یعنی بچاؤ گے ؟ ہمت آگئی ہے تم میں ؟" اصغر نے جلدی سے اُس کی توجہ ہٹانے کو کہا۔

"ہاں ۔۔ مگر یہ کون ہنسا تھا ساتھ کے کمرے میں ؟" اس نے چوکنا ہو کر پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ صرف وہم ہے تمہارا یا پھر کوئی ملازمہ ہوگی۔ ہاں تو کیا کہہ رہے ہو تم ۔۔ ؟" اصغر نے پوچھا۔

"میں پوچھ رہا تھا کہ جوہر خود یہاں آئی تو پھر کیا ہوا ۔۔ ؟"

سعید نے متوقع نظروں سے اصغر کے چہرے کو جیسے پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بس جو ہونا تھا ہو چکا ۔" اصغر نے سادگی سے کہا۔

"دیکھا نا تم نے پھر مجھے ستانا شروع کیا اور اس سے میری اُلجھن اور کوفت بڑھتی ہے ۔" سعید نے شکایت کے لہجہ میں کہا۔

"ارے بھئی ہوا یہی کہ بیچاری غریب لڑکی اپنی بہن کی حسرت ناک موت پہ بے حد رنجیدہ ہوئی ایسی موت کا رنج کسے نہیں ہوتا۔ اس کا قلق ابھی تک امی کے دل کو متاثر کیئے ہوئے ہے ۔"

اصغر نے پھر بات کو تشنہ ہی چھوڑ دیا۔

اور تم نے اُسے میرے متعلق کچھ نہ بتایا ۔۔ ؟ گو ہر پہ اُس کا شبہ

کرتے ہوئے جو مجھ پر گزری اُس سے وہ بے خبر ہی رہی ؟" اُس نے شکایت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

" نہیں — اس نے تمہاری حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا " اصغر نے کچھ عجب تاثر آنکھوں میں بھر کر کہا۔

" اچھا — ؟" سعید نے مسکرا کر پوچھا۔

" اور نہیں تو کیا — ؟" اصغر نے کہا۔

" اب کہاں ہے وہ — ؟" سعید نے اشتیاق سے اصغر کی طرف دیکھکر پوچھا۔

" اب سب کچھ ایک دم سے ہی پوچھ ڈالو گے ؟ بس چپ ہو جاؤ باقی باتیں پھر بتاؤں گا " اصغر نے جواب دیا۔

" ہاں پھر بتاؤں گا " اور جو پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تو کیا کرو گے ؟" کم حوصلہ کہیں کے ! ایک دو دن صبر نہ ہو سکا کہ اُسے ذرا ہوش سنبھال لینے دیتے !"

اصغر کی امی ایک دم خفا ہوتی چلی گئیں۔

خالہ جان ! آپ نہ خفا ہوں اصغر پر ، اسے میں نے ہی مجبور کیا تھا۔

" مجھ سے ہی صبر نہ ہو سکا معاف کر دیجیے اور ایک اتنا اور بتا دیجیے کہ اب — جوہر کہاں ہے ؟"

اصغر کی امی نے جواب میں مادرانہ شفقت کی ایک بھرپور نگاہ سعید کے پژمردہ اور منت کش جیسے چہرے پر ڈالی اور مسکرا دیں۔

" جوہر — یہیں ہے بیٹے — !" وہ مسکرا کر کہنے لگیں۔

" کہاں — ؟" دفور اشتیاق سے وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔ دل دھڑکنے لگا ، اور رنگت زرد پڑ گئی۔

" اب دیکھ لیجئے امی ! سب باتوں کی ایک بات خود آپ ہی نے بتائی پھر مجھے نہ کہیئے گا۔ کہ میں نے کچھ بتایا " اصغر نے بظاہر بگڑتے ہوئے ماں سے شکایت کی۔

"چلو ہٹو شریر نہ ہو تو — !"
انہوں نے بیٹے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا جس سے وہ انہیں لپٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم حوصلہ کرو سعید وہ یہیں ہے۔ جب تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے تو وہ ضرور تم سے ملے گی۔ ڈاکٹر نے یہی کہا ہے۔" اصغر کی امی کہنے لگیں۔

"میں اچھا ہوں خالہ جان! میں بالکل اچھا ہوں — ! آپ ڈاکٹر کی کچھ پروا نہ کیجئے اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

وہ یقین دلانے کے انداز سے پرزور لہجہ میں کہتا جا رہا تھا۔ اصغر کی امی اس کی طرف ترس کھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر ہنس دیں۔

"اچھا بیٹے! خدا کا شکر ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔ ابھی آتی ہے وہ تم گھبراؤ نہیں پرسکون ہو کر لیٹ جاؤ ذرا — اور اس کا باقی اصغر نے تمہیں اور تو سب کچھ بتایا مگر یہ بھی بتایا — ؟ کہ جوہر اور مرنے والی بدنصیب گوہر اس کی دہی توام بہنیں ہیں جن کی تصویر تم نے اس دن دیکھی تھی؟"

"نہیں — یہ تو نہیں بتایا اصغر نے مجھے — یہ تو عجیب حیرت انگیز اتفاق ہے!" حیرت زدہ سا کبھی اصغر کی طرف دیکھتا کبھی اس کی امی کی طرف۔

"صرف جوہر کی بات ہوتی تو میں بتا بھی دیتا لیکن وہ بدنصیب نیر —"
اصغر نے گردن جھکا کر جیسے انتہائی شرمساری سے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"اس میں تمہیں کیوں ندامت ہو — ؟ اس کے خط سے ظاہر ہے کہ وہ سراسر بے قصور اور مظلوم تھی۔ انتہائی ستم رسیدہ تھی — مگر اس کی موت کا انتقام لیا جائے گا!"

"اصغر! میں انتقام لوں گا۔ پہلے ذاکر سے اور پھر کیفی سے!" وہ سینہ پر ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا سعید میں جیسے ایک دم حمیت مردانہ بیدار ہو گئی

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں خود بھی تہیہ کر چکا ہوں سعید! مجھے صرف یہ انتظار ہے کہ تم تندرست ہو کر چلنے پھرنے لگو۔ میں اُس مردار کیفی کے سینہ میں اپنے پستول کی چھ گولیاں پیوست کروں گا۔ اور پھر اُس کی لاش کو مردار خور جانوروں کے سامنے ڈال دوں گا۔ کہ وہ اس مردم آزار عفریت کے جسم سے بوٹیاں نوچ نوچ کر اپنے پیٹ کے دوزخ میں بھر لیں۔"

اصغر کی آنکھوں سے مارے غیظ و غضب کے چنگاریاں جھڑ رہی تھیں۔

"اللہ پاک منتقم حقیقی ہے میرے بچو! ظالم کو اس قادرِ مطلق کے انتقام کے حوالے کر دیا جائے تو وہ اس سے قرار واقعی انتقام لیتا ہے کہ جو انسان سے کسی صورت بر نہ آتا — تم بھی خدا پہ چھوڑ دو!" اصغر کی امی کہ رہی تھیں۔

"میں خدا ہی کا قہر بن کر اُس درندے پر ٹوٹ پڑوں گا۔ آپ دیکھتی تو جایئے!" اصغر نے اُسی جوش سے کہا۔

"بیوقوفوں جیسی باتیں نہیں کیا کرتے —! چلو آؤ میرے ساتھ نیچے صفدر تمہیں کب سے بلا رہا ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل گئیں اور سعید صورت سوال کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

کچھ سوچ کر اُس نے ارادہ کیا۔ کہ خود اُٹھ کر کمروں کا جائزہ لے اور دیکھے کہ اصغر اور اس کی امی محض اس کی تسلی کے واسطے کہہ رہے ہیں یا سچ مچ اس کی جوہر اس گھر میں موجود ہے — اور یہ سوچ کر وہ اپنے بستر سے اُٹھا سلیپر پہنا اور کرسی کا سہارا لے کر کمرے کے وسط میں پہنچا تھا کہ عقب سے ایک گوش آشنا سی میٹھی آواز آئی۔

"ٹھہرو سعید! تم اُٹھ کر کہاں چلے —؟"

اس نے یک دم چونک کر پیچھے دیکھا — ہلکے گلابی رنگ کا قمیض

غرارہ اور دوپٹہ پہنے خود جوہر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ تھام کر واپس بستر تک لے آئی۔ وہی مسکراتا ہوا فرشتوں کا سا چہرہ وہ معصوم آنکھیں ۔

" جوہر ۔ !" اُس نے پیاسی نگاہوں سے اُس کے حسین سراپا کو سہم دیکھتے ہوئے زیرِ لب کہا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو جیسے اس منظر کو بھی وہ کوئی نظر فریب خواب سمجھ رہا ہو۔

" تم بیماری کے معاملہ میں سدا کے یونہی بد احتیاط آدمی ہو! بھلا کہاں جا رہے تھے بستر سے اُٹھ کر ؟"

وہ اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کی متحیر آنکھوں میں بغور جھانکتے ہوئے مسکرائی ۔

" تمہیں ڈھونڈنے جا رہا تھا جوہر ۔ !"

اُس نے زیرِ لب کہا اور اپنا سر اُس کے کندھے کے ساتھ ٹکاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا ۔

(۱۷)

فروری کے آغاز کی مسکراتی ہوئی، کھلی کھلی سی زرین دھوپ میں کرسیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں ایک میز بچھی تھی۔ جس پہ خشک وتر موسمی میوے پلیٹوں میں رکھے تھے۔ کرسیوں پہ سعید، اصغر، جوہرا اور ان کی امی سب بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد فواکہات کے لئے دھوپ میں آبیٹھے۔ ان کے پرمسرت چہرے تمازت آفتاب سے زیادہ جوشِ انبساط سے تمتمائے تھے۔

گوہر کی موت کی خلش موجود تھی۔ مگر جوہر کے مل جانے کی خوشی اُس رنج پر غالب آگئی۔ اصغر کی امی اپنی اس حسرت کے پورا ہونے پر کہ سعید جیسا نوجوان ان کا داماد بن سکتا بار بار خدا کا شکر بجالاتیں اور اس تمنا کے بر آنے پہ پھولی نہ سماتیں۔

اس وقت جوہر پھل کاٹ کر پلیٹوں میں رکھتی جا رہی تھی۔ اور سب ہنستے بولتے ہوئے کھا رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں گفتگو کا رخ "ماں جی" کی طرف پھر گیا۔ جسے اصغر اور خالہ جان انا کہہ کر ذکر کرتی تھیں مگر جوہرا اور سعید بدستور ماں جی کہتے تھے۔

بھی یہ بات نہ کھل سکی۔ کہ آخر وہ عورت کس مقصد کے لئے ان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے گئی تھی۔ شکر ہے کہ اس نے اتنا تو خوفِ خدا کیا کہ انہیں اچھی تعلیم دلوائی اچھے طریقہ سے پرورش کیا۔" اصغر نے ایک سرخ مالٹا چھیلتے ہوئے کہا۔

محض اچھے طریقہ ہی سے نہیں اس نے ہماری پرورش ناز و نعم میں کی ہمیں کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ وہ ہماری حقیقی ماں نہیں۔ ہم دونوں اُسے ماں اور ذاکر کو سگا بھائی سمجھتی تھیں۔ اگرچہ ہمیں اُس کی کریہہ شکل وصورت اور گھناؤنے اوصاف سے بے حد نفرت تھی مگر ہمیں اس کے لئے اسی شدت سے افسوس ہوتا تھا جیسے سگی بہنوں کو کسی اوباش اور بداخلاق بھائی کے لئے ہو سکتا ہے ہمیں ندامت اور شرمساری محسوس ہوتی تھی کہ ہم ایسے بھائی کی بہنیں ہیں۔"

جوہر سیب کی کاشیں بناتے ہوئے اب بھی متاسف اور آزردہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

"پھر تمہیں کب معلوم ہوا کہ وہ بدبخت انا تمہاری سگی ماں نہیں ہے؟" اس کی امی پوچھنے لگیں۔

"جب ذاکر نے گوہر کو تنگ کرنا شروع کیا تو ہم دونوں حیران ہوتیں کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ ایسی زشت حرکتیں اس نے اس وقت شروع کیں جس وقت ابو (ہم ذاکر کے باپ کو بھی اپنے والد ہی سمجھتے تھے) کسی کاروباری سلسلہ میں ایک سال کے واسطے جاپان گئے ہوئے تھے۔ ایک دن اُس کی نازیبا حرکت پر گوہر نے اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ اُس کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی اس نے انتقام کے طور پر گوہر کو بے حد مارا حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔

جوہر بیان کر رہی تھی اور اصغر مارے غیظ و غضب کے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

ستیاناس ہو اُس مردار کا!" اس کی امی ماں ممتا کے احساس سے کہہ اٹھیں

"اس کا ستیاناس میں کروں گا۔!" اصغر کچکچی لے کر بولا۔

"اچھا تو پھر — ؟ امی نے جوہر کی طرف اشتیاق سے دیکھتے ہوئے گفتگو جاری رکھنے کو کہا۔

ماں جی نے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے بلوایا اور جب میں نے واقعہ بتایا تو ذاکر پر بہت خفا ہوئیں۔ مگر وہ ان کی لعنت ملامت سے ذرا بھی شرمسار نہ ہوا بلکہ گرج گرج کر الٹا ان کے سر ہونے لگا۔ کہ وہ کیوں نہیں ہم دونوں کو بتا دیتیں کہ ہم اُس کی سگی بہنیں نہیں ہیں — چنانچہ جب گوہر کی طبیعت ذرا بحال ہوئی تو ماں جی نے ہم دونوں کو نہایت شفقت اور محبت سے پاس بٹھالیا اور بتایا کہ ہم انکی بیٹیاں نہیں بلکہ ان کی مرحوم بہن کی یتیم بچیاں ہیں۔ ہماری ماں کے (نصیب دشمناں) انتقال کے بعد مجھے اپنے دودھ پر پالا مگر گوہر نے کسی انا کا دودھ پیا اس جواز سے انہوں نے بھی عندیہ ظاہر کیا۔ کہ اگر گوہر چاہے تو ذاکر کی خواہش کے موجب اُس کی شادی ذاکر سے کر دی جائے۔ اس تجویز پر گوہر آپے سے باہر ہو گئی اور ماں جی کو بھی سخت سست کہہ ڈالا۔ انہیں دنوں مجھے پی۔ آئی اے کے محکمہ سے انٹرویو کے لئے بلایا گیا درخواستیں تو ہم دونوں نے بھیجی ہوئی تھیں مگر گوہر کی درخواست ہی ذاکر نے تلف کروا دی تھی۔ کہ وہ کہیں نہ جا سکے۔ یہ معلوم کر کے گوہر کا غصہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ وہ بے حد ضدی اور ہٹ کی پکی تھی اور جب کوئی اسکی حمیت کو للکارے تو انتہائی سرکشی ہو جایا کرتی تھی اس نے ماں جی کے لئے جینا محال کر دیا اور آخری اپنی بات منوا کر دم لیا انہوں نے ذاکر سے درپردہ اُسے شہر بھیج دیا اور مقامی کالج میں داخل کروا دیا۔ میں انٹرویو میں منتخب ہو کر ملازمت پر متعین کر دی گئی۔ کچھ عرصہ تو مجھے گوہر کے خطوط ملتے رہے وہ مجھے اپنے تمام کوائف سے آگاہ کرتی رہی میں اُسے امکان بھر تسلیاں دیتی رہی ذاکر نے اس کا خرچ بند کر دیا اُس نے مجھے لکھا تو میں نے بذاتِ خود اُسے اپنی تنخواہ کا نصف حصہ بھیجنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ شاید اس کی غیور اور نازک طبع پر بار ہوا کہ وہ بہن کی منت کش ہو۔ چنانچہ چند ماہ کے بعد اُس نے مجھے لکھا کہ وہ ذاکر کی وجہ سے کالج چھوڑ رہی ہے۔ سردست میں خرچ نہ بھیجوں وہ اپنے نئے پتہ سے آگاہ کرے گی تو پھر دیکھا جائے گا لیکن اس

نے نئے پتہ سے مجھے کبھی آگاہ نہ کیا۔ اس کے تین سال کے عرصہ کے بعد مجھے اس کا یہ آخری خط پہنچا جو میں نے آپ کو دکھایا۔"

سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ جوہر کے چہرے پر ایک دردناک کیفیت جھلک رہی تھی۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے طویل سانس لیا۔

"خط میں اُس نے ماں جی کو بلایا تھا یہ کیونکر ممکن ہوا کہ وہ نہ آئیں؟" سعید نے پوچھا۔

اس کے جواب میں جوہر نے ایک لمحہ بھر غور کیا، اُس کی طرف دیکھا پھر استفسار کے انداز سے امی اور اصغر کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ "کیا جواب دوں؟"

"کیا مضائقہ ہے۔ بتا دو اب —" امی نے زیر لب کہا۔

"جس وقت یہ خط پہنچا ڈاکٹر اور ماں جی ڈھاکہ گئے ہوئے تھے انہیں وہاں کم از کم دس روز رہنا تھا۔ اگر میں انہیں اطلاع کرتی تو وہ میرے آنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتے۔

چنانچہ میں نے مینجر جلیل سے کہہ کر کہ میں انہیں ڈھاکہ میں اس خط کی اطلاع کے ساتھ بھیج دوں گی سفر خرچ کے واسطے رقم حاصل اور جس قدر جلد ممکن ہوا یہاں پہنچی مگر افسوس کہ — گوہر نے میرے پہنچنے کا بھی انتظار نہ کیا۔"

وفورِ ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ باوجود انتہائی ضبط کے اُس کی آواز میں لرزش اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ چند منٹ مکمل خاموشی رہی۔

"کیا خیال ہے وہ لوگ آئیں گے یا نہیں؟ ایک مہینہ ہونے کو آیا اب تک انہیں پہنچنا تو چاہیے تھا۔" اصغر نے کہا۔

"آئیں گے ضرور — اُسی مقدمہ وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ پابندی ہو گئی ہو گی جو اب تک نہ پہنچ سکے۔" جوہر نے جواب دیا۔

"بڑی خوفناک عورت ہے یہ ماں جی بدبخت! بھلا اس قدر قہرناکی سے اس بدنصیب چھوکری کو پیٹا کہ جان سے مار ڈالا۔؟"

اصغر نے جیسے کسی سنے ہوئے واقعہ کے یاد آ جانے سے اچانک غضبناک

ہو کر کہا۔

"کون سی چھوکری کو مار ڈالا ماں جی نے ——؟ کہیں بیچاری بیشو کو تو نہیں!
اوہ اس کے متعلق تو میں پوچھنا ہی بھول گیا ——؟"

سعید نے اشتیاق سے یک دم کرسی پر سیدھے بیٹھتے ہوئے بغور جوہر کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے غمگین نگاہوں سے سعید کو دیکھا۔

"ہاں سعید! بیچاری بیشو —— مر گئی غریب۔" جوہر نے دلی دکھ کے ساتھ یہ لفظ کہے۔

"وہ کیسے ——؟" سعید کی نگاہوں میں بیشو کا وہ بھولا بھالا پر خلوص چہرہ ابھر آیا۔

تمہیں یاد ہے نا جس شام —— تم نگم سے روانہ ہوئے تو ذاکر کیسے خوفناک عزائم کے ساتھ شہر گیا ہوا تھا ——؟" وہ بیان کرنے لگی۔

ہاں ہاں —— پھر ——؟ سعید نہ چاہتا تھا کہ وہ توقف کرے۔

وہ رات گئے واپس آیا۔ اس کے ساتھ تین آدمی تھے۔ تینوں ہی اجنبی تھے بیشو نے دفتر میں جا کر انہیں دیکھا اور مجھے بتایا کہ وہ لوگ اس سے پہلے کبھی اس گھر میں نہیں آئے۔ ماں جی نے کئی مرتبہ تمہیں کھانے کے لئے بلانا چاہا لیکن میں نے انہیں ٹال دیا کہ تمہاری طبیعت اچھی نہیں اور تم جلدی سونے کے لئے چلے گئے ہو۔ اس پر وہ مطمئن ہو گئیں مگر ایک مرتبہ کسی بہانے سے اُٹھ کر تمہارے کمرے کا چکر لگا آئیں۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ جسے بیشو اندر سے بند کر کے بالکنی کے دریچہ سے ساتھ کے کمرے میں پھلانگ گئی تھی۔ بہت دیر سے ذاکر اور فخر کھانے کی میز پر آئے۔ میں ان لوگوں کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی اسی لئے ماں جی کے بار بار کہنے پر بھی یہی کہتی رہی کہ ذاکر کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔ چنانچہ فخر اور ذاکر میز پر بیٹھ گئے تو میں بھی پہنچ گئی۔ ذاکر اس موقعہ پر مجھے دیکھ کر کچھ جھنجھلایا اور کہنے لگا " آپ لوگ اپنے وقت پر کھا لیتے خواہ مخواہ میرے انتظار میں دیر کی۔"

"میں تو کہتی رہی مگر جوہر نہ مانی کہ اکٹھے ہی کھائیں گے۔" ماں جی نے کہا۔
"کوئی اور موقعہ ہوتا تو ذاکر خبر نہیں کس قدر خوشی کا اظہار کرتا مگر اس وقت تو بدمزہ ہو کر رہ گیا۔ مگر منہ سے کچھ کہتے نہ بنی۔ فخر نے دیر ہونے پر معذرت کی اور جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو ذاکر نے تہدید آمیز نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

"ان لوگوں کو دفتر ہی میں کھانا بھیج دیں ماں جی۔" وہ کہنے لگا۔
"کون لوگ ہیں؟ یہیں بلا لو — مجھے تو کوئی خاص بھوک نہیں ہے تھوڑا سا کسٹرڈ اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں۔" میں نے کہا۔
نہیں نہیں تم بیٹھو — وہ یہاں کیا آئیں گے۔ دیہاتی ڈیلر ہیں۔ کچھ سامان خریدنا چاہتے ہیں فیکٹری سے۔" ذاکر کہنے لگا۔
کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ فخر نے سعید کے متعلق پوچھا۔ تو ماں جی نے بتایا کہ وہ سونے کو جا چکا ہے اور ذاکر ہر بیجا مطمئن سا ہو کر کھانے میں مصروف رہا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تاکہ ان لوگوں کو کچھ شبہ نہ ہو کہ میں خلاف معمول کیوں دیر تک جاگنا چاہتی ہوں۔ وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر پھر دفتر میں چلے گئے سب نوکروں کو بھیج دیا گیا۔

خلاف معمول بیشو کو بھی اس رات ساڑھے گیارہ ہی بجے چھٹی مل گئی اور ماں جی نے پاؤں دبوانے کی ڈیوٹی سے معافی دے دی تو وہ اوپر کی بالکنی پر سے لٹک کر تمہارے کمرے کے روشن دان کی بیرونی کارنس پر لیٹ گئی اور جھک کر شیشے میں اندر کا منظر دیکھنے لگی۔ وہ سب دبے پاؤں باغیچہ کی طرف کے زینہ سے اوپر آئے اور تمہارے کمرے میں سب سے پہلے خود ذاکر داخل ہوا اور اندر سے دروازہ کھول دیا۔ اندھیرے میں اسے تینوں کے خوفناک چہرے نظر آئے مگر وہ تسلی کے ساتھ روشندان کی کارنس پر آدھی نیچے لٹکی ہوئی یہ منظر دیکھتی رہی۔ ان میں سے ایک نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ دوسرے نے بستر پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور ساتھ ہی چونک کر بولا۔
"ارے! بستر تو خالی پڑا ہے!"

باقی سب لوگ دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے جلدی سے بستر کے قریب آئے ذاکر نے لائٹ جلادی۔ مسہری گری ہوئی تھی بستر خالی تھا۔

" بھاگ گیا!" ذاکر کہنے لگا۔

" یوں کیوں نہیں کہتے کہ بھگا دیا گیا! تم لاکھ چالبازیاں کرو مجھ سے بازی نہیں لے جا سکتے ۔!" فخر نے تیز ہو کر ذاکر کے روبرو ڈٹتے ہوئے کہا۔ تو ذاکر احتجاج کرنے لگا کہ وہ بے قصور ہے اور فخر اس پر شبہ کر رہا ہے"۔

جوہر یہیں تک کہنے پائی تھی کہ درمیان میں اصغر بول اٹھا۔

" لیکن سعید کو راستے سے ہٹانا تو ذاکر کا مفاد تھا فخر اس سے کیوں الجھ پڑا؟"

جوہر کچھ پریشان سی ہو کر سعید کی طرف دیکھنے لگی وہ بے ساختہ مسکرا دیا اور اصغر سے زیر لب کچھ کہتے ہوئے بولا۔

" اپنے راستے کا کانٹا نکالتے ہوئے اس نے مدد کی خاطر، فخر سے سمجھوتہ کر لیا ہوگا۔ میری ہستی تو فرداً فرداً دونوں ہی کے مفاد میں حائل تھی ذاکر نے صرف فخر ہی کے مفاد کو عذر بنایا اور اس سے مدد لی"۔

" اچھا! اب میں سمجھا!" اصغر کہنے لگا۔

" بات تو پہلے ہی صاف اور واضح تھی۔ ان دنوں تمہاری عقل خبر نہیں کیوں کند ہوتی جا رہی ہے۔" امی نے ہنس کر کہا۔

" اچھا پھر ۔۔؟" سعید اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ کر جوہر کے منہ کو تک رہا تھا۔

" آخر بات بڑھ گئی۔" فخر زور زور سے بولنے اور ذاکر کو دھمکیاں دینے لگا کہ وہ بھی لالچ دے کر اس سے لاکھوں روپیہ وصول کر چکا ہے۔ ورنہ اس کی فیکٹری کبھی کی بک چکی ہوتی۔ اب وہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر کے اس سے سارا روپیہ اگلوا لے گا ۔۔۔ ذاکر نے اللہ کرایہ کے قاتلوں کو کچھ روپیہ دے کر رخصت کر دیا اور خود وہیں فخر کو سمجھانے بجھانے کے واسطے بٹھا لیا اور اور اس سے تصفیہ کرنا چاہا کہ وہ رات اسی جگہ ٹھہر جائے صبح وہ ۔۔۔ اس کا مطالبہ پورا کروا کے چھوڑے گا، میں ماں جی کے ساتھ ادھر آئی تو میں نے

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ذاکر کو کہتے ہوئے سنا کہ تم نے ذاکر کو غلط سمجھا دوست! دیکھ لینا صبح جوہر کو تمہارے ساتھ رخصت کردوں گا!"

"یہ کیا بات ہے ذاکر؟ وہ آدمی نیچے جاکر بتا رہے ہیں کہ سعید اپنے کمرے میں نہیں ہے ۔۔۔؟" ماں جی نے پوچھا تو ذاکر ان کی طرف گھور کر دیکھنے لگا۔

"میں کیا جانوں کیا بات ہے؟ جو لوگ گھر میں موجود تھے وہ جانتے ہوں گے مجھے کیا معلوم؟" وہ نتھنے پھلا کر بولا۔

"وہ تو خیر دیکھا جائے گا مگر فی الحال یہ بتاؤ کہ مجھے ان صاحب کے ساتھ رخصت کرنے کا تمہیں اختیار کس نے سونپا؟"

میں نے ماں جی کو ایک طرف ہٹا کر ذاکر کے روبرو کھڑے ہو کر پوچھا میرا سارا جسم مارے غصہ اور غضب کے کانپ رہا تھا۔ فخر کبھی میری طرف دیکھتا کبھی ذاکر کی طرف۔ ذاکر بھی دفور جوش سے دانتوں کو کچکچاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"میں خود صاحب اختیار ہوں! کس کو مجال ہے کہ میرے حکم سے منہ موڑے؟"

"مجھے ۔۔۔! میں دیکھوں گی کون مجھے مجبور کر کے حکم منواتا ہے!" میں نے زمین پر پیر پٹختے ہوئے کہا۔

"جوہر ۔۔۔! زبان سنبھالو ورنہ ۔۔۔!" وہ چیخا۔

"ورنہ کیا ہو گا ۔۔۔؟" میں نے چیلنج کیا۔

"جو گوہر کا حشر ہوا وہی تمہارا ہو گا سنا ۔۔۔؟"

وہ چنگھاڑ کر میری طرف لپکا مگر فخر درمیان میں حائل ہو گیا۔

"زبانی بات کرو!" اُس نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"زبانی بات سے یہ نہیں مانے گی!" وہ چیخا۔

"خیر سوچنے کی مہلت دو ۔۔۔! میں کل کسی وقت آجاؤں گا۔ وہ لوگ میرے منتظر بیٹھے ہیں نیچے ۔۔۔"

اتنا کہہ کر وہ قدم برداشتہ کمرے سے نکل گیا ۔۔۔ کچھ سوچ کر ذاکر بھی اُس

کے پیچھے لپکا۔

ماں جی کچھ دیر گومگو کے عالم میں کھڑی رہی پھر میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھ کر بولیں۔

" یہ اچھا نہ ہوا کہ سعید یوں چلا گیا۔ اب ذاکر قیامت کھڑی کر دے گا خیر میں اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اچھا ہو کہ فخر اُسے ساتھ ہی لیتا جائے تم جاؤ اپنے کمرے میں فی الحال اُس کے سامنے مت آؤ۔"

ماں جی بھی خاصی غضبناک ہو رہی تھیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ باہر نکل گئیں۔ جو کچھ پیش آیا وہ تو متوقع تھا۔ لیکن ذاکر کے وہ الفاظ میری توقع اور برداشت کے سراسر خلاف تھے۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ ایسی شدید غصہ کی کیفیت مجھ پر پہلے کبھی نہ گزری تھی میرا سر چکرانے لگا اور میں بے ہوش ہو گئی۔۔۔

بہت دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تو بشو بیچاری میرے پاس تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ سب لوگ معہ ذاکر چلے گئے ہیں اور ماں جی بھی اپنے کمرے میں جاکر سو گئی ہیں پھر اُس نے مجھے وہ سارا واقعہ سنایا جو اُس نے روشندان کی کارنس پر لیٹے ہوئے خود دیکھا اور سنا تھا۔ ان لوگوں کو شبہ کیا تھا یقین تھا۔ کہ سعید کے فرار میں ہم دونوں نے مدد دی ہے اور وہ بیچاری لڑکی ماں جی اور ذاکر کے غضب سے کانپ رہی تھی۔

" کسی صورت یہاں سے نکل چلنا چاہیئے مسّی! چھوٹے صاحب نے فخر سے لاکھوں روپیہ قرض لے رکھا تھا اور اس کے عوض آپ کی شادی اس سے کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس عذر پر کہ آپ سعید میاں کی موجودگی میں ہرگز رضامند نہ ہوں گی، ان کے قتل میں اس کی مدد حاصل کی۔ اب سارا منصوبہ خراب ہونے پر وہ ہم دونوں سے خبر نہیں کیا سلوک کریں "۔

بشو نے مجھے مجبور کرنا شروع کیا۔ کہ راتوں رات یہاں سے نکل چلنا چاہیئے۔ مگر میں نے اُس کی تجویز نہ مانی۔ کیونکہ میں جوش غضب میں فیصلہ کر چکی تھی کہ ذاکر کو رو در رو شکست دوں گی۔

اگلی صبح میرے اور غریب بشو کے لئے قیامت کی آمد سے کم نہ تھی۔ ذاکر نے

گھر آتے ہی حشر برپا کر دیا۔ بیشو کو ماں جی بلا کر الگ کمرے میں لے گئیں۔ اور ذاکر میرے درپے ہو گیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ بیشو کا کوئی قصور نہیں سعید کو فرار ہونے میں میں نے مدد دی تھی۔ لیکن وہ لوگ باور کرنے کو تیار نہ تھے کہ بیشو اس واقعہ سے لاعلم تھی اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے اس سازش کی خبر مالکوں کو کیوں نہیں پہنچائی۔ ذاکر ایک خوفناک اور مکروہ عفریت کی طرح پھنکار اور چنگھاڑ کر مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ فخر نے اس سے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا ورنہ مجھے توم کر دھر دیتا اور اس کا آخری فیصلہ تھا کہ مجھے ملازمت سے استعفیٰ دے کر فخر سے شادی کرنی ہوگی۔ وہ مجھ پر متواتر غضب ناک ہوتا اور دھمکیاں دیتا رہا، اتنے ہی میں ماں جی گھرائی ہوئی آئیں اور ذاکر کو پکارا۔ وہ صریحاً بدحواس ہو رہی تھیں۔ ذاکر کے پیچھے میں نے بھی نکلنا چاہا لیکن ذاکر نے مجھے بازو سے پکڑ کر غسل خانہ میں دھکیل دیا اور باہر سے چٹخنی چڑھا دی میں دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتی رہی مگر کوئی متوجہ نہ ہوا، آخر آدھ گھنٹہ بعد دروازہ خود ذاکر نے کھولا۔ وہ کچھ متوحش جیسا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر چپ چاپ کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"تمہاری نادانی سے ہم لوگوں پر بہت بڑی آفت آنے والی ہے۔ تمہیں پرورش کرنے اور اعلیٰ تعلیم دلوانے کا کیا یہی عوض ملنا تھا ہمیں کہ تم ہمارے واسطے تباہی کا موجب بن جاؤ؟ اب ان سب باتوں کا اگر کچھ تدارک ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ تم فخر سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔! بیشو کو زیادہ چوٹ آئی ہے میں اُسے ہسپتال لئے جا رہا ہوں - تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"بیشو کو زیادہ چوٹ آنے کا سن کر میں اس سے پہلے اٹھ کر دوڑنے کو آمادہ ہوئی مگر اس نے لپک کر میرا راستہ روک لیا اور مجھے گھسیٹتا ہوا میرے کمرے میں لے آیا اور مجھے اندر دھکیل کر دروازہ مقفل کر دیا۔

واقعہ یہ تھا کہ بیشو کے سر پر ماں جی نے اس زور سے لاٹھی ماری کہ اس کی کنپٹی پھٹ گئی اور وہ اُسی لمحہ ختم ہو گئی۔ ہسپتال لے جانے کے بہانے ذاکر اُسے

اپنی چھوٹی سی جیپ میں ڈال کر کہیں کھڈ یا سمندر میں پھینکنے کے واسطے لے جا رہا تھا۔ کہ ڈرائیو۔ پر ہی اُسے فخر مل گیا۔ راستہ تنگ تھا وہ اس کی کار کے عین مقابل ٹھہرنے پر مجبور ہو گیا۔

فخر کے شبہ پر کہ کپڑے میں لپٹی ہوئی کیا شے جیپ میں پڑی ہے۔ اس نے عذر کیا کہ گھر کی ملازمہ بیمار ہو گئی ہے اسے ہسپتال لے جا رہا ہے۔ مگر فخر کو شبہ ہوا کہ غالباً اس نے اپنے جوش غضب میں مجھے مار ڈالا ہے۔ اور جیپ میں میری لاش پڑی ہے۔ اس نے جبراً وہ چادر جس میں بیچاری بیشو کا بے جان جسم لپٹا ہوا تھا کھینچ کر اتار دی۔ ذاکر نے جب دیکھا کہ بیشو کے قتل کا ایک چشم دید گواہ پیدا ہو گیا تو اس نے اچانک پستول کے پے در پے تین فائر کر کے فخر کو بھی مار ڈالا اور اسی جیپ میں ڈال کر سمندر کے ایک ویران ساحل کی طرف لے گیا اور دونوں لاشوں کو سمندر میں پھینک دیا۔ پھر فخر کی گاڑی کو خود ڈرائیو کر کے اس کے گھر پہنچا آیا۔

اگلے روز نیل کنٹھ نے جسے ذاکر دانستہ شہر چھوڑ آیا تھا واپس آ کر بیشو کو گھر میں موجود نہ پایا تو بے حد گھبرایا — یہ شاید میں نے پہلے نہیں بتایا کہ ذاکر کے ڈرائیور نیل کنٹھ کو بیشو سے خاص دلچسپی تھی۔ ماں جی نے اس سے یہ نہیں کہا کہ بیشو کو ہسپتال بھیجا گیا ہے۔ بلکہ سب ملازموں میں یہ خبر پھیلا دی کہ بیشو سعید ہی کے ساتھ کہیں چلی گئی۔

یہ سن کر نیل کنٹھ تو دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے ملازمت سے جواب دے دیا اور بیشو کی تلاش میں شہر چلا گیا۔ مجھ پر سخت نگرانی رکھی جاتی تھی۔ لیکن میں نے موقعہ پا کر نیل کنٹھ کو مہترانی کی چھوکری کے ہاتھ ایک رقعہ بھجوایا جس میں لکھ دیا کہ سعید میرے سامنے اکیلا گیا۔ بیشو اگلی صبح تک گھر میں تھی۔ اس پر سعید کو فرار میں مدد دینے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس کی تحقیقات کرو کہاں ہے ؟"

تیسرے روز مچھیروں نے ساحل کے قریب ہی دو لاشیں ریت میں پھنسی ہوئی دیکھیں اور پولیس میں اطلاع کی ایک لاش کی تو فوراً شناخت ہو گئی کہ شہر کے مشہور کارخانہ دار فخر احمد کی تھی۔ دوسری کے متعلق پولیس نے اعلان کر دیا کہ

ایک مقتول کی لاش سول ہسپتال میں دو دن اور شناخت کے لئے رکھی جائے گی یہ اعلان سن کر نیل کنٹھ جو شہر میں بیشو کو دیوانہ وار ڈھونڈتا رہا تھا، ہسپتال پہنچا اور نعش کو شناخت کر لیا۔

ادھر ذاکر حیرت انگیز طور پر بدل گیا، میرے ساتھ اس کا برتاؤ پہلے سے بھی زیادہ مشفقانہ ہو گیا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی اور اپنی حماقت کا اعتراف کیا۔ کہ وہ مجھے فخر جیسے اوباش آدمی سے وابستہ کرنے کا خیال اپنے ذہن میں لایا۔

میں نے بارہا بیشو کے متعلق استفسار کیا اور اُسے دیکھنے کی خواہش کی مگر وہ مجھے ٹالتا رہا آخر اس وقوعہ کے پانچویں روز شام کے قریب پولیس کی جیپ بنگلے پر رکی اور سپاہیوں نے آناً فاناً بنگلے کو نرغہ میں لے لیا۔

پولیس انسپکٹر نے ذاکر کو ملازمہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ماں جی نے مزید حماقت کی کہ تڑپ کر باہر آگئیں اور کہا ملازمہ چھوکری کو ذاکر نے نہیں بلکہ خود انہوں نے مارا ہے۔

ذاکر لاکھ کہتا گیا۔ کہ وہ غلط کہتی ہیں۔ مگر کسی نے نہ سنا اور ماں جی کو بھی حراست میں لے لیا۔ اتنے میں فخر کا ملازم وہاں پہنچ گیا اور پولیس انسپکٹر کو بیان دیا کہ پانچ روز قبل اس کا آقا یہ کہہ کر ذاکر کے ہاں نگم جا رہا ہے کار میں آیا لیکن دوپہر کو ذاکر خود آ کر کار چھوڑ گیا اور کہا کہ فخر صاحب کسی فوری کام کی وجہ سے مغربی پاکستان روانہ ہو گئے ہیں۔ اب تو ذاکر پر فخر کے قتل کا بھی کیس بن گیا۔

پولیس ماں جی اور ذاکر دونوں کو لے گئی۔ ذاکر نے جاتے جاتے اپنے مینجر جلیل کو کچھ سمجھا دیا کہ اس نے ذاکر کی جیپ اور کار معہ میری گاڑی کے گیراج میں بند اور مقفل کر دیں۔ وہ بظاہر حفاظت کی غرض سے گھر میں رہنے لگا مگر مجھ پر پوری نگرانی رکھتا کہ میں نہ تو کہیں آ جا سکوں نہ اپنے طور پر کہیں خط بھیج سکوں۔

میں نے کئی خط سعید کو لکھے مگر وہ اس زلیل آدمی نے راستہ ہی میں روک

لئے۔ کوئی دو ہفتہ کے بعد ذاکر اور ماں جی ضمانت پر گھر آ گئے۔ اور جی میرے ساتھ بگڑی بگڑی رہنے لگیں وہ کہتیں کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے لیکن ذاکر بظاہر بہت اچھی طرح پیش آتا۔ مگر درحقیقت مجھے ہر وقت اپنی نگرانی میں رکھتا۔ ڈاک تک میں سے میرے خطوط واپس نکلوا لیتا جب کبھی باہر جاتا تو اس بدبخت جلیل مینجر کو میرے سر پر مسلط کر جاتا۔ میں نے چھٹی ختم ہونے پر واپس جانا چاہا تو کہنے لگا۔ ملازمت کی تمہیں اب کیا ضرورت ہے یہ اتنی جائداد کس کے لئے ہے مجھے تو اپنا حشر نظر ہی آ رہا تھا۔ پھر تمہیں کیوں ملازمت کی کوفت اٹھانے دوں۔

وہ دو مرتبہ کسی کاروباری سلسلہ میں مغربی پاکستان آیا تو مجھے اپنے ساتھ لایا بے شمار چیزیں اصرار کر کے میرے لئے خریدیں۔ ایک دفعہ کراچی کی ایک دکان پر اصغر بھیا نے مجھے نگار کہہ کر مخاطب کرنا چاہا لیکن میں ان کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ کیونکہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ گوہر نے اپنا نام تبدیل کر کے نگار رکھ لیا ہے"۔ دوسری دفعہ میں ذاکر کے ساتھ لاہور آئی تو ایک دکان پر میں نے سعید کو دیکھا مگر میں نہیں چاہتی تھی کہ ذاکر سے اس کا سامنا ہو اس واسطے اسے ٹالنے کا وعدہ کیا کہ میں اسے خود موقعہ پا کر ملنے آؤں گی۔ حالانکہ مجھے ذاکر ایک لمحہ بھر کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا اسے ملنے کیسے جا سکتی تھی جب یہ کار میں بیٹھ کر چلا گیا تو بھی میرے دل میں یہی خدشہ رہا کہ کہیں بازار میں پھر اس سے سامنا نہ ہو جائے —— میرے ڈرنے کی وجہ معقول تھی۔ میں نے اسے ایک دن ماں جی سے اکیلے میں باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سعید کو اپنے ہاتھ سے قتل کر لے تو پھر اس کے دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے گی اور اُسے پرواہ نہ ہو گی کہ اگلے ہی روز اسے پھانسی کی سزا مل جائے"۔

جوہر نے اپنا طویل بیان ختم کیا تو اس کے تینوں مخاطب جو بت بنے بیٹھے ہوئے سن رہے تھے حرکت میں آئے۔ اس کی امی" توبہ! توبہ! کر کے کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں۔

"بھئی حد ہے! کیسے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں!" اصغر نے لمبا سانس

لے کر کہا ۔

" تو اب کیا پوزیشن ہے قتل کے اُس کیس کی ؟" سعید نے پوچھا ۔

ماں جی کا نام تو اس عذر پر خارج کر دیا گیا کہ ماں بھی بیٹے کے خیال سے متاثر ہو کر الزام اپنے سر لینے کو غلط کہہ دیا۔ ذاکر پر دونوں الزام بدستور عائد ہیں مگر وہ ضمانت پر رہا ہے ۔

جب گوہر کا خط پہنچا تو ماں جی اور وہ دونوں شہر گئے ہوئے تھے ۔ میں بلا اطلاع چلی آئی تھی ممکن ہے وہ دونوں بھی میرے پیچھے آئیں ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سعید اس جگہ موجود ہے تو میں ہرگز پتہ دے کر نہ آتی ۔" جوہر نے تاسف کے لہجہ میں بات ختم کی ۔

" سعید کی اس جگہ موجودگی کا علم اُسے کیونکر ہو سکتا ہے وہ یہیں ڈاکٹر کے ہاں ٹھہرے گا ۔" جوہر کی امی کہنے لگیں ۔

" میں خود اُسے اپنی موجودگی سے ایسا خبردار کر دوں گا کہ وہ یاد ہی کرے گا" سعید کہنے لگا ۔

اور ہاں امی آپ کو ایک اور قصہ بھی معلوم ہے ۔ ؟" اصغر پوچھنے لگا ۔

" کیا قصہ ؟ الٰہی خیر ! ابھی کوئی اور قصہ بھی باقی ہے ۔ ؟" اس کی امی ہنس کر کہنے لگیں ۔

قصہ یہ ہے کہ یہ ذاکر بدبخت ہمارے سعید کا حق غصب کئے بیٹھا ہے اور اس کی بجائے خود مظفر رضا خان کا بیٹا بنا ہوا ہے ۔"

اس کے بعد اصغر نے ماں کو سعید کا مختصر واقعہ سنایا تو وہ حیران رہ گئیں اور دل ہی میں قیاس دوڑانے لگیں کہ دیکھئے اس عجیب و غریب قصہ کا انجام کیا ہوتا ہے اور ان سب کو ذاکر اور ماں جی کی آمد کا بڑے اشتیاق سے انتظار رہنے لگا ۔

(۱۸)

اور اسی عالم انتظار میں ایک دن جوہر کے نام ماں جی کا خط پہنچا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مقدمہ کی پیشی کے بعد ذاکر شہر ہی سے مغربی پاکستان کے لئے روانہ ہوگیا اور وہ اکیلی نگر پہنچیں تو حالات معلوم ہوئے۔ اب وہ ذاکر کی منتظر ہیں وہ خود آئے یا اپنی رہائش گاہ کا پتہ بھیجے تو اُسے سارے معاملہ سے آگاہ کر کے وہ جہاں تک ممکن ہوا جلد اس کے پاس پہنچیں گی اور گوہر کے متعلق فوراً لکھنے کی تاکید لکھی تھی۔ مگر مصلحتاً کوئی جواب نہ دیا گیا۔

تیسرے روز پھر ماں جی کا خط آیا کہ ذاکر لاہور میں ہے وہ پہلے لاہور پہنچیں گی اور پھر ذاکر کو ساتھ لے کر اس کے پاس پہنچ جائیں گی۔ چنانچہ اب تو شب و روز انتظار تھا۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اور ایک دن سب لوگ ناشتہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ صفدر نے آکر اطلاع دی کہ جن مہمان خاتون کا انتظار تھا وہ آگئی ہیں

تم نے اُن سے میرے متعلق کیا کہا صفدر؟ جوہر نے احتیاطاً پوچھا۔

" بس صرف اتنا ہی کہ میں آپ کو اطلاع کرتا ہوں۔ میں نے انہیں ڈرائینگ روم میں بٹھایا ہے ممی اور ڈیڈی ابھی مریضوں میں لگے ہوئے ہیں وہ اکیلی ہی بیٹھی

ہیں آپ چلیئے۔"

وہ کہنے لگا اور جوہر جلدی سے اُٹھ کر اس کے ساتھ نیچے آئی اماں جی بڑے اشتیاق سے ملیں اور گوہر کو پوچھا۔ چند لمحوں کے لئے تو جوہر کے دل کا زخم جیسے پھر سے ہرا ہو گیا۔ اور اس عورت کی صورت سے اُسے نفرت ہونے لگی، جس نے ان دونوں بہنوں کو حقیقی ماں کی آغوش سے چھین کر بے ٹھکانے کیا۔ وہ اسے گوہر کے دربدر ہو کر یوں کس مپرسی کی موت مرنے کی ذمہ دار تصور کرنے لگی اور لفظ نہ سوچ سکی۔ کہ کن لفظوں میں وہ اسے حقیقت سے آگاہ کرے۔

"کیا بات ہے جوہی! تم یوں چپ کیوں ہو گئیں؟ خدا کے واسطے بتاؤ میری گوہر اب کیسی ہے —؟ یا اللہ مجھ پر رحم کرنا! اتنی مدت کے بعد میں نے بچی کی سن گن پائی تو اب اُسے سلامتی سے دیکھوں۔"

وہ گڑگڑا کر دعا کرنے لگیں۔ صداقت تاثیر سے خالی نہیں ہوتی وہ چاہے کیسی ہی بُری اور بدسرشت عورت تھی مگر ان دونوں لڑکیوں کے لئے وہ ماں جیسی ممتا رکھتی تھی ان کی پرورش اس نے اپنی اولاد کی طرح تھی۔ اس کے کردار میں صداقت جوہر کے دل میں پیدا ہونے والی کدورت کو دھو گئی۔ اور وہ سب کچھ بھول کر اس وقت ایک مرتبہ پھر اُسے وہی غمگسار ہستی سمجھنے لگی جسے وہ ہمیشہ ماں خیال کرتی رہی تھی اور وہ پھوٹ پڑی۔

"ماں جی —" اور وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"

"جوہر! ہائے میں سمجھ گئی تو اب مجھے کیا سنانے والی ہے —! آہ اس سے تو بہتر تھا وہ ہمیں نہ ملتی۔"

وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہنے لگیں اور پھر جوہر نے پہلے اس کا خط انہیں دکھا! پھر یہاں پہنچ کر اُس کی موت کا وقوعہ پیش آنے کا سارا حال کہہ سنایا۔ مگر سعید اور اپنی حقیقی ماں اور بھائی سے ملاقات کا واقعہ حذف کر دیا۔ ماں جی یہ سانحہ سن کر کچھ دیر سکتہ کے عالم میں بیٹھی رہیں۔ خاصے وقفہ کے بعد بولیں۔

یہ گوہر نے ٹھیک ہی لکھا — اس ذاکرہ کی ضد نے یہ سب کچھ کیا —!

اور ابھی خبر نہیں اس کے ہاتھوں مجھے کیا کچھ دیکھنا ہے ۔ اب میں سمجھی کہ اس بدبخت کرنل سے اُسے کیوں دشمنی ہے !"

وہ اپنے خیال میں کھوئی ہوئی کہہ گئیں مگر فوراً ہی چونک کر جوہر کی طرف دیکھنے لگیں ۔

" ہاں ذاکر کو معلوم ہے کہ کرنل کیفی گوہر کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا ۔"

جوہر نے ماں جی کے کچھ بات بنانے سے پہلے کہہ دیا تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر چپ ہو رہیں ۔

اگر ایسا ہی تھا تو تم واپس چلی آتیں یہاں بیٹھ کر کیا کرنا تھا" وہ کہنے لگیں ۔

" خیال تھا کہ مبادا میں روانہ ہو جاؤں تو میرے پیچھے آپ یہاں پہنچیں بس آپ ہی کے انتظار میں ٹھہری رہی !" وہ کہنے لگی ۔

" اب ہمیں ذاکر کے پہنچتے ہی واپس چلنا چاہیئے ۔ میرا تو اس جگہ دل گھبرانے لگا ۔" وہ ادھر اُدھر دیکھ کر واقعی کچھ گھبراتے ہوئے بولیں ۔

" کب آرہا ہے ذاکر ؟" جوہر نے پوچھا ۔

" بس آج ہی کل میں ۔" ماں جی کہنے لگیں ۔ اتنے ہی میں لیڈی ڈاکٹر شمسہ اندر آئیں ۔ جوہر نے مناسب تعارف کروایا ۔ لیڈی ڈاکٹر شمسہ نے رسمی افسوس اور معذرت خواہی کرتے ہوئے تسلی دی ۔

ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ۔ ہماری بھی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے محترمہ ! ہم نے جرمن سپیشلسٹ کو مدد کے لئے بلوا لیا گیا مگر خدا کی مرضی میں کسے دخل ہے وہ اپنے شوہر سے زیادہ آپ کو اور جوہر کو یاد کرتی اور پکارتی رہی ۔ آپ صاحبوں کا ایڈریس معلوم نہ تھا کہ الگ اطلاع دی جاتی لیکن ان کے شوہر کو کئی ٹیلی گرام دیئے مگر انہوں نے پلٹ کر خبر نہ لی ۔۔؟"

ڈاکٹر شمسہ جیسے کچھ جاننے کے لئے تجسس اور توقع کے انداز سے کہنے لگی مگر وہ دونوں خاموش رہیں ۔

" اچھا تو جوہر ۔۔ ؟ ان کے ٹھہرنے کے واسطے کیا ۔" ڈاکٹر کچھ کہنے کو تھی کہ جوہر نے بات کاٹ کر کہا ۔

"ہاں ڈاکٹر! ان کے لئے ایک، دو روز ٹھہرنے کو ایک کمرہ دے دیجئے کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔" اور ساتھ ہی اُسے انگریزی میں کچھ سمجھایا۔

"اچھا — اچھا — کمرہ تیار ہے جب تک جی چاہے رہیں۔"

عجلت سے کہتے کہتے ڈاکٹر باہر چلی گئی اور اتنے ہی میں صفدر چائے کی ٹرے لئے ہوئے خود اندر آیا۔

"تم کہاں ٹھہری ہو؟ ڈاکٹر کے ہاں نہیں رہتیں کیا؟" ماں جی نے پوچھا۔

"نہیں — نیچے شور بہت ہوتا ہے۔ اوپر بھی ڈاکٹر کے کوئی عزیز ہی رہتے ہیں۔ مجھے انہوں نے اوپر ایک الگ کمرہ دلوا دیا ہے۔"

جوہر نے کہا اور اتنے ہی میں صفدر نے چائے پیش کی۔

"اس وقت تو چائے دے کر تم نے بہت بڑا کار ثواب کیا صفدر!" جوہر نے شفقت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لیجئے بھلا آپ کی ماں جی آئیں اور ہم چائے بھی نہ دیں؟ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟" صفدر نے مسکرا کر کہا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے ہوں گے؟" ماں جی پوچھنے لگیں

"جی ہاں" جوہر نے جواب دیا۔

"صفدر! انہیں کمرہ دکھا دینا۔ یہ اب ذرا آرام کریں میں ابھی آتی ہوں سمجھے" جوہر نے صفدر کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی ہاں۔ کمرہ میں ان کا سامان رکھوا دیا ہے تشریف لے چلئے ماں جی!" وہ کہنے لگا۔

"جیتے رہو بیٹا! بڑے ہی اچھے بچے ہو تم!" ماں جی اُس کے انداز سے متاثر ہو کر بولیں اور جوہر اوپر چلی گئی۔ سب اس کے منتظر بیٹھے تھے۔

"ذاکر نہیں آیا؟" سعید پوچھنے لگا۔

"نہیں شاید شام تک آئے یا پھر کل صبح" جوہر نے بتایا۔

"ہوں — ! اس کا مطلب ہے کہ اُسے قضا و قدر نے چند گھنٹے اور جینے کی مہلت دے دی؟" سعید ہونٹ چبا کر کہنے لگا۔

"کیا مطلب ؟" جوہر نے برہم ہوکر تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔
"مطلب تو واضح ہے — ! یہاں ملک الموت اس کا منتظر بیٹھا ہے اور وہ پہنچنے میں التوا کئے جا رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی گھڑیاں شمار کر کے ہی یہاں پہنچے گا۔"
سعید تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ جوہر کی طرف دیکھ کر بولا۔
"پھر تم نے بے معنی باتیں شروع کیں ؟" وہ خفگی سے بولی۔
"کہہ لینے دو تم کیوں چڑتی ہو ؟ اس بد طینت بھیڑیے کا ملک الموت تو میں ہوں" ہیں ! دیکھنا تو سہی اسے کس موت مارتا ہوں۔" اصغر سینے پہ ہاتھ مار کر کہنے لگا۔
"سنتی ہیں آپ امی ! ان دونوں نے مجھے کیسا تنگ کرنا شروع کیا ہے ؟"
جوہر نے احتجاج کیا تو امی اندر آئیں اور جوہر کی شکایت پر دونوں لڑکوں کو سرزنش کرنے لگیں۔
"تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ نہ صرف حکومتِ وقت کے قانون کو ہاتھ میں لو بلکہ قدرت کے قانون میں بھی مداخلت کرو — ؟ ظالم سے جو ہو سکا وہ کر گزرا اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ انتقام لینے والا، وہ مظلوم کی آہ سننے والا، جس نے بالادست کو ڈھیل دے رکھی کہ وہ خود ہی سنبھل جائے جو اس کی رسی دراز کرتا رہا کہ اس کی دسترس کی انتہا دیکھ لے، اب کیونکر اس سے نپٹتا اور بدلہ چکاتا ہے۔ مداخلت نہ کرو۔ وقت آنے دو اور خاموش تماشائی بن کر قدرت کا تماشہ دیکھو !"
امی نے کچھ ایسی عقیدت سے کہا۔ کہ سعید اور اصغر کو کچھ کہتے نہ بنی اور چپ ہو رہے جوہر نے فتح مندی کی نگاہ سے دونوں کی طرف دیکھا اور مسکرا دی —
"سچ پوچھو تو مجھے اب اس عورت پر بھی ترس محسوس ہو رہا ہے جس بدبخت نے مجھے اتنے برس رلایا، تڑپایا۔ میری بچیوں کو مجھ سے جدا کر کے میرا دل

جلایا۔ جس کے کارن میری ایک بچی دربدر ہوئی اور اپنی چھت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی بے کسی اور کس مپرسی کی موت مری۔ مگر اب میں نے اس ناہنجار عورت کو بچی کے لئے روتے اور تڑپتے سنا تو میرا دل اتنے ہی میں صاف ہو گیا کہ اس کے دل نے بھی ایک ماں کی طرح چوٹ کھائی ہے۔!" وہ کہہ رہی تھیں۔

"تو کیا آپ نے ماں جی کی باتیں سنیں؟"

جوہر نے خاصے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ خود دل سے چاہتی تھی کہ ذاکر کو نہیں تو کم از کم ماں جی کو کچھ رعایت ضرور مل جائے مگر وہ امی سے ان کی سفارش کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔

"ہاں! میں ساتھ کے کمرے میں پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی سب کچھ سن رہی تھی۔" امی نے کہا۔

"واقعی ترس آتا ہے بیچاری ماں جی پر۔ وہ سچ مچ ذاکر کے ہاتھوں مجبور ہیں!" موقعہ پا کر جوہر نے کہہ دیا۔

خیر ایسی بھی مجبور نہیں ہیں۔! جب وہ ہمارے ہاں سے تم دونوں کو لے گئیں کیا اُس وقت بھی ذاکر کے ہاتھوں مجبور تھیں؟"

اصغر نے کہا۔

"اور میرا سارا زیور جو کم از کم پچیس ہزار کا ہوگا دس ہزار نقد اور بے شمار قیمتی کپڑے۔ مگر خیر وہ تو اس نے تم دونوں کی اچھی امیرانہ پرورش کر کے گویا ادا کر دیا۔" اس کی امی کہہ رہی تھیں۔

"اونہہ! امی کو دیکھو ذرا۔! خود ہی اس کی ہر حرکت کا جواز اور تلافی بھی ڈھونڈ لیتی ہیں!" اصغر نے گردن جھٹک کر کہا۔

سعید اُن کی نیک دلی اور عفو پسند طبیعت کا اندازہ کر کے مسکرا رہا تھا۔

"میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں بیٹا! کیا کروں مجھ سے کسی خطاکار کی وہ شرمندگی دیکھی نہیں جاتی جو اپنی غلطی کے نشر ہونے پر اُسے محسوس ہوتی ہے

اللہ پاک سب کے حال پر رحم کرے ۔ وہ خود ستار عیوب ہے اور دوسروں کی خطاؤں پر چشم پوشی سے خوش ہوتا ہے ۔" وہ سرد آہ بھر کر چپ ہو گئیں ۔

اب اس کے لئے بھی کوئی جواز نکال چھوڑیئے تاکہ اپنے بیٹے کو صحیح وارث کی جگہ مظفر رضا خان کا بیٹا مشہور کئے رکھا چلیئے جب تک اس کا سراغ نہ ملا اتنا بھی قابل معافی سمجھ لیجئے لیکن جس وقت صحیح اور مستحق وارث منظر پر پہنچ گیا تو سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے انہوں نے اس پر ان گنت قاتلانہ حملے کیے اگر اتفاقیہ مدد حاصل نہ ہو جایا کرتی تو وہ اُسے زندہ نکلنے نہ دیتی ،وہ بیٹے کے ساتھ قتل عمد کی برابر کی شریک رہی ،میرے نزدیک تو ایسی عورت کسی رعایت کی مستحق نہیں آپ لوگ خبر نہیں کیسے دل گردے کی مخلوق ہیں ! "

یہ کہتے کہتے اصغر کی طبیعت میں خاصی تلخی پیدا ہو گئی ۔ بلکہ اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس وقت تو جوہر کو بھی وہ سب واقعات یکے بعد دیگرے یاد آ گئے جب ماں جی اور ذاکر سعید پر متواتر جان لیوا حربے آزماتے تھے اور غریب بلیشو اس کی نگہداشت کے لئے دن رات جاگتی اور ان حربوں کو ناکام بنانے پر مستعد رہتی تھی ۔ آخر کار اسی جرم کی پاداش میں اُس بدنصیب لڑکی نے اپنی جان گنوائی اور اس وقفہ میں سعید کے خیالات بھی کچھ اسی قسم کے تھے ۔ اس کی آواز پر جوہر اپنے خیالات سے چونکی ۔

میرے دل سے تو یہ افسوس کبھی نہ مٹے گا کہ بیچاری بلیشو غریب کی جان خواہ مخواہ گئی ۔ اس نے ایک غریب الوطن کی جان بچاتے ہوئے اپنی قربانی دے ڈالی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ لوگ اس درجہ سفاک اور خون آشام ہیں تو میں ہرگز اس طرح روپوش ہو کر نہ آتا بلکہ کھلے بندوں ان کا مقابلہ کرتا — !" سعید نے پرجوش لہجہ میں کہا ۔

" تم نے واقعی غلطی کی ، تمہیں چاہیئے تھا اس ریچھ کے بچے ذاکر کو گولی مار دیتے اور اپنی یونٹ میں واپس چلے جاتے کوئی تمہیں کچھ نہ کہہ سکتا ۔" اب اصغر نے جوش میں بھر کر کہا ۔

میں نے سوچا کیوں ناحق کسی سے الجھوں۔ اگر یہ دنیا کے بندے دولت کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں کہ اس کے حصول کے واسطے انسانی زندگی تک سے کھیل جانے پر آمادہ ہیں تو چھوڑو۔ اس ہڈی کو ان کتوں کے درمیان پھینک کر ایک طرف ہو جاؤ۔ عافیت اسی میں ہے۔ چنانچہ میں جوہر کے مشورہ پر چپ کر نکل آنے پر آمادہ ہو گیا۔" سعید بے حد سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔

اور مجھے بیٹو نے مجبور کیا، کہ تمہیں جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانے پر آمادہ کر دوں۔ خبر نہیں اس کی نیند کہاں اڑ گئی تھی۔ وہ بلا مبالغہ رات بھر کسی پرچھائیں کی طرح تمہارے کمرے کے گرد و پیش منڈلاتی اور ساتھ ہی ماں جی کی نقل و حرکت کی نگرانی رکھتی۔ وہ جب بھی تمہارے کھانے پینے کی کسی چیز میں کچھ ڈالتیں وہ ہر خطرہ مول لے کر اس چیز کو ضائع کر دیتی۔ تمہارے کمرے میں رکھے ہوئے پانی کو ہر رات تبدیل کرتی چاہے اُسے بالکونی سے چھلانگ کر ہی کیوں نہ جانا پڑتا۔"

جوہر افسوس ناک لہجہ میں کہہ رہی تھی۔ سعید کے چہرے پر رنج اور افسوس کا غبار سا چھا گیا۔ اصغر سگریٹ سلگا کر ٹہلتا ہوا صحن میں نکل گیا۔

بیچاری لڑکی ۔۔۔! بعض ہستیاں نظرتاً نیک الطبع ہوتی ہیں ورنہ کون کسی کے واسطے یوں کوفت اٹھاتا ہے ۔۔۔؟" سعید نے طویل سانس لے کر کہا تو جوہر معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر آزردگی سے مسکرا دی۔

"کیوں نہ یوں کہو کہ صرف محبت کرنے والی ہستیاں ہی ایسا عدیم المثال ایثار کر سکتی ہیں ۔۔۔!" وہ مسکرا کر کہنے لگی۔

"بے شک! مجھے اعتراف ہے! تم نے بھی میرے لئے کچھ کم ایثار نہیں کیا جوہر!"

سعید نے موقعہ پا کر اس کے کندھے پر جھکتے ہوئے شیریں لہجہ میں کہا اور اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"خیر میں نے تو جو کچھ کیا شاید تم سے زیادہ خود اپنی ذات کی خاطر کیا ـــ میں بیشو کی بات کر رہی تھی ـــ!" وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ـ

"تو بیشو کیا ـــ؟" وہ فقرہ پورا کرنے کو موزوں لفظ نہ پا کر جوہر کی طرف استفسار سے دیکھنے لگا ـ

"ہاں سعید ـــ! وہ بدنصیب لڑکی تمہیں چاہنے لگ گئی تھی ـــ!"

جوہر نے اس کے قریب جھک کر یوں احتیاط سے کہا جیسے ڈرتی ہو کہ کوئی سن نہ لے اور سعید حیرت زدہ سا اُس کے منہ کو تکتا رہ گیا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق سے کہہ رہی ہے مگر وہ واقعی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی ـ

"حیرت ہے!" خاصے توقف کے بعد سعید کہہ اُٹھا ـ جوہر نے بغور اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی ـ

"کوئی حیرت نہیں ـ کیا غریب کے سینے میں دل نہیں ہوتا کیا اُس کے کچھ اپنے احساسات اور جذبات نہیں ہوتے ؟ چاہے وہ بالادستوں کے روندنے اور کچلنے سے زخم کھا کھا کر اُس کے لاشعور کی گہرائیوں میں دفن ہو جائیں مگر یکسر مر تو نہیں جاتے ؟ بیشو کے دل میں بھی وہ کچلے ہوئے پائمال احساسات اور جذبات دفن تھے تم نے ہمدردی کا اظہار کیا ـ

اس کی ناچیز سی ہستی کو جسے ہمیشہ سے نظر انداز کیا جاتا تھا ـ توجہ کا مستحق سمجھا اس سے بات کرنے میں نرم لہجہ اختیار کیا جس کی وہ کبھی اونچے طبقہ کے فرد سے توقع ہی نہیں کر سکتی تھی ـ بس اتنے ہی میں وہ تمہاری پرستار بن گئی اور ایک بہت بلند اور بے لوث جذبۂ پرستاری کے ماتحت دل ہی دل میں تمہاری پرستش کرنے لگی ـــ پرستش جو محبت کے مدارج میں وہ اعلےٰ و ارفع مقام ہے جہاں پہنچ کر طالب کی اپنے مطلوب سے کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں رہتی ـ مطلوب ایک بلند و برتر دسترس سے بالاتر ناقابل حصول ہستی ہوتی ہے اور طالب اس مرحلہ پر طالب نہیں پرستار بن جاتا ہے ، اُسے شروع ہی

سے یقین ہوتا ہے کہ جس ہستی کو وہ چاہتا ہے اُسے پا نہ سکے گا لیکن اس یقین کے باوصف وہ اپنی توجہ کے مرکز کو بدل نہیں سکتا ۔

بشو کا ایثار بے غرض تھا۔ اس نے شہید محبت کا مرتبہ پایا۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو شاید ایسا نہ کر سکتی !"

یہ باتیں سن کر سعید دل گرفتہ اور پریشان سا ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں عجب قسم کی پشیمانی جھلکنے لگی۔ وہ اپنے نگم میں قیام کے زمانہ پر نظر ثانی کرنے لگا اور دل ہی دل میں سارے واقعات پر ایک ایک کر کے غور کیا۔ لیکن اُسے کہیں بھی کوئی ایسی جھلک نظر آئی جو بشو کے واسطے فریب نگاہ ثابت ہو سکتی ۔ بے شک وہ اس سے مہربانی اور نرمی سے پیش آتا تھا۔ اس کی خدمات پر اکثر اس کی تعریف کرتا اور شکریہ کے مناسب الفاظ کہہ دیتا۔ مگر کوئی ایسا ذو معنی لفظ کوئی ایسی غلط انداز نگاہ اُسے یاد نہ تھی جو اس سادہ لوح اور نیک فطرت لڑکی کو خوش فہمی میں مبتلا کر گئی ، کئی لمحے وہ اسی طرح گم سم بیٹھا رہا کہ اُسے جوہر کی آواز نے چونکا دیا۔

" تم کیوں پشیمان سے نظر آنے لگے ؟ اب اس خیال کو اپنے اوپر مسلط نہ کر لینا کہ تم اس کی موت کا باعث بنے تمہارا اس میں کیا قصور ؟" وہ اس کے کندھے پر جھک کر نرم آواز میں کہنے لگی ۔

" جوہر ! تمہیں یہ بات مجھ پر ظاہر ہی نہ کرنی تھی ۔ !" وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

یہ اُس ناقابل فراموش ایثار کی توہین تھی ۔ اس شہید محبت کی حق تلفی تھی اگر تمہیں آگاہ نہ کیا جاتا کہ تم پر اُس کا حق ہے کہ کسی فرصت کے لمحہ میں اُسے جذبۂ احسان مندی سے یاد کرو اور اس کی روح کی تسکین کے لئے دل سے دعا کرو ۔" وہ کہنے لگی ۔

اتنے ہی میں اصغر کی امی اندر آئیں ۔

" میں کھانا بھیج رہی ہوں۔ تم ساتھ چلی جاؤ۔ مگر کچھ عذر کر کے خود اُس کے ساتھ نہ کھانا . ہم لوگ تمہارا انتظار کر کے کھانا شروع کریں گے"

وہ کہہ رہی تھیں اور جوہر اثبات میں سر کو آہستہ سے جنبش دیتے ہوئے

اُٹھ گئی۔ مگر سعید کو مزید سوچ بچار کا موقعہ نہ ملا۔ کیونکہ اصغر بڑبڑاتا ہوا اندر چلا آیا۔

"امی اپنی کی طبیعت کچھ میری سمجھ میں تو آتی نہیں!" وہ کہنے لگا۔

میری سمجھ میں آگئی ہے —!" سعید نے مسکرا کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا —؟" وہ پوچھنے لگا۔

"یہ کہ وہ اس قانونِ فطرت کی قائل ہیں کہ ہر شخص اور ہر چیز اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ نیک منش شخص کسی مجبوری کے ماتحت بھی نیکی کے راستہ سے ہٹ کر بدی پر مائل نہیں ہو سکتا اور بد نہاد آدمی لاکھ احسان اور مروت کے باوجود اپنی آدم آزارانہ افتادِ طبع کو چھوڑ کر اچھائی اور نیکی اختیار نہیں کر سکتا۔ خیر اور شر دو متضاد قوتیں روزِ ازل سے برسرِ پیکار اور صرف کش مکش ہیں۔ مگر دونوں میں سے ایک بھی اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتی اور اپنی اپنی جگہ قائم دائم ہے۔ چنانچہ ہماری خالہ جان جانتی ہیں کہ

نیشِ عقرب نہ از پے کیں است
مقتضائے طبیعتش ایں است

اور اگر بُرا شخص بُرائی کرنا نہیں چھوڑ سکتا تو نیک خو کے لئے نیکی چھوڑ دینا کب زیبا ہے —؟" سعید نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"واہ وا! کیسی دانائی کی باتیں سنائی ہیں آج تم نے کہ بس دل خوش ہو گیا! اور یہ راز تو آج ہی کھلا کہ حضرت میں اتنی ڈھیروں لقمانیت بھری پڑی ہے صرف دیکھنے میں بدھو نظر آتے ہیں۔"

اصغر نے اس موضوع کو ختم کرنے کے لئے بظاہر قائل ہوتے ہوئے کہا۔ دونوں کے قہقہوں کی آوازیں سن کر ساتھ کے کمرے میں اصغر کی امی خود بخود مسکرانے لگیں۔"

(۱۹)

دوپہر کے کھانے کے بعد گھر کے چاروں افراد پر مشتمل ایک اہم اجلاس ہوا جس میں یہ معاملہ زیر غور تھا کہ اس عورت سے کیا سلوک روا رکھا جائے جس نے اس گھر کے خلاف بہت سنجیدہ مجرمانہ اقدام کیا تھا۔ جس نے اُسی گھر کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا تھا جس گھر کی وہ نمک خوار تھی۔ جس کے ہاتھوں ماں کی مامتا برسوں تڑپی تھی اور غیور باپ، اپنی ہر سعی جستجو کو آزمانے کے بعد مایوسی کی موت مر چکا تھا۔!

اس عورت یعنی آسیہ خانم انا یا دوسرے لفظوں میں ماں جی سے کیا سلوک روا رکھا جائے؟

اصغر اسے کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اُسے قانون کے سپرد کر دیا جائے۔ سعید نے مشورہ دیا کہ پولیس میں دینے سے معاملہ زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کر جائے گا۔ کئی ایسے نکتے جواب منظر عام پر نہیں آنے چاہئیں خود بخود سامنے آئیں گے چنانچہ اسی پر اکتفا کیا جائے کہ اُسے زبانی زجر و توبیخ کر کے چھوڑ دیا جائے اور آئندہ جوہر سے اس کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ مگر جوہر اور اُس کی امی کہتی تھیں کہ اس پر

حقیقت حال کو واضح کر دیا جائے اور باقی معاملہ کو خدا کے انصاف اور خود گنہگار کے ضمیر کی لعنت کے سپرد کر دیا جائے"

"تم کیا سوچتے ہو میرے روبرو آکر جو اس کی حالت ہو گی وہ دوزخ کی اذیت سے کیا کم ہو گی؟ انسان کے ضمیر کی ملامت اس کے لئے بہت بڑا روحانی عذاب ہے۔" اصغر کی امی کہنے لگیں۔

"اہو امی! آپ کی بھی کیا باتیں ہیں۔ بھئی ایسے لوگوں کا ضمیر مر جاتا ہے۔ جب ہی تو وہ ایسی آدم آزار حرکتیں کرتے ہیں!" اصغر بے بس ہو کر چیخا۔

"نہیں اصغر! ضمیر کبھی نہیں مرتا۔ الوہی نور کی یہ زندہ جاوید شعاع بد ترین انسان کے قلب میں بھی دم آخر تک موجود رہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے گناہوں کے سیاہ پردے میں وہ چھپ جائے۔ بار معصیت میں دب جائے، کور باطن انسان اس کی پکار سے کان بند کر لے مگر اس کا وجود تلف نہیں ہوتا۔"

وہ نہایت دلکش پیرائے میں سمجھا رہی تھیں کہ اصغر کسمسایا۔

"بھئی یہ فلسفہ اپنی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ظالم کو ظلم کی سزا ملنی چاہیے اور ضرور ملنی چاہیئے!" وہ میز پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

"اور ظالم کو خدا کے انصاف پر چھوڑ دینے کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے بھیا؟ کیا وہ قادر مطلق انسان سے بہتر انتقام نہیں لے سکتا۔" جوہر نے دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

"اوں۔ لے تو سکتا ہے لیکن۔"

وہ پیشانی پر بل ڈال کر کچھ کہنے کو تھا کہ ماں نے یک دم ٹوکا۔

"لے اب کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالنا۔ بات بات پر کفر بکنے لگتے ہو!" انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا۔

اچھا جی جیسا مناسب ہو کیجئے۔ ہمیں تو ایک ایک پیالی چائے دیدو

جوہر ہم کچھ نہیں جانتے۔" متفقہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اب اُسے خاور کی بجائے جوہر ہی کہا جائے اور وہ اپنی کرسی کی پشت پر گرتے ہوئے گویا ہار ماننے کے انداز میں بولا - جوہر ہنستی ہوئی اُٹھی -

" یہ نذرانہ تو کچھ زیادہ نہیں - ابھی لیجئے -

وہ صحن میں نکلی ہی تھی کہ سیڑھیوں کی طرف سے ماں جی آتی ہوئی دکھائی دیں اور جوہر کی نگاہوں میں متوقع منظر پھر گیا۔ لمحہ بھر کے لئے تو اس کے پاؤں وہیں جم گئے۔ یہ عورت کیسی ہی بدنہاد ہو لیکن جوہر کو اس نے پرورش کیا تھا اپنے جسم سے روحِ حیات پلا کر پالا تھا - اور جوہر کو اس سے فطرتاً ہمدردی اور اُنس تھا -

" ماں جی — آپ —؟" وہ گھبراہٹ میں فقرہ پورا نہ کر سکی -

" ہاں بیٹی! میں اکیلی بیٹھی بیٹھی گھبرا گئی اور سوچا کہ میں بھی تو ان لوگوں سے ملوں اور انہیں دیکھوں جن سے میری جوہر اس قدر مانوس ہو گئی کہ صبح سے ماں کے پاس دس منٹ کو بھی نہ بیٹھ سکی -"

وہ میٹھی آواز میں طنز کرتے ہوئے بولی اور جوہر کے چہرے پر گھبراہٹ کے نمایاں آثار دیکھ کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی -

" کہاں ہیں گھر والے —؟" جوہر کو خاموش پا کر اُس نے پوچھا -

" یہ رہے گھر والے —! آگے تشریف لے آیئے!"

اصغر نے کمرے کے اندر سے پکارا - اور مردانہ آواز پر ماں جی پُر معنی استفسار سے جوہر کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے کی طرف چلیں - جوہر بھی ان کے پیچھے پیچھے واپس آ گئی - ماں جی نے متجسس نگاہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تینوں افراد پر ڈالی - سامنے والی کرسی پر ایک وجیہہ اور خوبرو نوجوان بیٹھا تھا جس نے چبھتی ہوئی تیز نگاہوں سے اس کا خیر مقدم کیا اور خاموشی سے سے گھورتا رہا — — — — — — - - - اور ایک مرد اس کے مقابل کی کرسیوں پر دروازہ کی طرف پشت کئے بیٹھا تھا - قدرے تامل کے بعد دوسرے مرد نے مڑ کر دیکھا اور کہا -

"آیئے ماں جی! تشریف لے آیئے!"

"ارے ۔۔۔!" وہ یوں چونکی جیسے اس پر کسی نے اچانک گولی چلا دی ہو، اور اس کے قدم وہیں زمین نے پکڑ لیے۔ سعید ہنسنے لگا۔

"آپ مجھے دیکھ کر اس قدر حیرت زدہ ہو گئیں جیسے یہ کوئی ناممکن بات تھی کہ دوبارہ میرا اور آپ کا سامنا ہو؟"

"تمہارا اس جگہ موجود ہونا ایسی ناممکن بات نہیں ہاں جوہر کا اس بات کو مجھ سے چھپانا بے حد حیرت انگیز بات ہے ۔۔!" ماں جی نے تلخ آواز میں کہا۔

"دنیا میں بڑی بڑی ناممکن باتیں بھی اتفاقات زمانہ کے اُلٹ پھیر میں ممکن ہو جاتی ہیں آسیہ خانم! ابھی دیکھ لو۔ کہ تمہارے نزدیک یہ کیسی ناممکن بات ہوگی۔ کہ تم اپنے پیروں چل کر ایک دفعہ خود میرے گھر میں چلی آؤ ۔۔؟"

جوہر کی امی نے نیم رُخ پیچھے پھیرتے ہوئے کہا۔ تو خطا کار عورت پر جیسے بم پھٹا ۔

"بیگم صاحبہ؟ آہ میری قسمت!"

اُس نے سہارا کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے تو جوہر نے اُسے تھام لیا اور کشاں کشاں آگے لے آئی، سعید نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جایئے!"

مگر وہ بیٹھی نہیں بلکہ کسی پاشکستہ مجسمے کی طرح بیگم کے قدموں میں آن گری۔ ان کے دونوں پیر پکڑ لئے اور منت و زاری کرتے ہوئے سسکنے لگی۔

"مجھے معاف کر دیجئے بیگم! میری اچھی مالکہ مجھے معاف کر دیجئے!" اس نے رقت سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا اُٹھ کر سامنے بیٹھ جاؤ۔ میں معاف کرنے والی کون ہستی ہوں۔ اللہ کی بارگاہ میں معافی مانگو۔ انسان تو پھر کمزور دل مخلوق ہے معاف کر ہی دیتا ہے مگر انسان کے خلاف انسان کا ظلم وہ قادر مطلق معاف نہیں کرتا ۔!"

ان کی اپنی آواز جوشِ رقت سے لرزنے لگی تھی۔ جوہر اور سعید نے ماں جی کو بازو سے تھام کرسی پر بٹھا دیا وہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ اور کسی طرح بھی آنکھ اٹھا کر اس خاتون کی طرف نہ دیکھ سکتی تھی۔ جس کی ممتا کو اس نے برسوں تڑپایا تھا چند لمحے کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔

"میں شرمسار ہوں بیگم! کاش زمین شق ہو جائے اور میں اس میں سما جاؤں میں آپ کی گنہگار ہوں جیسے جی چاہے سزا دے لیجئے۔"

وہ ہاتھ جوڑے سرنگوں بیٹھی تھی۔ اور جوہر کی امی تذبذب میں پڑی تھی کہ کیا کہے نہ کہے۔ اصغر نے کچھ دیر ماں کے جواب کا انتظار کیا مگر جب انہیں یکسر خاموش پایا تو اس کا غصہ یک دم بھڑک اٹھا۔

"تم جیسے لوگوں کو تو زمین بھی نہیں نگل سکتی! تم زمین میں کیا سماؤ گی! تمہارے گناہ کی سزا تو یہ ہونی چاہیے کہ تمہیں سرِ راہ گاڑ کر سنگسار کر دیا جائے تاکہ ان بے جگرے درندوں کو جو جو معصوم بچوں کو ان کے والدین سے جدا کر کے انسانیت کے کلیجے میں چھری گھونپتے ہیں۔ چشم دید نظارہ دیکھ کر عبرت ہو ــ! تمہارے اس سفاکانہ فعل سے میں نے اپنے ماں باپ کو ان آنکھوں سے تڑپتا اور خون کے آنسو روتے دیکھا ہے۔ ابو اسی غم کی تاب نہ لا کر اپنی صحت کھو بیٹھے اور بیماری کے زمانہ میں ان کھوئی ہوئی بچیوں کو یاد کر کے رویا کرتے اور آخر یہی دکھ انہیں قبر تک لے گیا۔ جو کچھ تمہاری دست برد سے بچ رہا وہ بچیوں کی تلاش سالہا سال کی بے سود جستجو اور ابو کی بیماری پر صرف ہو گیا۔ میری تعلیم کے متعلق گھر والوں کے بڑے بڑے عزائم تمہارے ہی ہاتھوں خاک میں مل گئے گھر کی مالی حالت اس حد تک گر گئی کہ مجھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فوج میں جانا پڑا۔ اگر یہ ایک مکان ماموں کی مداخلت پر بچا لیا جاتا تو آج ہم کرایہ کے مکان میں دربدر ہوتے ــ سن لیا تم نے؟ یہ تمہارے کرتوت ایک کنبہ پر بیتی، ایک اور مظلوم تمہاری حرص و آز کا شکار موجود ہے ـــ!"

اس نے سعید کی طرف اشارہ کیا۔

"جو زیادتیاں تم نے اس غریب پر کیں انہیں خیال میں لاتے ہوئے تمہیں آزرد

کرنی چاہیئے کہ اگر تم زمین میں نہ سما سکو تو تمہارے سر پر آسمان ٹوٹ پڑے۔
ادھر دیکھو ۔!"

اس نے تحکم سے کہا اور ماں جی زرد سا چہرہ اس کی طرف پھرا کر بے ساختہ دیکھنے پر مجبور ہوئیں ۔

"پہچانتی ہو نا مگر کون ہے یہ ؟"

اس نے پھر سعید کی طرف انگشت شہادت کے ساتھ پر زور انداز سے اشارہ کیا ۔

"ہاں پہچانتی — ہوں —!" وہ لرزیدہ آواز میں بولی ۔

کیا پہچانتی ہو — ؟ کون ہے یہ ؟' اصغر نے چنگھاڑ کر پوچھا ۔

'سعید — سعید ہی تو ہے یہ —" وہ بے بسی سے بولی اور خائف سی نگاہیں چراتے ہوئے سعید کی طرف دیکھا ۔

مگر کون سعید — ؟" اس کے متعلق اور کیا معلوم ہے تمہیں ؟" اصغر نے جرح کے انداز سے کہا ۔

"جعفر میاں — جعفر رضا خاں کا بیٹا ہے !" وہ ہکلاتے ہوئے ۔ بولی ۔

"کیا تمہیں اپنے دل میں یقین ہے کہ یہ جعفر رضا خان کا بیٹا ہے "
سیاہ قلب عورت ! تیرے منہ سے اب بھی وہ بات نہیں نکل سکتی جو تیرے دل میں ہے ؟ حق بات کہنے سے تجھے اب بھی گریز ہے ؟"

اصغر نے گرجتے ہوئے کہا ۔ وہ اس وقت آپے سے باہر تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی بات کو قطع کر کے درمیان میں بولتا ۔ سب خاموش تھے ۔ ماں جی چپ تھی ۔

"میں کیا پوچھتا ہوں —!"

اصغر نے جوش غضب میں میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا ۔ تو وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگی ۔

اپنی جان بچانے کی خاطر اس نے تو کہہ دیا ۔ مگر اُسے جعفر رضا کا بیٹا جتنے

ہوئے تم نے اس کی جان پر پے در پے حملے کیوں کئے ؟"
اصغر نے غضب ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ سپٹپٹا سی گئی۔ ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ باہر عجلت سے چلتے ہوئے تیز تیز قدموں کی آہٹ ہوئی اور ساتھ ہی صفدر کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"میں حاضر ہو سکتا ہوں جوہر باجی !"
آؤ صفدر — چلے آؤ نا ! اجازت لینا کیا ضروری ہے ؟"
جوہر کی امی نے جواب دیا اور صفدر کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگا۔
" آپ صاحبوں نے ریڈیو دوپہر کی خبریں نہیں سنیں ؟"
" نہیں تو — کچھ ضروری گفتگو ہو رہی تھی ریڈیو نہیں لگایا "۔ جوہر کہنے لگی۔
" جی ہاں — ابھی ابھی ریڈیو میں یہ خبر براڈ کاسٹ ہوئی ہے کہ گزشتہ رات دس بجے کے قریب کرنل کیفی کو راولپنڈی میں ان کے بنگلہ میں پر کسی نے قتل کر ڈالا — !" صفدر نے سنایا۔ اور ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ کے ساتھ ماں جی بے ہوش ہو کر کرسی سے نیچے آ گریں۔
" یہ ذاکر کا کام ہے — !" یک دم جوہر کے منہ سے نکلا۔
" چلو ایک تو کیفر کردار کو پہنچا اب ذاکر خود باقی رہ گیا "۔ اصغر کہنے لگا۔
" وہ خود کیا — خاک باقی رہ گیا۔ قتل کے دو کیس پہلے بنے ہوئے ہیں تیسرا یہ ہو گیا۔
بدبخت اپنے کئے کی سزا پائے گا — دیکھ لیا ؟ میں نہیں کہتی تھی کہ خدا کے انصاف پہ چھوڑ دو ، یہ ہے اس کا انصاف کہ صیاد اپنے بچھائے ہوئے دام میں خود ہی پھنس جاتا ہے !"
جوہر کی امی کہہ رہی تھیں اور صفدر بیچارا حیران کھڑا تھا کہ یہ کیا قصہ

ہے؟ ماں جی ویسے ہی قالین پر اوندھی پڑی تھیں۔

"اس بدبخت کو تو اٹھا کر ادھر دیوان پر ڈالو اور ہوش دلانے کی کوشش کرد۔"

جوہر امی سے کہنے لگی۔

اسے عنقریب ایسا ہوش آئے گا کہ کیا یاد کرے گی!"

اصغر نے پرمعنی لہجہ میں کہا۔ صفدر اس کے طرزِ عمل پر حیران ہو رہا تھا کہ اصغر جیسا نیک دل اور ہمہ دوست آدمی یہ آج کیسا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے اس نے اور جوہر نے مل کر ماں جی کو اٹھایا اور قریب ہی دیوان پر لٹا دیا جوہر سرہانے بیٹھ کر کن پٹیاں سہلانے لگی۔

اُسے گھبراہٹ میں دیکھ کر سعید بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ صفدر سالٹ سنگھا رہا تھا۔ جوہر کی امی اسپرٹ ایمونیا ایرومارٹ کا محلول بنا کر اُس کے منہ میں ٹپکانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اتنے ہی میں صفدر کی ممی ڈاکٹر شمسہ بھی اوپر آئیں ریڈیو کی خبر کے موجب وہ مقتول کے عزیزوں سے اظہار ہمدردی کرنے آئی تھیں! مگر یہاں بھی ایک مریض کو موجود پایا۔ انہوں نے معائنہ کر کے سب کو ہدایت کی کہ مریضہ کو تنہا چھوڑ دیں۔ فوری صدمہ کے اثر سے وہ بیہوش ہے مگر جلد ہی ہوش میں آجائے گی۔ فکر کی بات نہیں۔

جوہر نے دوسرے کمرے میں بستر بچھا کر مریضہ کو وہاں منتقل کر دیا کوئی نصف گھنٹہ بعد وہ ہوش میں آگئی۔

"آہ۔!"

"ذاکر! ذاکر تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔!"

"اس نے ہوش میں آتے ہی نہایت دکھ بھری آواز میں کہا۔ اتنی دیر بیہوش رہنے پر بھی اصلی واقعہ اس کے ذہن سے مٹ نہ سکا تھا۔

اس نے گرد و پیش نگاہ ڈالی۔ جوہر اس کے سرہانے کرسی پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ گو اُسے ان لوگوں کی برائیوں سے نفرت تھی۔ ان کے خیالات سے اختلاف تھا۔ مگر پھر بھی اپنی اتنی عمر اس نے انہیں کے ساتھ گزاری تھی ان

سے اپنائیت کے تعلقات کو وہ اتنی آسانی سے توڑ نہیں سکتی تھی۔ ان کے بڑے اوصاف کے باوصف وہ اپنی ہمدردیوں کو ان سے یکسر منقطع نہیں کرسکتی تھی۔ ذاکر اس کا دودھ شریک بھائی تھا جسے خاصی عمر تک تو وہ سگا بھائی سمجھتی رہی تھی۔ وہ ہمیشہ نہیں تو عموماً اس سے اچھی طرح پیش آتا اور اس سے اُنس رکھتا تھا۔ اسی لئے اس کے خطرات کو بڑھتے اور مکافات عمل کے سخت گیر پھندے کو رفتہ رفتہ اس پر تنگ ہوتے محسوس کرکے اس کا دل دکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اُس سے اس لئے محفوظ رہے کہ اُسے ظلم کرنے کی مہلت مل جائے تو وہ اپنی برائیوں کی تلافی کرسکے وہ سعید اور اصغر کی طرح بلند اخلاق اور نیک خصال بن جائے وہ اسے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ مدارج پر دیکھنا چاہتی تھی ۔ مگر کسی بات کا ہونا نہ ہونا انسان کے چاہنے پر تو منحصر نہیں ۔ یہ مجبور محض ہستی اسی مرحلہ پر آن کر تو قضا وقدر کی قائل ہوتی ہے!

"جوہر — ! میری بچی!"

ماں جی نے آنکھیں بند کرکے جوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا تو بھی مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے — جوہر — ؟ میں قابل نفرت سہی مگر تم دونوں بہنوں کو میں نے اپنی دونوں آنکھوں کی پتلیاں سمجھا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ مگر یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ تم مجھ سے نفرت کرو۔"

وہ روندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی اور آنسو اُن کے زرد رخساروں پر بہتے چلے جارہے تھے۔ جوہر نے اپنے رومال سے ان کے آنسو خشک کئے اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماں جی! بھلا یہ بھی کبھی ہوسکتا ہے کہ میں آپ سے نفرت کروں، میرے دل میں آپ کا بدستور وہی مقام ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات کے ایسی سنگین صورت اختیار کرنے پر — مجھے روحانی صدمہ گزرا ہے۔"

"میں نے جو کچھ کیا ذاکر کے واسطے کیا۔ مگر ذاکر نے مجھے بُری طرح خوار کیا۔ اس نے کبھی میرے مشورہ پر عمل نہ کیا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ خود بھی تباہ ہوا اور مجھے بھی تباہ کیا۔"

وہ نحیف آواز میں کہہ رہی تھیں۔ جوہر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے خاموشی سے سن رہی تھی۔

"میں اب زندہ نہ رہوں گی جوہر — بیگم صاحبہ کو بلالو میں اُن سے کچھ کہنا چاہتی ہوں بلکہ اصغر میاں اور سعید کو بھی بلالو۔" وہ کہنے لگیں۔

"آپ ابھی خاموش لیٹی رہیں۔ زیادہ بولیں نہیں۔" جوہر نے کہا۔

"میں اب ٹھیک ہوں — اور ہاں تم نے سمجھ لیا نا؟ کہ کرنل کیفی کو کس نے قتل کیا —؟ یہ اُسی ناہنجار ذاکر کا کام ہے۔" وہ کہنے لگیں۔

"یہ کوئی ضروری تو نہیں — آپ ایسی بات کیوں سوچتی ہیں؟" جوہر نے دل میں ان کی بات کا یقین رکھتے ہوئے بھی وقتی تسلی دینے کو کہا۔

"میں بچہ تو نہیں کہ تم مجھے جھوٹی تسلی دے کر بہلانا چاہتی ہو حقیقت کو اپنے دل میں تم بھی جانتی ہو — خیر تم میرا کہا مانو اور سب کو یہاں بلالو — یا مجھے وہیں لے چلو میں اچھی ہوں اب تو —!"

اتنا کہہ کر وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جوہر کا ہاتھ پکڑ کر پھر اُسی کمرے میں آئیں جہاں سب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ استعجاب آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"ابھی لیٹی رہتیں کیوں اُٹھ آئیں؟" جوہر کی امی کہنے لگیں۔

"مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ میری بات سن لیجیے۔" ماں جی ہمت سے کہنے لگیں۔

جوہر نے انہیں ایک اونچی نشست کی آرام کرسی پر بٹھا دیا اور سب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق آنکھوں کو سکیڑ کر ایک نظر سب کو بغور دیکھا اور کہنے لگیں۔

ہر شخص کی ایک کمزوری ہوتی ہے بیگم صاحبہ! بدقسمتی سے میری کمزوری

حرصِ مال وزر ہے۔ یا تھی۔ خیر مجھے اعتراف ہے کہ میری یہ حرص مال وزر مجھے لے ڈوبی۔

شاید یہ برائی مجھ میں اس لئے پیدا ہو گئی تھی کہ میں غریب اور خدمت گار طبقہ سے تعلق رکھتے ہوئے ہر وقت دولت مندوں کے قرب میں رہنے اور ان کے طمطراق دیکھنے پر مجبور تھی۔ میری ماں مظفر رضا خاں اور جعفر رضا خان کی انا اور کھلائی تھی۔ ہم تینوں کا بچپن ایک جگہ کھیلتے گزرا۔ ان کے والد رضا علی خان بڑے رحمدل آدمی تھے۔ اور مجھے اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے مگر بیگم ایک مغرور امیر زادی تھی۔ جن کا نظریہ تھا کہ امیر اور غریب کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل ہونی چاہیے اور ایک کا دوسرے کی دنیا میں قدم رکھنا اتنی بڑی قانون شکنی ہے جسے معاشرہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا ہم لوگ بچپن کی حدود سے نکل کر عالم شباب میں قدم رکھ چکے تھے، ہمارے ذہنوں میں شعور بیدار ہو رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ مظفر میاں میری طرف ضرورت سے زیادہ توجہ کرتے ہیں اور اپنی حیثیت سے آنکھیں بند کر کے میں جوانی کے شعبدوں کے دکھائے ہوئے رنگین خواب دیکھنے لگی۔ اماں مجھے بے حد لاڈ پیار سے رکھتی۔ بیگم صاحبہ متواتر ٹوکتیں خفا ہوتیں۔ لیکن امی کی یہی کوشش ہوتی کہ مجھے اچھی طرح پرورش کریں۔ اچھا کھلائیں پہنائیں، پڑھنے لکھنے کا مجھے بے حد شوق تھا۔

میں نے ابتدائی کتابیں گھر کی مغلانی سے پڑھیں، اسی غرض سے اماں ہر وقت اس کی منت خوشامد اور خدمت خاطر میں مصروف رہتیں۔ اس کے بعد کبھی بیگم صاحبہ کو مہربان پاتی تو ان سے سبق لے لیتی۔ کبھی ان کی استانی انگریزی پڑھانے آتیں تو ان سے کچھ پوچھ لیتی۔ میرا اس قدر شوق دیکھ کر وہ مجھے باقاعدہ پڑھانے لگیں۔ یہاں تک جس سال جعفر نے میٹرک کا امتحان دیا تو میں نے بھی اس سے زیادہ نمبر پا کر یہ امتحان پاس کیا۔

بیگم بڑی باریک بین خاتون تھیں۔ ہماری بے حد احتیاط کے باوجود انہوں نے مظفر رضا خاں کا رویہ تاڑ لیا۔ مگر زبان پر نہ لائیں اور اماں کو مشورہ دیا کہ لڑکی کو

جلد از جلد بیاہ دو۔ میری شادی کی تیاریاں بذات خود بیگم صاحبہ نے کیں اپنے ہی کارخانہ کے ایک ملازم کے ساتھ رشتہ طے کر لیا۔ میرا دماغ بڑی بلندیوں پر اڑ رہا تھا۔ اپنے احمقانہ خوابوں کی یہ تعبیر پاکر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے کسی نے بارود کے تھیلے میں ڈال کر بھک سے فضا میں منتشر کر دیا ہو۔

میں یہ بتانا بھول گئی کہ کچھ عرصہ سے رضا علی خاں کی ایک بھانجی شگوفہ گھر میں رہنے لگی تھی اس کی ماں مر چکی تھی باپ نے اور شادی کر لی تو اسے خان صاحب اپنے پاس لے آئے وہ تعلیم یافتہ خوش شکل اور خوش خلق لڑکی تھی۔

گھر کے سب لوگ چند ہی دنوں میں اس کے گن گانے لگے خود مجھے بھی اس نے اپنی طرف مائل کر لیا۔ افسوس کہ میں اس کا اخلاق اور اعلیٰ صفات تو اپنا نہ سکی مگر ظاہری سج دھج میں اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ بیگم صاحبہ کو میری یہ باتیں ناگوار تھیں۔ شگوفہ کی ریس کرنے پر مجھے بارہا بلکہ دن میں کئی کئی مرتبہ ڈانٹا اور ذلیل کیا جاتا۔ میرا ذہن بلند پرواز تھا مگر اس کے مقابلہ میں میرے مادی حالات بہت کمتر اور گھٹیا تھے۔ میری طبیعت میں آہستہ آہستہ تلخی اور بغاوت پیدا ہونے لگی۔ یہاں تک کہ میں بیگم صاحبہ کے باربار سرزنش کرنے پر بھی اپنی من مانی کرنے لگی۔

ماں نے مجھے ٹوکنا شروع کیا تو میں اس کی گستاخی اور بے عزتی کرنے پر اتر آئی اور جب میری شادی طے پائی تو میں نے ماں کو کھری باتیں سنا ڈالیں کہ میں اس شخص کے ساتھ شادی ہرگز نہ کروں گی۔ ایک معمولی حیثیت کا ملازم میرے اخراجات پورے نہیں کر سکے گا۔ اس کی تنخواہ میں تو میرے سنگار کی چیزیں بھی پوری نہیں ہوں گی " اور یہ کہتے کہتے میری نگاہوں کے سامنے شگوفہ اور بڑی بیگم کی سنگار میزیں گھومنے لگیں۔ خوبصورت بوتلیں، حسین آرائشی سامان کے ڈبے میرے تصور میں ابھرنے لگے۔ قیمتی پوڈر یونڈر اور یوڈی کولون کی خوشبوؤں کا کیف میرے دماغ میں بھر گیا۔ میں یہ سب کچھ چاہتی تھی میں بھی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ میرے روبرو دوسری عورتیں یہ چیزیں استعمال کر

کے اپنی کشش حسن میں اضافہ کرتی تھیں۔ میں کیوں نہ کرتی؟ میرا نفس اس سمجھوتہ پر تیار نہ تھا کہ میں ایک غریب عورت کی، ایک خدمت گار کی یتیم بیٹی ہوں وہ تو یہی کہتا تھا کہ مجھے مطمئن کر دیا بغاوت کر دو۔!

ماں کے لعنت ملامت کرنے پر میں نے اُسے دھمکی دی کہ اگر وہ مجھے شادی کرنے پر مجبور کرے گی تو میں گھر سے چلی جاؤں گی۔ یہ سن کر ماں کو غصہ کے جنون میں جتا دیا کہ بیگم کو میرے سارے لچھن معلوم ہیں۔ جب ہی تو وہ مجھے جلدی سے جلدی بیاہ دینے پر اصرار کر رہی ہیں۔ پھر ماں نے مجھے طعنہ دیا کہ معمولی ملازم سے شادی نہ کرے گی تو کیا گھر کی مالکن بنے گی مجھے مظفر رضا خاں پر اتنا بھروسہ تھا کہ میں نے ماں کے روبرو رو تن کر کہہ دیا کہ ہاں اگر باپ کی بیٹی ہوں تو اس گھر کی مالکن ہی بن کر دکھاؤں گی!"

ان دنوں مظفر اور جعفر علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ میں نے مظفر رضا خاں کو لکھا مگر انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مختصر یہ کہ میری جبراً شادی کر دی گئی لیکن میں اپنے شوہر کے گھر رہنا پسند نہ کرتی اور بار بار ماں کے پاس چلی آتی۔

میری شادی کو چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ ہوائی حادثہ میں علی رضا خاں فوت ہو گئے اور ان کے دو ہی مہینے کے بعد شگوفہ کی مسہری میں آگ لگ گئی۔ وہ بیچاری بری طرح جلی اور ہزار کوشش پر بھی جانبر نہ ہو سکی۔

اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ شمع دان مسہری کے بہت قریب رکھے ہوئے پڑھ رہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے سو گئی۔ شاید ہوا سے مسہری کا کنارا شمع کی لپیٹ میں آ گیا اور آگ لگ گئی۔ اس لڑکی کے مرنے کا بیگم کو بہت صدمہ ہوا وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ اور ان پر اختلاج کے دورے پڑنے لگے۔

باپ کے بعد دونوں بھائی گھر چلے آئے اور کاروبار سنبھال لیا۔ میں جب کبھی آتی تو مظفر رضا خاں یوں بیگانہ وار نظر آتا جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی میرا دل ٹوٹ گیا اور میں نے ماں کے پاس نگھم جانا بہت کم کر دیا۔ میرا شوہر پختہ عمر کا آدمی تھا اور پھر دمہ کا مریض تھا مجھے اس سے شدید نفرت تھی اور سچ پوچھئے تو وہ اپنی جگہ مجھ سے نالاں تھا میں اپنی فرمائشوں کے مارے اس کا ناک میں دم کئے رہتی تھی۔

میں اسے عملی طور پر سزا دینا چاہتی تھی کہ اس نے اپنی ناداری اور بیماری کے باوجود دوسری شادی کرنے کی حماقت کیوں کی اور وہ اعتراف کرتا کہ یہ دوسری شادی اس کے حق میں دوسرا ضیق النفس ثابت ہوئی۔ وہ میری آرائش جمال کی چیزیں چھوڑ کر اگر انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنی کوئی دوائی لے آتا تو وہ چیخم دھاڑ مچاتی کہ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ جاتا اور میں اس کی دوائی کو دیوار سے پٹخ دیتی۔ اسی طرح لشتم پشتم دو سال گزر گئے۔ ادھر اس دو سال کے وقفہ میں نگم میں انقلاب عظیم آگیا۔ بڑی بیگم حرکت قلب بند ہونے سے فوت ہو گئیں۔ جعفر رضا خاں کاروبار کے سلسلہ میں انڈیمان چلا گیا۔ اور مظفر نے ایک نہایت چھوٹے گھرانے کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

جب اماں چند دن کی چھٹی گزارنے میرے گھر آئی تو ان سے یہ خبر پا کر میں حیران رہ گئی مگر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو سارا قصور بڑی بیگم کے سر تھوپا۔ کہ وہی غریب اور چھوٹے طبقہ سے نفرت کیا کرتی تھیں اور اب بیٹے نے ان کی جگہ پر گھر کی مالکن کسی لکھ پتی کی بیٹی کو نہیں غریب ہی کی بیٹی کو بنایا اور ماں کو خوب ہی تلخ سنائیں، کہ اگر اس نے مجھے اس جہنم میں نہ جھونک دیا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ مظفر رضا مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لیتا اور اب میرے دل میں ایک بھبھڑ سی دہکنے لگی۔ جس نے میرے لئے جینا محال کر دیا۔ میں حسد اور بے اطمینانی کے ہاتھوں ہر وقت آگ پر لوٹتی۔

خوش پوش اور خوشحال عورتوں کو دیکھتی تو میرا جگر کباب ہو جاتا کہ مجھے یہ سب کچھ کیوں حاصل نہیں، میں نے قضا و قدر کا کیا بگاڑا تھا۔ کہ مجھے ہر شے سے یوں محروم کر کے ایک جہنم کدے میں ایک دائم المریض کے ساتھ جکڑ دیا۔

پھر ایک دور ایسا آیا کہ میں گھر سے بھاگ جانے کے منصوبے سوچنے لگی مگر انہیں دنوں معلوم ہوا کہ میں امید سے ہوں۔ تو میرا جی جل کر کباب ہو گیا غریبی اور اس پر اولاد "کوڑھ پر کھاج!" یہاں آگے ہی کیا رکھا ہے کہ کہ اوپر سے ایک بدبخت بچہ بھی بھوکا مرنے کو آجائے گا۔

یوں ہی میں ہر وقت بڑبڑا کر اور جلی کٹی سنا کر اپنے بدنصیب شوہر کو اور بھی جلاتی، وہ دفتر سے واپس آکر تکیہ پر اوندھے منہ پڑا رہتا یا اکڑوں بیٹھا ہو نکتا رہتا اور میں اُسے ترش تلخ باتیں سنا کر ہمسائی کے ہاں جا بیٹھتی۔

بچے کی پیدائش سے چند ہفتے پہلے میں اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ پہلے تو بنگلے میں جا کر مظفر رضا کی بیوی کو دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہ ہوا مگر ایک دن وہ اماں کے اس عذر پر کہ اس حالت میں سب کے سامنے آنے پر شرماتی ہوں وہ خود مجھے دیکھنے چلی آئی۔ نہایت سادہ منش اور غریب طبع سی لڑکی تھی جس کے زرد چہرے پر دائمی اضمحلال برس رہا تھا جس کی خوبصورت آنکھوں میں ناکامی اور حسرت جھلک رہی تھی۔

میں حیران ہوئی کہ مظفر جیسے متمول آدمی کی بیگم بن کر اس لڑکی کے دل میں کون سی ایسی خلش باقی رہ گئی کہ جس نے اُسے مایوسی کی تصویر بنا دیا ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جعفر کی منسوبہ تھی۔ مگر اُسے کاروباری سلسلہ میں انڈیمان بھیج کر مظفر نے اس سے شادی کر لی۔ جعفر کو واپس آکر حقیقت معلوم ہوئی تو اس صدمہ کی تاب نہ لا کر وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور دماغی ہسپتال میں ایک مستقل مریض کی حیثیت سے مقیم تھا۔

مجھے اُس سوگوار جیسی مظلوم حسینہ سے خواہ مخواہ ہمدردی پیدا ہو گئی اور میں بنگلے میں اس کے پاس آنے جانے لگی۔ ذاکرہ دو دن کا تھا کہ بیگم کے ہاں بھی لڑکا پیدا ہوا۔ اور وہ خود مرتے مرتے بچی اماں کے سوا گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ میری دیکھ بھال اور بیگم کی نگرانی اُسی کے سپرد تھی۔ جس روز بچہ پیدا ہوا اس رات مجھے کھانا وغیرہ دے کر اماں پھر بیگم کو دیکھنے گئیں تو رات گئے عجب بدحواسی کے عالم میں واپس آئیں میں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی اس نے بتایا کہ کام سے فارغ ہو کر وہ بیگم کے کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے کے واسطے گئی تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے راستے جعفر کمرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر کھڑا ہوا غور سے دیکھتا رہا پھر بچے پر نگاہ پڑی تو اُسے اٹھا کر دریچہ کے راستے واپس باغیچہ میں اتر گیا۔

۔ اماں دہشت سے کانپ رہی تھی کہ آقا واپس آئے تو انہیں کیا جواب دے گی وہ یقیناً اس پر سختی کریں گے کہ اس نے نگرانی نہیں رکھی ۔ میرے ذہن میں ایک تجویز آئی مجھے یقین تھا کہ جعفر اپنے جوش جنون میں بھائی سے انتقام لینے کو اس بچے کو مار ڈالے گا۔ کیوں نہ میں اس کی جگہ اپنے لڑکے کو بیگم کے پہلو میں ڈال دوں ۔؟ اور میں نے ماں سے یہ عندیہ ظاہر کیا تو وہ کانپ اٹھیں ۔

ہزاروں لعنتیں پھٹکاریں اس نے مجھ پر برسا ڈالیں کہ میں کیسی ماں ہوں جو بچے کو یوں نوچ کر پھینکنا گوارا کر سکتی ہوں۔ مگر میرے دل میں اندھی مامتا کی وہ کسک نہ جاگ سکی۔ کہ ماں جو بھوکوں مرنے کے باوجود بچوں کو سینے سے لپٹائے رکھنے پر مجبور کرتی ہے مجھے اس بچے کا حشر نظر آ رہا تھا۔ بوڑھا اور دائم المریض باپ جو کماتا تھا اس سے کہیں زیادہ اس کے دوا درمن پر لگ جاتا تھا۔ میں زندگی کی ہر ضرورت کے لئے ترستی تھی بچے کا خرچ کون برداشت کرے گا۔ اس کا باپ کوئی دم کا مہمان تھا۔ آج سانس پورے ہو جائیں تو یہ بچہ ایک مستقل زنجیر بن کر میرے پیروں میں پڑ جائے گا۔

میں چپ چاپ لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ اماں بڑبڑاتے اور لعنت ملامت کرتے کرتے سو گئیں۔ دن بھر ٹوٹ کر مشقت کرتی تھی اور رات کو اس بڑھاپے کے باوجود غفلت کی نیند سوتی تھی ۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ صبح سے پہلے جاگ نہیں سکتی تو میں چپکے سے اٹھی بچے کو ایک تولیہ میں لپٹا اور دبے پاؤں بنگلہ کی طرف چلی، خوش قسمتی سے کسی سے میرا سامنا نہ ہوا سب ملازم اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے ۔ میں نے چپکے سے بچے کو بیگم کے پہلو میں لٹا دیا اور اسی طرح دبے پاؤں واپس چلی آئی اور مزے سے بے فکر ہو کر سو گئی جیسے منوں بوجھ کسی نے میرے سر سے اتار کر رکھ دیا ہو ۔ صبح اماں مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھیں۔ میں جاگی تو اس نے متوحش آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بچے کے متعلق پوچھا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی ۔ اماں اس مفلسی اور قلاشی کے وارث لڑکے کو یوں اہمیت دے رہی تھی جیسے کسی سلطنت کا ولی عہد

کھو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا وہ تو رات ہی مر گیا تھا میں جا کر اُسے گاڑ بھی آئی اس پر اماں نے مجھے دو ہتھڑوں سے کوٹ ڈالا، بے شمار گالیاں اور بد دعائیں دیں۔ مگر میں اپنی جگہ مطمئن اور پر سکون تھی۔ میں نے اپنے بچے کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا کہ مجھے افسوس اور تاسف ہوتا۔ میں نے تو اس کے تاریک مستقبل کو روشن کر دیا تھا۔ میں نے اُسے ناداری کے پالنے سے اُٹھا کر ناز و نعم، جاہ و حشم کے گہوارے میں ڈال دیا تھا۔ اور اب اعلےٰ تعلیم پائے گا۔ زندگی کی دردناک احتیاج اُسے کبھی نہ ستا سکے گی۔ مگر میری ماں ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی بنگلے کی طرف دوڑی جیسے بیگم کی آغوش سے بچے کو چھین لینے کا پورا عزم لے کر گئی ہو۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ بیگم اپنے پلنگ پر بیٹھی ہوئی دودھ پلا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میری چھاتیوں میں دودھ کے سوتے سرسرانے لگے۔ آخر میں ماں جو تھی! بیگم نے نگاہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ اماں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں اسے پیچھے دھکیل کر بیگم کے پلنگ کے قریب آئی اور اسے مبارکباد دی وہ میرے اتنی جلدی بستر سے اُٹھ آنے پر خفا ہونے لگیں اور بچے کو پوچھا۔ ماں پھر کچھ کہنے لگی میں جھٹ سے کہہ دیا کہ" وہ تو رات ہی مر گیا تھا ۔!" اور بیگم مجھے یوں مطمئن دیکھ کر ہونٹ کاٹ کر رہ گئیں ——— اماں چپ کی چپ ہو گئی!

اب میں ہر وقت بیگم کے پاس رہنے لگی۔ وہ بچے کو بے حد پیار کرتی اگرچہ بے حد سیدھی صورت شکل کا تھا مگر اُسے دیکھتے ہی ان کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آجاتی اور میں دل ہی دل میں ہنستی کہ الٰہی! یہ روائتی ممتا کیا چیز ہے؟ محض ایک دل بہلاوا؟ صرف ایک خود فریبی!"

انہیں دنوں میری نظر سے ایک اشتہار گزرا کہ ایک شیر خوار بچے کے واسطے انا کی ضرورت ہے جو اس کی رضاعی ماں کے فرائض انجام دے سکے تنخواہ اور شرائط معقول تھیں گھرانا اچھا متمول تھا۔ ماں کو کام میں مصروف پا کر میں اپنے گھر جانے کے بہانہ سے اس گاڑی میں بیٹھ گئی جسے صبح شہر سودا سلف لینے کے لئے ملازم لے کر جاتا تھا۔ اور اس طرح میں آپ کے ہاں پہنچ گئی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب اپنی جوہر کا دودھ چھڑا دیا تو میں چھٹی لے کر کبھی کبھی گھر جایا کرتی تھی۔ پہلی بار جو دہیں گئی تو معلوم ہوا کہ میرا شوہر فوت ہو گیا ہے۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ میں ملازمت چھوڑ کر آجاؤں مگر مجھے ان بچوں سے بے حد محبت تھی میں انہیں چھوڑ کر نہیں سکتی تھی۔

اتنے ہی میں مظفر رضا کی بیگم بھی فوت ہو گئی۔ اور ذاکر کی پرورش کا بار بھی اماں پر آن پڑا۔ میں جب بھی گھر جاتی وہ مجھے بے حد مجبور کرتی کہ واپس آکر اپنے بچے کی نگرانی کروں۔ مگر مجھے ان بچیوں کی مفارقت گوارا نہ تھی۔ آخر ایک دفعہ جب آپ لوگ دورہ پر تھے مجھے مظفر رضا کا خط ملا کہ اماں بیمار ہے امید نہیں کہ بچ سکے۔ مجھے جلدی پہنچنا چاہیے اب میں نے یہی تدبیر سوچی کہ بچیوں کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں اور باقی چیزوں کے متعلق بھی میں نے خیال کیا کہ طوفان اور سیلاب کے باعث غنڈہ گردی ہو رہی ہے لوٹ مچ رہی ہے۔ میں چھوڑ جاؤں گی تو لوگ لے جائیں گے اور جب ایک مرتبہ اتنی مالیت کا زیور اور نقد میرے قبضہ میں آگیا تو اپنی بد عادت سے مجبور ہو کر اسے واپس کرنے کا حوصلہ نہ پڑا

مگر بیگم صاحبہ خدا شاہد ہے کہ میں نے آپ کی بچیوں پر اس سے زیادہ ہی صرف کیا ہوگا۔ اور زیور تو ان کی امانت اب بھی بنک میں پڑا ہے خیال تھا کہ ان کی شادیوں پر دوں گی۔ اللہ کرے جوہر کے نصیب میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہو۔ مصلحتاً ان کے نام بدل دیئے اور بچیوں کو لئے میں پہنچی تو سب پر یہی ظاہر کیا کہ یہ میری نند کی بیٹیاں ہیں۔ ان کے والدین (میرے منہ میں خاک) طوفان اور سیلاب میں حادثہ کی نذر ہو گئے۔ مظفر رضا خاں بچیوں کو بے حد پیار کرنے لگے اور ان کی کفالت کا ذمہ لیا۔ ذاکر بھی اچھا سیانا ہو گیا تھا۔ تینوں کو اکٹھا سکول داخل کروا دیا گیا۔ اسی سال اماں فوت ہو گئیں اور دنیا میں میرا اس بچے کے سوا کوئی نہ رہا اور اسے بھی میں بیگانہ کر چکی تھی۔ مظفر رضا اسے اپنا ہی لڑکا خیال کرتا تھا دنیا میں میرے سوا کسی فرد کو حقیقت والدین معلوم نہ تھی۔ ذاکر سے اس درجہ محبت رکھنے پر مظفر رضا مطمئن تھے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے تجویز پیش کی کہ یہ بچے ابھی چھوٹے ہیں انہیں یہی کہا جائے کہ ہم دونوں ان

کے حقیقی والدین ہیں اور نکاح کا پیغام دیا۔ میری تو یہ دیرینہ آرزو تھی کہ میں "نگم" کی مالکہ بنوں چنانچہ ہم نے نکاح کر لیا مگر مجھے اس گھر کی مالک و مختار دیکھنے کے لئے میری ماں زندہ نہ تھی نہ اپنی شکست کا مشاہدہ کرنے کو مظفر کی مغرور اور خود پسند ماں موجود تھی جو دیکھ سکتی۔ دولت اور امیرانہ مدارج کسی کا ورثہ نہیں۔ بنانا اور مٹانا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے جب اُس کا مقرر کیا ہوا وقت آن پہنچتا ہے تو سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔ اتفاقات ایسی صورت میں رونما ہوتے ہیں کہ واقعات آپ سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں ان کی سیلابی روانی کو کوئی انسانی ہاتھ روک کے تو نہیں روک سکتا اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں اپنی حریص طبیعت پر قابو پا کر سعید کا حق تسلیم کر لیتی۔

پھر شاید مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر اپنے انجام تک پہنچنے کے لئے میں پہلے ہی زمین ہموار کر چکی تھی ذاکر کو میں نے اتنا خود سر، اس قدر سرکش بنا دیا تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اسے میں حقیقت سے آگاہ کر چکی تھی۔

لیکن وہ فطرتاً ضدی اور ہٹیلا تھا۔ اگر میں کہتی بھی تو وہ اپنے مقام سے جو بھر بھی ہٹنے کو آمادہ نہ ہو سکتا اور میں اس کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اُسے اپنی آغوش سے نکال پھینکتے وقت جس اندھی مامتا کی میں قائل نہیں تھی وہی مامتا اب مجھ پر بھوت بن کر سوار تھی اور اس سرکش بھوت کی نہ آنکھیں تھیں نہ کان۔

میں اس سرکش بیٹے کے ہاتھوں میں ناچنے والی ایک بے حس کٹھ پتلی بن گئی جسے وہ جس تال چاہتا نچاتا۔ مگر ظالم کے ظلم کی بھی ایک انتہا ہے ہم دونوں ماں بیٹا اپنے انجام تک آپہنچے اور ہمارا یہ انجام فیاض قدرت کا انتقام ہے!"

اس طویل تقریر کے بعد اس نے اپنی کرنجی آنکھوں کو بدستور سکیڑ کر ایک غائر نگاہ سب پر ڈالی۔ اُن نیک دل لوگوں کے چہرے اُداس اور پژمردہ تھے۔ نیک نفس آدمی دشمن کے دکھ پر بھی رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اُسے ایک گونہ تعجب ہوا۔ اور پھر اُس نے کرسی کی پشت پر گرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں وہ دیر تک آنکھیں موندھے ہوئے کسی کے کچھ کہنے کی منتظر رہی مگر اب تو

اصغر بھی خاموش تھا اور اس بد نصیب عورت کے لئے رنجیدہ سا ہو گیا تھا جس پر قضائے ربی جیسے کہنہ نخچیر گیر کا حلقۂ دام ہر ساعت تنگ تر ہوا جا رہا تھا۔

(۲۰)

اگلے دن وہ سب سہ پہر کی چائے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ نیچے ڈاکٹر کے ہاں ذاکر کے پہنچنے کی اطلاع ملی، صفدر شاید موجود نہ تھا کہ ملازم چھوکرا آیا اور ذاکر کا ویزٹنگ کارڈ پیش کیا۔

جی وہ نیچے بیٹھے ہیں۔! لڑکا یوں ہراساں اور بدحواس تھا جیسے کہیں یہ بھوت دیکھ پایا ہو۔ سعید کو ایسے مکدر ماحول میں بھی ہنسی آنے لگی۔ مگر اس نے ضبط کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ جوہر نے مشورہ کے لئے ماں کی طرف دیکھا وہ جواب میں اصغر کی طرف دیکھنے لگیں۔

سعید کا اس کے روبرو ہونا مناسب نہیں۔ للّٰہ! سعید بیٹا!

" میری حالت پر رحم کرتے ہوئے مان جاؤ، تم اندر کے کمرے میں چلے جاؤ۔ صرف میں جوہر اس کے سامنے ہوں — اور یہیں بلوا لیا جائے تو اچھا ہے ورنہ ہماری گفتگو سن کر ڈاکٹر کے ہاں کے لوگ کیا کہیں گے "

اصغر نے لڑکے سے کہا کہ مہمان کو اوپر لے آئے۔ اور وہ حیرت زدہ سا ایک ایک کا منہ تکتا ہوا واپس چلا گیا۔ اصغر کی امی، ماں جی کی التجا پر اصغر اور سعید کو لے کر پس پردہ کھڑی ہو گئیں۔ اتنے ہی میں ذاکر داخل ہوا ——

تار جیسا قد لحیم و شحیم جسم بعینہ کسی بن مانس کا چہرہ، گہری سانولی اور تمتماتی ہوئی سی رنگت۔ گھٹنوں سے نیچے پہنچتے ہوئے لمبے لمبے بازو ابھرے ہوئے چوڑے چوڑے شانے۔ اس عجیب ہئیت کے آدمی کو دیکھ کر اصغر کی امی کو تو جھرجھری سی آگئی۔

"خدا کی پناہ! کیسے لوگوں میں جا پھنسیں بیچاری میری لڑکیاں!" وہ زیر لب کہنے لگیں۔ اصغر اور سعید ان کے پس پشت کھڑے تھے۔

"جوہی — کہاں ہے گوہر —؟ کیسی ہے اب وہ؟"

اس نے کمرے میں دائیں بائیں متلاشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جوہر سے پوچھا جو اُسے دیکھتے ہی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے استفسار پر وہ ماں جی کی طرف دیکھنے لگی۔ کہ کیا جواب دے۔

"بہت اچھی —!" ماں جی نے اپنی کرنجی آنکھوں کو پورا کھول کر اُس کی طرف قہرناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ —؟" ذاکر نے ان کے رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

جہاں اب تمہارے ناپاک ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اُسے تو تیرے جیسے بدقماش اور ناہنجار آدمی سے خدا نے محفوظ کر لیا۔ اب میں باقی ہوں جسے تیرے ہاتھوں دکھ سہتے یہ دن آگئے —!" وہ رقت بھری آواز میں چلا کر کہنے لگیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں ماں —؟ سیدھی طرح بات کرو مجھ سے!

وہ اپنے آپ کو کرسی پر جھٹکتے ہوئے چیخا۔ اور ساتھ ہی جوہر کی طرف مخاطب ہوا۔

"کیا بات ہے جوہر؟ تم چپ کیوں ہو؟ گوہر کہاں ہے؟"

گوہر تو — ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی بھیا! وہ ملنے بھی نہ پائی تھی کہ بچھڑ گئی۔ میں جب اس کا خط پا کر عجلت میں آپ دونوں کا انتظار کئے بغیر اس کے پاس آئی تو وہ میرے آنے سے پہلے ہی —!

رندھی ہوئی آواز میں کہتے کہتے رونے لگی۔

"ہوں! اچھا تو یوں کہو کہ وہ مر گئی ۔۔؟ چلو یہ بھی اچھا ہوا!" ڈاکر نے لمبا سانس کھینچ کر کرسی کی پشت پر سہارا لیتے ہوئے کہا۔

ہاں ۔۔! یہ بھی اچھا ہوا! اور یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے اس کرنل کو قتل کر دیا؟ اور یہ بھی اچھا ہوگا کہ اب تمہارے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑے گا۔ ذلیل کتے! تو نے کبھی میرے مشورہ پر عمل نہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تو نے مجھے بھی ذلیل کیا اور خود بھی خوار ہوا ۔۔!"

ماں جی نے چیختے ہوئے کہا۔ ماں جی کے کردار کا یہ پہلو اس کے لئے انجانا تھا۔ وہ اس پر آج تک شاذ و نادر ہی خفا ہوئی تھی اور جب بھی خفا ہوئی یہ اپنی ضد پہ اڑ کر اس کے مقابلے پر ڈٹ گیا اور ہمیشہ من مانی کی۔ اب بھی یک دم اس کا خون جوش کھا کر دماغ کی طرف اُبلتا ہوا محسوس ہوا۔

"یہ بیگانے گھر میں کرنے کی باتیں نہیں ہیں ماں! جو تم زبان پر لا رہی ہو ۔۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا اور اب جو کچھ کروں گا ٹھیک کروں گا۔" اس نے بھی احتیاطاً دھیمی آواز لیکن تلخ اور تیز لہجہ میں کہا۔

اب کیا کرو گے؟ بد نصیب آدمی! اب کرنے کو کیا رہ گیا ہے؟" ماں نے حسرت سے پوچھا۔

"ایک کام اور رہ گیا ۔۔!" وہ معنی خیز لہجہ میں بولا۔

"وہ کیا ہے؟ میں بھی تو سنوں؟" ماں نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے اچھی طرح ۔۔!" وہ سگریٹ کیس ٹٹولتے ہوئے بولا ۔۔

"پھر بھی ۔۔؟" ماں نے اصرار کیا۔

"جوہر ۔۔ اگرچہ تمہیں رنج ہوگا۔ لیکن جن دو شخصوں نے میری خانہ ویرانی میں نمایاں حصہ لیا۔ انہیں معاف کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ان میں سے ایک کو میں ختم کر چکا ہوں اور ختم ہونے سے پیشتر دوسرے کو ختم کر کے دم لوں گا اپنی قبر پر دوسرے کو محل استوار کرنے دوں؟ میں ایسی مظلومیت کا قائل نہیں!

وہ طنز کی زہرناک مسکراہٹ اپنے بھدے ہونٹوں پر پھیلائے کہہ رہا تھا اس نے ماں کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور کمرے کی فضا کو دھوئیں سے مکدر کرنے لگا ..

" ماں جی ! یہ بھیا کیا کہہ رہے ہیں ؟"

جوہر نے فریاد کے لہجہ میں کہا۔ تو ذاکر اپنے بدنما چھدرے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

" شکر ہے کہ ذاکر نے کمزور دل نہیں پایا کہ ایک بد اندیش بہن کی فریاد پر اپنے خطرناک حریف کی جان بخش دے۔ تم نے اپنی نادانی سے اُسے میرے قبضہ سے چھڑا کر مجھے پہلے ہی بہت زک پہنچایا ہے۔ اسی وجہ سے ماں جی کے ہاتھوں بسنتو کی موت واقع ہوئی اور اس کی موت پر پردہ ڈالنے کو میں نے فخر کو قتل کر دیا۔"

اس کا یہ مطلب ہے کہ اب یہی سلسلہ جاری ہو جائے گا کہ قتل پر قتل کرتے چلے جاؤ — ؟" ماں جی نے پوچھا۔

" نہیں — ! بلا وجہ کیوں قتل کروں گا کسی کو — ؟ اور اتنی مہلت ہی کب ہے۔ میں تو اس جگہ آنے سے پیشتر اسی راشی سے ملنے لاہور گیا تھا۔ مگر وہ سعید پلید کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی زندگی کے کچھ دن اور باقی ہیں اور میری قسمت میں اُسے ڈھونڈھنے کی ابھی اور سرگردانی باقی ہے۔ مگر میں اُسے ڈھونڈھ کر چھوڑوں گا۔ مجھے اپنے آپ کو اس وقت تک محفوظ رکھنا ہے جب تک میں سعید کو ختم نہ کر لوں پھر مجھے پروا نہیں کہ اگلے ہی دن کوئی میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دے !" وہ تن کر پورے عزم کے ساتھ کہہ رہا تھا پس پردہ کچھ مبہم سی کشمکش ہوئی سرگوشیوں کی آوازیں آئیں اور ذاکر چوکنا ہو کر پوچھنے لگا ..

" کون ہے ساتھ والے کمرے میں — ؟ یقیناً کسی نے ہماری باتیں سنی ہیں ۔"

" تو تم نے کیوں ایسی باتیں کیں جن کے متعلق تمہیں احتیاط ملحوظ ہے کہ کوئی

نہ سنے ؟" ماں جی نے لاتعلق کے لہجہ میں کہا۔ اتنے ہی میں جوہر اُس کمرے کی طرف گئی۔

خیر — اب میں سوچتا ہوں کہ تم جوہر کو لے کر "نگم" واپس جاؤ۔ میں اپنا کام ختم کر کے پہنچ جاؤں گا۔ بشرطیکہ مہلت ملی۔" وہ کہنے لگا۔

" نگم میں اب جوہر کے لئے کیا رکھا ہے۔ وہاں نہ اب میں جاؤں گی نہ جوہر — !" ماں جی نے اُسی لاتعلقی کے انداز سے کہا۔

" کیوں — ؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

" جوہر اب خیر سے اپنے گھر پہنچ گئی — اپنی ماں کے پاس اور میرا کیا ہے جہاں سینگ سمائے چلی جاؤں گی۔"

" یہ کیا باتیں کر رہی ہو — ہوش میں آؤ — تمہاری عقل تو سلامت ہے نا ؟"

" قدرت اسی طرح ہر گنہگار کو گھیر گھار اس کے گناہ کے مرکز کی طرف لے آتی ہے۔ جس طرح مجھے لے آئی۔" ماں جی کہہ رہی تھی اور ذاکر سکتہ کے عالم میں بت بنا بیٹھا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے حرکت کی اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جوہر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

" گوہر بھی گئی۔ جوہر بھی گئی اور ماں ؟ اب شاید وہ بھی ساتھ نہیں دے گی بس ایک ذرا سا کام باقی ہے وہ ختم ہو جائے تو اپنی زندگی کا بھی کوئی مقصد باقی نہیں رہتا — !" وہ کہنے لگا۔

" مگر بھیا ! آخر سعید نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو اُس کی جان کے درپے ہو ؟" جوہر نے کہا تو ذاکر نے ایک قہقہہ لگایا۔

" نادان لڑکی ! ابھی سعید نے میرا کچھ بگاڑا ہی نہیں۔ کیا اُس بدبخت کے نگم میں وارد ہونے سے پیشتر ہم لوگ اطمینان سے زندگی بسر نہیں کر رہے تھے ؟ وہ آیا اور اپنے ساتھ ہماری بدبختی لئے ہوئے آیا۔ میں اسے ایسی موت ماروں گا کہ وہ میرے بعد "نگم" کا وارث نہ بن سکے گا۔

" کاش وہ مجھے کہیں مل جائے !"

وہ اپنے الفاظ بمشکل ہی ختم کرنے پایا تھا کہ سامنے کمرے کا پردہ ایک جھٹکے

کے ساتھ اُٹھا اور سعید باہر نکل آیا۔ ذاکر آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ ہو۔

" لو — میں آگیا — ! تمہاری کم ازکم ایک تمنا تو پوری ہو جائے !" سعید نے اس کے روبرو ڈٹتے ہوئے کہا۔ تو ذاکر کو بھی جیسے حقیقت کا پورا احساس ہوگیا۔ اس کا ہاتھ فوراً جیب کی طرف گیا۔ جوہر جھپٹ کر اس کے اور سعید کے درمیان حائل ہوگئی۔

" سعید! آخر تم نے میری التجا کو ٹھکرا دیا — میں نے —"

وہ شکایت کے لہجہ میں کہہ رہی تھی کہ ذاکر گرج اٹھا۔

" ہٹ جاؤ درمیان میں سے جوہر — ! ورنہ مجھے اب اس کی بھی پروا نہ ہو گی کہ تمہارا بھی خاتمہ ہو جائے !"

" بھیا — !" وہ سعید کے سامنے سینہ سپر ہوئے ذاکر سے التجا کرنے لگی۔

ہٹ جاؤ ! میں کہہ رہا ہوں ورنہ —"

اس نے ریوالور سے ان دونوں کی طرف نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔ مگر یک دم عقب سے کسی کے آہنی پنجے نے اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔

" ہتھیار میرے حوالے کر دو !"

اس کے روبرو آکر ایک تنومند نوجوان نے نرمی سے کہا۔ اس کی آواز جس قدر نرم تھی اس کی کلائی پر گرفت اُسی قدر سخت تھی۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ شدید دباؤ سے خود بخود ڈھیلا پڑ گیا اور ریوالور اصغر نے چھین کر اُسے کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔

" اب یہاں بیٹھ کر پر امن طور پر گفتگو کرو۔ کسی کے گھر میں آکر یوں ہنگامہ کرنا مناسب نہیں۔ مجھے بتاؤ قصہ کیا ہے ؟ سعید نے تم پر کیا زیادتی کی کہ تم اس کی جان لینے پر تل گئے ؟" ریوالور کی نالی اس کی طرف کرتے ہوئے اصغر نے کہا۔

" مگر آپ مداخلت کرنے والے کون ہیں ؟ ذاکر نے آخر کار پوچھا۔ اصغر اُسکی

طرف دیکھتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسا ۔
" اس کا دماغ قائم نہیں اصغر میاں ۔!"
ماں جی نے مری ہوئی آواز میں کہا اور پھر آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے لگ گئیں ۔

" میں ان کا دماغ ابھی قائم کر دوں گا! آپ دیکھتی تو جایئے! اصغر نے دھیمی آواز میں کہا ۔ اور سعید کی طرف مخاطب ہو کر کچھ کہنے کو تھا کہ ذاکر جھپٹ کر اپنی نشست سے اٹھا اور بیرونی دروازہ کی دہلیز پر جا کر کھڑا ہوا ، وہ اپنے ہاتھ میں ایک ریوالور لئے ہوئے تھا سعید اور جوہر کی طرف نشانہ باندھ کر اس نے فائر کیا وہ دونوں ماں جی کی کرسی کے قریب کھڑے تھے فائر ہونے پر نیچے بیٹھ گئے گولی دیوار کے قریب پڑے ہوئے ایک گلدان کے ٹکڑے اڑاتی ہوئی گزر گئی ۔
ہاتھ روک لو ورنہ میں گولی مار دوں گا تمہیں ۔!" اصغر نے کڑک کر کہا ۔ مگر ذاکر نے ہاتھ نہ روکا اور پے در پے فائر کرتا چلا گیا ۔ جیسے وہ واقعی اپنا دماغی توازن کھو چکا ہو ۔ جوہر سعید کے ساتھ لپٹی لپٹائی اٹھ سے ماں جی کی کرسی کے پیچھے لے آئی تھی ۔ ذاکر نے اسی طرف نشانہ بنایا ۔
" ذاکر! ہاتھ روکو ۔!" ماں جی نے اپنی کرسی پر سے اٹھتے ہوئے حکم دیا مگر ساتھ ہی ذاکر نے فائر کر دیا ۔ گولی بد نصیب عورت کے سینے کو پار کرتی ہوئی نکل گئی ۔ اب تو اصغر کی امی بھی پردہ کے پیچھے سے نکل آئیں ۔
" امی! خدا کے لئے آپ اندر چلی جایئے!"
اصغر نے یکے بعد دیگرے ذاکر کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا ۔ ایک گولی اس کی ران میں لگی دوسری ٹانگوں کے درمیان سے نکل گئی ۔ ذاکر نے دروازے کا سہارا لے کر پھر فائر کیا لیکن لرزتے ہوئے ہاتھ نے نشانہ خطا کر دیا ۔ اور شاید گولیاں ختم ہو چکی تھیں اس نے خالی پستول زمین پر پٹخ دیا اور زخمی ٹانگ کے باوجود تیزی سے سیڑھیوں کی طرف دوڑا ۔ مگر راستہ مسدود تھا ۔ پولیس کے کئی سپاہی آگے پیچھے زینے پر چڑھ رہے تھے ۔ انہوں نے ذاکر کو پکڑ لیا اتنے میں اصغر پہنچ گیا پولیس انسپکٹر سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ موجود تھا ۔

ہم لوگ آپ کا ٹیلیفون پہنچنے سے پندرہ منٹ کے اندر حاضر ہو گئے مگر معلوم ہوتا ہے کوئی مزید واردات ظہور میں آئی ہے؟ اس نے ذاکر کی زخمی ٹانگ اور اصغر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں — قتل کی ایک اور واردات —! آپ لوگ تشریف لے آیئے۔" اصغر نے آگے آگے چلتے ہوئے کہا۔

"قتل —!" انسپکٹر نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں — ملزم نے اپنی حقیقی ماں کو قتل کر ڈالا —!"

اصغر نے جواب دیا اور وہ سب موقعہ واردات پر پہنچے، موجودہ واقعہ کی تفصیل اصغر نے قلمبند کروائی۔ اور اس دوران میں سعید نے ذاکر کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کر کے خون بند کرنے کی تدبیر کی۔ خون فوارے کی طرح اُبل رہا تھا اور آرام طلب اور سہل انگار ذاکر، صدمات اور تکلیف کے علاوہ اپنے عزم کی ناکامی اور گرفتاری کے تصور سے نیم مردہ سا آرام کرسی پر پڑا تھا۔

انسپکٹر نے اس کی پٹی ہونے تک توقف کیا۔ سعید ہاتھ دھونے کے لئے اندر گیا تو انسپکٹر نے ذاکر کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے پکارا۔

"نوجوان! اب ہوش سنبھالو اور بیان دو —!"

انہیں تکلیف دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کے اس وقت کے بیان آپ کے لئے اتنے کارآمد نہیں ہوں گے جس قدر کہ یہ چیز جو میں ابھی پیش کروں گا۔ اور یہ تو میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ ان کی والدہ اتفاقاً زد میں آگئیں ان کے نشانہ کا ہدف درحقیقت سعید تھا —!" اصغر نے بیان کیا۔

"یہ —؟ یہ ڈاکٹر سعید؟" انسپکٹر نے سعید کی طرف اشارہ کر کے پوچھا جو قریب کھڑا تولیہ سے ہاتھ خشک کر رہا تھا۔

"جی ہاں —! اب سنئے یہ ذاکر کی آواز ہے —"

اتنا کہہ کر اس نے ٹیپ کیا ہوا کیسٹ لگا دیا — اپنی آواز پر ذاکر خود بخود چونک اُٹھا اور حیران ہو کر دیکھنے اور کان کھڑے کر کے سننے لگا۔

"جوہر اگرچہ تمہیں رنج ہو گا۔ لیکن جن دو شخصوں نے میری خانہ ویرانی میں

نمایاں حصہ لیا انہیں معاف کرنا میرے بس کا کام نہیں — ان میں سے ایک کو میں ختم کر چکا ہوں اور خود ختم ہونے سے پہلے دوسرے کو ختم کر کے دم لوں گا!"

آواز کہہ رہی تھی اور متواتر ریکارڈ چلتا رہا انسپکٹر خاص خاص نکات اپنی نوٹ بک میں درج کرتا رہا جب کیسٹ ختم ہوا تو انسپکٹر نے اصغر کی طرف رخ کیا ذاکر پھر آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا۔

ان کی خانہ ویرانی میں حصہ لینے والا پہلا شخص کون تھا جسے یہ ختم کر چکے ہیں — یہ مسٹر لوئی فیمس ؟"

انسپکٹر نے اپنے شکار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ مگر اس کے مزاح کا لطف لینے کا اس وقت کسے ہوش تھا سب سنجیدہ رہے۔

"کرنل ذوالفقار کیفی جو کل راولپنڈی میں قتل ہوئے —!" اصغر نے بتایا۔

"اچھا — ! واہ بھئی مرد میدان! اچھا قتل عام شروع کیا —!" انسپکٹر نے ذاکر کے شانے پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر —! تم اپنا کام کئے جاؤ! ٹھٹھا مذاق رہنے دو!" ذاکر نے انسپکٹر پولیس کو ڈانٹا۔

"بہت بہتر صاحب! یہ لیجئے سنجیدہ ہوا جاتا ہوں۔ کیونکہ جب تک آپ کے ہاتھ آزاد ہیں میں دست بستہ ہوں!

انسپکٹر نے خوف کھانے کے انداز میں کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے تو باوجود اس غمگین ماحول کے لوگ مسکرانے پر مجبور ہو گئے۔

"ہاں تو وہ ان کی خانہ ویرانی کا دوسرا رکن کون تھا وہ ابھی بقید حیات ہے یا انہوں نے مار لیا اُسے بھی ؟" انسپکٹر نے اصغر سے پوچھا۔

"الحمدللہ! خدا اس کی عمر دراز کرے یہ موجود ہے سعید!" اصغر نے سعید کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا اچھا!" انسپکٹر نے کچھ لکھتے ہوئے کہا اور اس کے بعد ذاکر سے چند مختصر سوال کئے جن کا اس نے جلا کٹا جواب دیا۔

— اچھا کیپٹن! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ کی بیٹی بیٹی سے میسا

بہت سا کام آسان ہو گیا۔ کیا آپ یہ ریکارڈنگ مجھے مستعار دے سکتے ہیں۔؟
اس نے اصغر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"مستعار کیا؟ جناب کی نذر کرتا ہوں۔!" اصغر نے کیسٹ پیش کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو انسپکٹر نے پھر قہقہہ لگایا۔ پھر سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اماں متوفیہ کو کسی چادر میں لپیٹ کر آرام سے گاڑی میں لے چلو۔

ہاں ذاکر صاحب! اب آپ میری طرف سے ایک حقیر سا نذرانہ قبول فرمائیے۔ لاؤ بھئی پیش کرو!" عجب اشارہ کیا اور

انسپکٹر نے ڈرامیٹکل انداز سے جھک کر ہاتھ سے پیش کش کا عجب اشارہ کیا اور چند سپاہیوں نے آنکھ جھپکنے میں آگے بڑھ کر ذاکر کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی۔

"تشریف لے چلئے۔ آج سے آپ اس خادم کے مہمان خاص ہیں!"

انسپکٹر نے پھر جھک کر ادب سے دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔ سپاہی مسکرا رہے تھے کیونکہ وہ ایسے معمول کے عادی تھے مگر گھر کے لوگوں کو انسپکٹر کی یہ ظریفانہ ادائیں بے محل معلوم ہو رہی تھیں۔

انہیں کیا معلوم کہ اس زندہ دل اور ہنس مکھ پولیس افسر کی یہ عادت تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے تمام عملہ میں ہر دلعزیز تھے۔ ان کا نام۔ ایم۔ شکیل علوی تھا۔ ماں جی کی نعش کو اور ذاکر کو لے گئے تو جوہر پر صدمہ کی تاب نہ لا کر سکتہ طاری ہو گیا۔

وہ نہ بول سکتی تھی نہ رو سکتی تھی۔ زرد چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ سعید نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس کی امی سے کہا۔ کہ اسے کسی نہ کسی طرح رلانا چاہیے تاکہ اس کے دل و دماغ کا یہ جمود ٹوٹے ورنہ وہ بیمار ہو جائے گی۔

اب میں اُسے کیونکر رلاؤں بیٹا؟ میں تو خود بدحواس ہو رہی ہوں چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔" وہ کہنے لگیں۔

اچھا تو کچھ دیر آپ ادھر ہی رہیے۔ میں کوشش کرتا ہوں!" تکلف بر طرف سعید سراسیمگی کے عالم میں اٹھ کر اس کے کمرے میں گیا جہاں جوہر بت کی طرح ساکت بیٹھی ایک ہی ٹک۔ دیوار کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار تھے رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی۔ ہونٹوں پہ نیلاہٹ جھلک رہی تھی اس خونین اور ہولناک منظر نے اس کے دل پر بے حد اثر کیا تھا۔ اصغر اُسے سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگیا تھا مگر وہ تھی کہ دم بخود بیٹھی تھی جیسے اُس کی روح سلب ہو چکی ہو۔ اصغر اب دریچہ میں کھڑا سگریٹ کے کش لیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کہ جوہر کی طبیعت کو بحال کرنے کے واسطے کیا تدبیر کی جائے۔ سعید کمرے میں داخل ہوتے ہی کرسی پر گر پڑا اور کراہٹ کی آواز میں طویل سانس لیا۔

" الٰہی خیر — ! شاید اب تم پر بھی ان خونخوار رشتہ داروں کے فراق کا دورہ پڑنے لگا — ؟" اصغر نے چونک کر پیچھے پھرتے ہوئے کہا۔

" نہیں دوست! میرے وہ کہاں کے ایسے ہی رشتہ دار تھے۔ لیکن طبیعت ہی ایسی ہے کہ اس قسم کے سانحہ سے جلد متاثر ہو جاتا ہوں۔

خصوصاً جب یہ خیال آتا ہے کہ بقول ذاکر، واقعی ان لوگوں کی خانہ ویرانی کی فوری وجہ میرا ہی وجود ہے تو مجھے اپنے آپ پر افسوس ہوتا ہے۔ پھر جوہر کی حالت دیکھ کر تو اپنے اوپر سچ مچ میں نفرین کر رہا ہوں۔ کاش کہ ذاکر کی گولی ماں جی کی بجائے میرے سینہ میں لگتی۔! بھلا میرا دنیا میں کون تھا جسے میرے مرنے کا افسوس ہوتا۔ ماں جی بیچاری بیچ میں خواہ مخواہ میری بھینٹ چڑھ گئیں۔!"

وہ دردناک اور الم انگیز لہجہ میں کہہ رہا تھا — جوہر چونک کر اس کی طرف بغور دیکھنے لگی بے حس جمود کی جگہ اس کی نگاہوں میں ایک شکایت آمیز جھلک پیدا ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی مگر آواز معطل ہو گئی۔ جیسے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ اصغر حیرت زدہ سا اُس کی طرف دیکھتا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے روبرو آکھڑا ہوا۔

" یہ سب کیا کہہ رہے ہو تم؟ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا؟" اصغر نے شدید حیرت سے کہا۔

"دماغ چل ہی جاتا تو اچھا تھا۔ کم از کم ضمیر کی اس ملامت سے چھٹکارا مل جاتا" سعید نے اُسی تاسف لہجہ میں کہا۔

"مگر تمہیں آخر کیوں ضمیر ملامت کرتا ہے؟ تم نے کیا کیا؟ اگر تمہاری جان بچ گئی تو یہ تمہارا قصور ہے؟" اصغر نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جوہر کی کیفیت دیکھ کر میں اپنے آپ کو واقعی قصوروار سمجھتا ہوں۔" وہ کہنے لگا۔

"تو گویا تم اُس کی گولی کا شکار ہو جاتے تو جوہر کو صدمہ نہ ہوتا؟" اصغر نے حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"اتنا شدید صدمہ بے شک نہ ہوتا جس قدر کہ اب ہوا۔ ان لوگوں سے اس کے بچپن کے تعلقات تھے۔ ان کی ہستی اس کے لئے زیادہ قیمتی، زیادہ پر اہمیت تھی مجھ سے ایک انسانی ہمدردی کا سابقہ تھا، جسے نباہتے ہوئے یہ اپنا ناقابل تلافی نقصان کر بیٹھی۔" وہ کہنے لگا۔

"اچھا، مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ محض انسانی ہمدردی کا رشتہ ہے تم دونوں کے درمیان خیر —!" اور اصغر کچھ کہتے کہتے چپ ہو کر باہر نکل گیا۔ سعید اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور نیم وا آنکھوں سے جوہر کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اس کی طرف متواتر ملامت بھری نظروں سے دیکھتی رہی اتنے ہی میں دوسرے کمرے سے اصغر نے پکارا۔

"سعید! ذرا یہاں تو آؤ —!" اس کی آواز میں کچھ شکایت تھی۔ کچھ تہدید اور سعید اٹھ کر دروازہ میں آیا۔

"کہو —!" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ امی نے مجھے کیا سنایا —؟" اصغر نے پوچھا۔

"کیا —؟" سعید الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

"کہ تم صبح واپس جا رہے ہو؟" اصغر نے جواب دیا۔

"ہاں تو پھر —؟" سعید نے کہا۔

"یہ کونسا موقعہ ہے تمہارے جانے کا؟" اصغر کہنے لگا۔

"کیوں بے موقعہ بھی کیا ہے؟ اب دو مہینے تو ہو گئے مجھے آئے ہوئے۔ پھر اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں میرا دل نہ لگے گا۔" سعید وہیں کھڑے کھڑے کہہ رہا تھا۔

"یار عجب بے مروت ہو! ہم لوگوں کا کچھ خیال نہیں تمہیں؟" اصغر نے شکایتاً کہا۔

"یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ کہاں تک خیال ہے مجھے تم لوگوں کا مگر ـــ" وہ جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر واپس آگیا۔ اصغر بھی اندر آیا۔

"خیر میں تمہیں فی الحال نہ جانے دوں گا ـــ" اصغر نے بضد ہو کر کہا

"نہیں اصغر! خدارا ضد نہ کرنا۔ میں نہیں رہ سکوں گا۔ میرے ذہن پر ہر وقت یہی خیال مسلط رہے گا۔ کہ اس المیہ کا ذمہ دار میں ہوں۔" سعید کہنے لگا۔

"اور یہاں سے جانے کے بعد یہ خیال بدل جائے گا؟" اصغر نے پوچھا

"منظر سے ہٹ جانے کے بعد یہ خیال فراموش ہو سکے گا۔" وہ کہنے لگا۔

"یہیں رہ کر بھول جانے کی کوشش کرو۔ اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کر پائے گا اب! کیا کہتے ہو؟" اصغر نے اشتیاق سے کہا۔

"اور اس المیہ کی کیفیت کو چہرے پر لیٹے ہوئے جو ہر وقت نظر آئے گی تو میں کیونکر بھول سکوں گا ـــ؟ بھئی تمہاری بھی کیا باتیں ہیں ـــ!"

ہاں ـــ البتہ ٹھیک کہتے ہو تم ـــ خیر جاؤ بھائی! میں مجبور تو نہیں کر سکتا۔ تمہیں۔" اور اصغر جیسے بے بس ہو کر اُٹھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سعید نے جوہر کو مخاطب کیا۔

"جوہر! کچھ تو کہو خدارا کچھ تو بولو؟ کیا تم مجھ بدبخت کو معاف نہیں کر سکتیں؟" سعید نے روہانسی آواز میں کہا۔

"سعید! آہ کیوں مجھے اور زیادہ دکھ دینا چاہتے ہو ایسی باتیں کر کے؟" اور وہ پھوڑے کی طرح پھوٹ پڑی۔ سعید اپنی نشست سے اُٹھ کر اس کے سامنے دو زانو ہو گیا۔

"جوہر! کل میں جا رہا ہوں — اور — اور تم سے بے حد شرمندہ ہوں کہ اس سانحہ کی بنیاد میں ہوں۔ جس نے تمہیں اس حد تک دکھی اور رنجیدہ کر رکھا ہے — تمہارے منہ سے نرمی کے چند الفاظ مجھے بچا لیں گے ورنہ میں شرمندگی کے ہاتھوں مر مٹنے پر مجبور رہوں گا۔" وہ رقت بھری آواز میں کہہ رہا تھا وہ خاموش تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر رواں تھے۔

"کاش! ذاکر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور یہ آنسو تم میرے غم میں بہا رہی ہوتیں —!"

اس نے دانستہ ایک اور چرکا دیا۔ جوہر نے ملامت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے

"ایسی باتوں سے میرے جذبات کو اور بھی مجروح کر رہے ہو تم؟" مگر تمہیں یقین ہے کہ میں تمہارے لئے آنسو بہانے کو زندہ رہ سکتی تھی۔ اسی لئے تم یہ سب کچھ کہہ رہے ہو — افسوس کہ انسان جب تک لمبے چوڑے زبانی دعوے نہ کرے دوسرے کو اس کے خیالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے تمہارے خیالات کا بخوبی اندازہ ہے —!" سعید نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"غلط ہے —! اگر اندازہ ہوتا تو تم ایسا رویہ اختیار نہ کرتے جو کئے ہوئے ہو!" وہ خفگی سے کہنے لگی۔

"میرے کون سے رویہ پر شکایت ہے تمہیں؟" وہ شیریں لہجہ میں کہتا ہوا اس کی نمناک آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"مجھے اس موقعہ پر چھوڑ کر جانے کو تیار ہو —؟" اس نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

"تمہاری یہ کیفیت برداشت جو نہیں کر سکتا تو کیا کروں —؟ بے اختیار یہی خیال آتا ہے کہ تمہارے اس رنج کا ذمہ دار میں ہوں۔" سعید نے نرمی سے کہا۔

"تم ذمہ دار نہیں ہو — ! ان لوگوں کے اپنے کردار اور اعمال کا نتیجہ انہیں پیش آیا۔ مگر اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی میرا متاثر ہونا عین فطری تھا میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ اُن لوگوں کے ساتھ بسر کیا ہے اور دوسروں کے لئے وہ کیسے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کبھی برا سلوک نہیں کیا۔" وہ درد بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔ رونے سے اس کے دل کا غبار دھویا گیا — غم و الم کی کیفیت قدرے کم ہوگئی۔ متحیر اور متوحش نظر آنے کی بجائے اب وہ قدرے پرسکون دکھائی دینے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے — اور تمہارے اس گہرے تاثر کو دیکھ کر میرا متاثر ہونا عین فطری ہے۔ کیونکہ میرے اس جسم میں اب روح کی بجائے تم ہی تم ہو جوہر — !" سعید نے پُر حلاوت سرگوشی میں کہتے ہوئے اس کے نرم و نازک ہاتھوں کو بھینچ ڈالا۔

"ہوں — ؟" ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ایسے شاعرانہ خیالات ؟" وہ جیسے اس لمحہ سب کچھ بھول کر مسکرا دی۔

"ڈاکٹر تو کیا، محبت ایک ایسا معجزہ نما جذبہ ہے کہ پتھر کے رگ و پے میں سرایت کر جائے تو اُسے زندگی بخش دے — ! سعید اشتیاق سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔"

"اگر تمہارے یہ دعوے سچے ہیں تو ابھی نہ جاؤ — !" جوہر نے بمنت کہا

"نہ جاؤں گا — مگر ایک شرط ہے — !" سعید نے مسکرا کر کہا۔

"کیا — ؟ مجھے ہر شرط منظور ہے۔" وہ کہنے لگی۔

"اپنے ذہن پر سے اضمحلال کو کم کرنے کی پوری کوشش کرو اور یوں آزردہ نظر نہ آؤ !" اس نے شرط پیش کی۔

"پوری کوشش کروں گی !" جوہر نے وعدہ کیا۔

تو میں نہیں جاؤں گا ! بس ؟" وہ اُس کے گھٹنوں پر سر ٹکاتے ہوئے کہنے لگا۔

اصغر بھیا آ رہے ہیں۔ اٹھو یہاں سے سرد فرش پر کب سے بیٹھے ہو"

جوہر کہنے لگی۔

"ہوں — اب احساس ہوا؟ سعید نے زیر لب کہا اور جلدی سے اُٹھ کر اپنی کرسی پر چلا آیا۔

واقعی اتنی دیر سے سردی تک محسوس نہیں ہوئی — میں کافی بنا کر لے آتی ہوں۔"

وہ جلدی سے اُٹھ کر ساتھ کے کمرے میں چلی گئی۔ جیسے اصغر کا سامنا کرتے گھبراتی ہو۔ اصغر نے دہلیز پر کھڑے ہو کر سعید کو اشارہ میں کچھ پوچھا اور اس نے مسکراتے ہوئے اشارہ ہی میں جواب دیا گویا۔"سب ٹھیک ہے۔"

"بہت سردی ہے!" آؤ بیٹھو جوہر کافی بنانے گئی ہے —" وہ بلند آواز سے کہنے لگا۔

"بیٹھنے کی بجائے کیوں نہ تمہارا سامان وغیرہ "پیک" کروانے میں مدد دوں۔ صبح پہلی ہی گاڑی سے چلے جاؤ تو اچھا ہے —!" اصغر نے چوٹ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

"صبح ہی دیکھ لیا جائے گا — اس وقت تو کافی پیو!" اس نے اصغر کا ہاتھ کھینچ کر پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

(۲۱)

"ہر بات میں اپنی ضد منوانے کی عادت چھوڑ دو اصغر! دلہن کے ساتھ بھی بات بات پہ ضد کرو گے تو جھگڑا ہوا کرے گا ۔ ضدی مرد کی بیوی کبھی دل سے محبت نہیں کر سکتی یہ میں تمہیں بتا دوں ۔!"

اصغر کی امی نے اب تو سنجیدگی سے ڈانٹتے ہوئے اُسے تنبیہہ کی ۔ وہ اس بات پر متفق نہیں ہوتا تھا کہ اس کی شادی ایک ہفتہ پہلے ہو جائے اور پھر سعید اور جوہر کی شادی ہو اس کی تجویز تھی کہ صبح سعید کا نکاح جوہر سے ہو اور اسی شام کو اس کی برات جائے ۔

"مگر میں تو اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا کہ میری تجویز منظور کی جائے ضد کون کرتا ہے محض تجویز ہے یہ تو ـــ !" اصغر نے بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے کہا ۔

"تو پھر وہی بات! اپنی سی کہے جاتا ہے اور پھر کہتا ہے ضد کون کرتا ہے!" امی کہنے لگیں ۔

اب اس معاملہ میں نہ تو جوہر کچھ کہہ سکتی تھی نہ سعید، جوہر تو یہ گفتگو شروع ہوتے ہی کسی بہانہ سے اُٹھ کر چلی گئی تھی اور سعید شرمگیں سا وہیں بیٹھا تھا ۔

"سعید! تم کیا کہتے ہو ـــ ؟ کچھ بولو بھی کیا لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے

بیٹھے ہو؟" وہ جھنجھلا کر سعید پر خفا ہونے لگا۔

"بھئی یہ معاملہ تو تم اور خالہ جان ہی طے کرو۔ میں کیا کہوں؟" سعید ہنس کر کہنے لگا۔

"میرا شوق ہے کہ میری جوہر کو بھاوج دلہن بنائے۔ میں اکیلی کیا کیا کروں گی اور مجھے آرائش جمال کا ڈھب ہی کہاں آتا ہے۔؟" وہ ہنس کر کہنے لگیں اور آخر انہیں کی تجویز پر اصغر کو متفق ہونا پڑا۔

دونوں شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ اصغر کی چھٹی ختم ہونے کے قریب تھی اس لئے ماہ عسل منانے کے واسطے نہ جا سکے۔

جس شام اصغر نے واپس جانا تھا اس دن صبح ناشتہ پر سعید نے امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان آپ کو چھوڑ کر جانے کو جی تو نہیں چاہتا مگر اصغر کے چلے جانے کے بعد میرا دل نہ لگے گا۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی آج شام ہمیں بھی رخصت کیجئے۔"

تم لوگ خیر سے سدھارو بھیا! میرے پاس اللہ رکھے میری "گل عروس" جو ہے۔" خوشدامن اور نند نے اصغر کی دلہن کو "گل عروس" کا خطاب دیا تھا

"کیا نگم" جاؤ گے تم لوگ؟" اصغر نے سعید اور جوہر کو بیک وقت مخاطب کیا۔

"جہنم میں ڈالو نگم کو!" سعید چونک کر بولا۔

"ہائے کیوں — ؟ آخر تمہاری جائداد ہے؟" امی کہنے لگیں۔

"لعنت بھیجئے ایسی جائیداد پر جس کے لئے اتنی جانیں تلف ہوئیں۔ وہ منحوس مقام تو پہلے ہی آسیب زدہ جیسا نظر آتا تھا۔ اب تو اور بھی بد روحوں کا مسکن بن جائے گا۔ مجھے تو اس کے نام سے نفرت ہو گئی ہے کاش مجھے ابو نے وہاں نہ بھیجا ہوتا۔ جب کہ وہ جانتے بھی تھے کہ اس پر ایک مظلوم کی بددعا ہے۔" سعید رنجیدہ سا ہو گیا۔

"ابو نے — ؟" اصغر نے تعجب سے اس کے لفظ کو دہرایا۔

"ہاں — جس شخص نے مجھے محبت پدری دی اُسی کو ابو کہہ سکتا ہوں — جعفر رضا خان کو میں چچا نہیں باپ ہی کہوں گا اُس شخص نے حق تلفی برداشت کر لی اور جس بچے کو انتقام کے طور پر اُٹھا لایا تھا۔ اپنی نیک نفسی کے باعث اسے اولاد کی طرح پرورش کیا۔ اور مظفر رضا سیٹھ کو ایک قریبی حق دار کا حق غصب کرنے کی ابدی سزا ملی۔ دوسرے کی اولاد اُس کے سر پر مسلط ہو گئی۔

اپنی اولاد کے دھوکے میں اس شخص نے ناہنجار اور ناخلف اولاد کے ہاتھوں اُٹھائے جانے والے دکھ غیر کے ہاتھوں اٹھائے۔

اور کیسے نہ اٹھاتا خدائے عادل انسانوں کے گناہوں کی سزا کو ایسی ہی صورتیں دے کر ان کے سروں پر مسلط کر دیتا ہے — مگر بے بصیرت انسان سمجھ نہیں سکتا کہ اسے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔"

سعید اپنے جوش میں کہتا چلا گیا اور سب سنجیدگی سے سنتے رہے صداقت کے پر تقدیس رعب کے زیر اثر اصغر بھی اس موقعہ پر اپنی فقرہ بازی اور مزاح بھول گیا۔ بلکہ متاثر ہوتے ہوئے بولا۔

بے شک یہ تم نے درست کہا سعید! جس منحوس جائداد کی بنیاد حق تلفی پر استوار ہوئی وہ کبھی بھی کسی کے لئے سازگار نہ ہو گی — دور کر دو اسے دے ڈالو کسی کو —!"

"اور ہاں "بنیاد" کا لفظ کہہ کر تم نے مجھے یاد دلا دیا — میرے ابو مرحوم و مغفور بتایا کرتے تھے۔ کہ "یہ نگم" والا بنگلہ اُن کے والد رضا علی خان نے نہیں

بلکہ اُن کے دادا امیر علی خان نے مغلیہ عہد میں بنوایا تھا۔ امیر علی خان کا ایک بیٹا بھی تھا جو کنیز کے بطن سے تھا۔ امیر علی نے اسے اپنی وصیت میں بڑے بیٹے کے ساتھ برابر کا حق دار تسلیم کیا میرے دادا رضا علی خاں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کنیز ان کے والد کے نکاح میں نہیں آئی تھی۔ چھوٹے بھائی کو وراثت سے محروم قرار دیا اور پھر اتنے ہی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ماں بیٹے کو گھر سے نکال

باہر کیا۔ اس کے بعد لڑکا فوج میں بھرتی ہو کر لاپتہ ہو گیا اور ماں اس کے غم میں سسکتی مر گئی۔

ابو بتاتے کہ گاؤں کی بوڑھی عورتیں اب تک اس کے آخری لفظوں کو یاد کر کے کانپ اُٹھتی ہیں اس نے مرتے دم بددعا دی تھی۔۔ کہ"الٰہی! امیر علی کے کسی وارث کو" نگم" میں چین سے رہنا نصیب نہ ہو!" سعید نے بتایا۔

"تو یہ جانتے بوجھتے کیوں انہوں نے تمہیں اُس لعنت کدے میں بھیجا؟" امی کہنے لگیں۔

وہ اس پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ محض عوام کا واہمہ خیال کرتے تھے" سعید نے جواب دیا۔

یہ روایت تو چھیروں کے سارے گاؤں میں مشہور تھی کہ "نگم" پر بددعا ہے اور ماں جی جب کبھی کسی کو یہ کہتے سنتیں بے حد خفا ہوتیں۔ کئی نوکروں کو انہوں نے صرف اسی بات پر برطرف کیا۔ علاوہ ازیں لوگ کہتے تھے کہ اکثر لوگوں نے "نگم" کے اردگرد کے ساحلوں اور جنگلوں میں ایک بڑھیا کو روتے اور دردتے ہوئے اور آہیں بھرتے دیکھا ہے یہ اُسی عورت کی روح ہے جو اب تک اپنے بیٹے کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ مگر میں لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی لیکن جعفر رضا خان نے بھی یہی بیان کیا تو ممکن ہے درست ہو۔" جوہر کہنے لگی۔

"ہے ہے کیسی لڑکی ہو؟ سُسر کا نام بلا رہی ہو ---؟"

امی نے بے حد سنجیدگی سے ٹوکا۔ جوہر شرمندہ سی ہو گئی۔ مگر باقی سب ہنسنے لگے اور یہ موضوع اسی قہقہہ میں بدل گیا۔

"تو آپ لوگ لاہور جائیں گے سعید بھائی؟"

اصغر کی دلہن نے پوچھا۔ وہ جوہر کو بے حد چاہنے لگی تھی اور اب شوہر کے ساتھ ہی ساتھ اسے بھی رخصت کرنے کے خیال سے اداس ہو گئی تھی۔

"جی ہاں، بھابی جان!"

سعید نے پُرمسرت لہجہ میں یہ شیریں لفظ ادا کیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں کتنا خوش نصیب تھا وہ — کہ اُس ہستی سے مخاطب تھا جس کے وجود کا تصور بھی اس کے گمان سے پرے تھا۔ آج سے چند ہفتے پہلے یہ بات قیاس سے بعید تھی کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہوگی جو اس کے عزیز دوست کی رفیقۂ حیات اور اس کی اپنی دلہن کی پیاری بھاوج ہوگی — !

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ، اور امی بھی ہمارے ساتھ لاہور چلیں۔" سعید نے مدعو کیا۔ تو اصغر کی دلہن ریحانہ خوش دامن کی طرف دیکھنے لگی۔

"جوہر معہ الخیر اپنے گھر پہنچ کر ہمیں مدعو کرے گی تو ضرور چلیں گے۔

"تم ابھی سے اداس ہونے لگیں؟ میری چاندنی! میرے گھر کی رونق!" امی نے اپنی نویلی بہو کو لاڈ کے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔

"ہوں — ! تو گویا عنقریب آپ سب لوگ لاہور میں اکٹھے ہوں گے اور ہم غریب سپاہی اکیلے "لفٹ رائٹ" "لفٹ رائٹ" کر رہے ہونگے" اصغر نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ مگر اس کا انداز ایسا تھا کہ سب بے اختیار ہنسنے لگے۔

ارے اکیلے کہاں۔ پوری یونٹ ہوگی تمہارے ساتھ!" سعید نے کہا تو اس پر ایک دفعہ پھر فرمائشی قہقہہ پڑا۔

اکیلے کیوں؟ تم اللہ کے فضل سے مادر وطن کے محافظ ہو۔ اللہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہے مسلمان سپاہی مرد مجاہد اپنے آپ کو کبھی تنہا تصور نہیں کرتا۔"

اصغر کی امی بیٹے کی طرف محبت بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہی تھیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ ان کا یہ سنسان گھر جو مدتوں روحِ انبساط سے محروم رہا۔ ایک دفعہ پھر مسرت بار قہقہوں سے گونج اُٹھا ہے!

سب ناشتہ کی میز کے سامنے سے اُٹھ کر باہر کوٹھے پر آ بیٹھے۔ سعید نے حسب معمول اخبار اُٹھالیا اور سگریٹ سلگا کر کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے پہلا صفحہ الٹا ہی تھا کہ کسی خاص خبر پر نگاہ پڑتے ہی یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"چلو خس کم جہاں پاک!" وہ کہنے لگا۔
اصغر قدم برداشتہ اُس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اور جھک کر اخبار پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔
"کیا ہے؟"
اور سعید نے ایک خبر کی سرخی پر انگلی رکھ دی۔ اصغر دوسروں کے تجسس کے پیش نظر بلند آواز سے پڑھنے لگا۔
"نگم" میں آتشزدگی:
چٹاگانگ۔ ایک مقامی رئیس اور کارخانہ دار سیٹھ مظفر رضا خاں کی عالیشان تاریخی رہائش گاہ "نگم" گزشتہ شب جل کر خاکستر ہو گئی۔ آتشزدگی کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ سیٹھ موصوف کا اکلوتا بیٹا اور اس بنگلہ کا موجودہ مالک متعدد جرائم کے الزام میں ماخوذ ہے"
تینوں خواتین گم سم بیٹھی اس خبر کو سنتی رہیں۔
"اچھا — اللہ کی مرضی جو ہوا سو بہتر ہوا!"
اصغر کی امی کہنے لگیں۔ مگر اُن کے چہرے پر رنج کے آثار نمایاں تھے آخر وہ ان کی بیٹی کے شوہر کی آبائی جائداد تھی۔
"میری دانست میں یہ اُس بدبخت ذاکر کا کام ہے!" اصغر کہنے لگا۔
"مگر وہ تو قید میں پڑا ہے!" سعید نے کہا۔
"یقیناً وہ فرار ہو چکا ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسا بے جگری کا کام نہیں کر سکتا!" اصغر نے اصرار سے کہا۔
جوہر کے چہرے پر واقعی اندوہناک کیفیت چھا گئی تھی۔ "نگم" کے مختلف حصے اور نادر آرائشی سامان اس کے حافظہ میں اُبھر رہے تھے۔ آخر اُس کے بچپن کی یادیں اس جگہ سے وابستہ تھیں اس نے اپنی زندگی کے کئی سال وہاں بسر کیے تھے۔
"گل عروس" اسے تشفی دے رہی تھی۔
"کچھ رنج نہ کرو — اللہ میاں میری اچھی بہن کو ایسے ایسے کئی بنگلے دیں گے۔" وہ بھولی بھالی لڑکی اس کے گلے میں باہیں ڈالے معصومیت سے

کہہ رہی تھی۔ جوہر نے اُسے پیار سے بے ساختہ لپٹا لیا اور مسکرانے لگی۔
اتنے ہی میں ملازم چھوکرا ایک ٹیلی گرام لئے ہوئے اوپر آیا۔ اصغر نے لفافہ پر نگاہ ڈال کر جوہر کی طرف بڑھا دیا اور رسید پر دستخط کر کے لڑکے کے حوالے کرتے ہوئے متجسس نظروں سے بہن کو دیکھنے لگا۔
"آپ کا خیال درست نکلا بھیا!" جوہر نے ٹیلی گرام اصغر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کیسا تار ہے؟" اس کی امی تجسس سے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"ذاکر کا تار ہے۔ لکھا ہے

تم دونوں کو شادی کی مبارکباد! یہ چند سطریں میں تمہیں "نگم" کے شعلوں کی روشنی میں لکھ رہا ہوں اور جب تم انہیں پڑھ رہی ہو گی تو میں ایک دور افتادہ سرزمین کی طرف پرواز کر چکا ہوں گا!
"ذاکر"

اصغر نے ترجمہ کرتے ہوئے تار کا مضمون پڑھ دیا تو چند لمحے سب خاموش بیٹھے رہے۔ مگر اصغر زیادہ طویل خاموشی کا کبھی متحمل نہ ہوا تھا۔
"بھئی اس ظالم کے بچے کو جب سوجھی عجیب ہی بات سوجھی!"
اصغر نے سعید کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے داد دینے کے لہجہ میں کہا تو سعید نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔
"کیسے؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔
"یقیناً ذاکر کے متعلق کہہ رہا ہوں — تم کیا سمجھے؟"
اصغر نے قہقہہ لگاتے ہوئے سعید کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔
"دیکھا! میں غلط تو نہیں کہا کرتا۔ کہ تم لال بجھکڑ کے استاد ہو —!"
اور یہ عارضی جیسی افسردگی جو اس منحوس جائداد کے تلف ہونے پر چھا گئی تھی ان سچے دوستوں کے قہقہوں کے سیلاب میں بہہ گئی۔
"خدا کی دین اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ رکھنے والے کتنے سیر چشم اور غنی

ہوتے ہیں — ! دیکھا تم نے ؟"

امی مسکراتے ہوئے جوہر سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے محبت اور فخر سے لبریز نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا تو سعید کی نظر بے اختیار اس کی طرف اُٹھ گئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے دونوں جہاں کی بہترین نعمتیں اُس ایک نگاہ میں سمٹ آئی ہوں —!

اصغر سعید سے پھر کچھ کہنے کو تھا کہ نگاہوں کے اس والہانہ الجھاؤ پر یکدم ٹپٹا گیا۔

"اہو — !" اس نے اخبار چہرے کے سامنے کر لیا اور دوسری طرف چل دیا —!

ختم شد

جوہر

ائیر ہوسٹس جوہر اور سعید کی پہلی ملاقات ہوائی جہاز میں ہوئی۔
جسے صرف دھڑکنوں نے محسوس کیا یا انجانے جذبوں نے جانا۔
قسمت سعید کو "زعفران زار" سے "نگم" لے گئی ----- جہاں
اُس کے سوتیلے بھائی سیٹھ ذاکر اور سوتیلی ماں نے اُسے قتل
کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر اچانک جوہر وہاں پہنچ گئی ---- جوہر
نے سعید کو نہ صرف موت کے منہ سے نکالا بلکہ خود بھی ہمیشہ کیلئے
اُس کی زندگی میں داخل ہو گئی ----- مگر موت قدم قدم پر
اُن دونوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی -----

ISBN 969 442 268 x